بازی گر
PDFBOOKSFREE.PK
محمد اعظم خان

پیش لفظ

''بارش'' اور ''سمندر آنکھیں'' کے بعد ''بازی گر'' میری تیسری کتاب ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ گو کہ میری پہلی دو کتابیں افسانوں پر مشتمل تھیں اور یہ طویل کہانی ہے اس سے پہلے میں اپنی مرضی سے لکھتا رہا ہوں مگر اس بار بھائی محمد علی قریشی کے حکم اور خواہش پر لکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ مجھے ناول لکھنے کو نہ کہتے تو شاید میں کبھی لکھ بھی نہ پاتا اسی لئے میں نے اپنی اس کتاب کا انتساب بھی محمد علی قریشی کے نام ہی کیا ہے کہ یہ انہی کا حق ہے۔

میں اپنے دوست گل نوخیز اختر کا بطور خاص شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہی کے ذریعے محمد علی قریشی جیسے اچھے انسان اور اچھے دوست سے میری ملاقات ہوئی۔

اپنی شریک حیات کومل اعظم کا شکریہ بھی مجھ پر واجب الادا ہے کہ وہ میرے لکھنے کے دوران کبھی رکاوٹ نہیں بنیں اور مجھے لکھنے کے لئے نہ صرف مکمل پُرسکون ماحول فراہم کیا اور میرے حوصلے بڑھائے بلکہ پروف ریڈنگ میں بھی مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔

میں اپنی والدہ صاحبہ کی دعاؤں کا ذکر کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر میں کچھ ہوں تو صرف اور صرف ان کی دعاؤں سے ہوں۔

میں نے اپنی کہانی کے لئے اپنے ہی معاشرے کے ایسے جیتے جاگتے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو یقیناً آپ کو بھی اپنے اردگرد با آسانی دکھائی دے جائیں گے اور ہو سکتا ہے ایسے ہی کسی بازی گر سے آپ کو بھی واسطہ پڑ چکا ہو۔ ہر تخلیق کار کی طرح میں نے بھی کوشش کی ہے کہ آپ کو ایسی کہانی پیش کرسکوں جو نہ صرف آپ کو پسند آئے

بلکہ آپ کے معیار پر بھی پوری اترے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں یہ تو آپ لوگوں کی رائے جان کر ہی معلوم ہو سکے گا۔

آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

دعاؤں کا طالب
محمد اعظم خاں
بٹ سٹریٹ، مسلم آباد،
شالا مار ٹاؤن، باغبانپورہ
لاہور۔ 9
فون 0300-4107328

بندر اپنے کرتب دکھا رہا تھا جبکہ بکرا اور کتا بھی تماشائیوں کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ یہ جانور اپنے مالک کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ شاید انہیں علم تھا کہ اگر انہوں نے اپنے اپنے کرداروں کو نبھانے میں ذرا سی بھی غلطی کی تو ان کے مالک کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی ان پر برس پڑے گی۔ ویسے بھی اس کھیل تماشے سے ہی ان سب کا پیٹ جڑا ہوا تھا۔ یہ مداری گاؤں گاؤں جا کر تماشہ دکھاتے اور لوگ خوش ہو کر انہیں آٹا، چاول، گندم اور اسی طرح کی دوسری اجناس اپنے اپنے گھروں سے لا کر دیتے۔ جبکہ کچھ لوگ نقدی کی شکل میں بھی مداری کی جھولی میں ڈال دیتے۔

بندر کے تماشے کے بعد مداری نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈگڈگی ایک طرف رکھ دی اور بین بجانے لگا۔ گاؤں کے لوگ دائرے کی شکل میں کھڑے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں بھی بہت خوش تھا کیونکہ ہمارے گاؤں میں اس طرح کے کھیل تماشے دکھانے والے مداری اور بازی گر بہت کم ہی آتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر سال گندم کی کٹائی کے بعد شاہ جی کا میلہ لگا کرتا تھا جو تین دن تک جاری رہتا۔ جس میں قوال آتے، موت کا کنواں لگتا، دکانیں سجتیں، کشتیاں ہوتیں، کبڈی، فٹ بال اور والی بال کا میچ کھیلا جاتا، گھوڑوں کی دوڑ ہوتی اور بیل گاڑیوں کی ریس لگائی جاتی۔ یوں تین دن تک گاؤں میں خوب رونق رہتی اور ہر چہرے پر خوشی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی۔

کیونکہ گاؤں والوں کو اس طرح کے مواقع بہت کم ہی نصیب ہوتے تھے اسی لئے گاؤں کے سبھی لوگ جن میں بچے، بوڑھے اور جوان شامل تھے وہاں آ جمع ہوئے تھے۔ ڈری سہمی عورتیں بھی چھتوں پر چڑھی تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ مداری بین بجا رہا تھا۔ بین بجاتے ہوئے اس کے گال اور گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ مداری نے سانپ کی پٹاری تماشائیوں کے درمیان لا کر رکھ دی اور اس کے اردگرد تیزی سے بین بجانے لگا۔

پھر اس نے آہستہ سے پٹاری کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اندر سے کئی گز لمبا دھاری دار سانپ برآمد ہوا جسے مداری نے گردن سے پکڑ کر اپنی گردن میں لپیٹ لیا۔ وہاں پر موجود سبھی تماشائیوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔

کچھ دیر بعد مداری نے سانپ کو پٹاری میں بند کر دیا اور چھڑی کے ساتھ گول دائرے کی شکل میں لکیر کھینچتا ہوا بولا۔ ''لیں بھئی، جانوروں کے کمالات تو آپ نے دیکھ لئے۔ اب میں آپ کو جادو کے ایسے ایسے کھیل دکھاؤں گا کہ اس سے پہلے شاید ہی کبھی آپ نے دیکھے ہوں گے...... یہ کھیل پیش کرنے کے لئے مجھے ایک لڑکے کی ضرورت ہے...... آپ میں سے کوئی بھی ہمت کر کے آگے آ جائے۔''

یہ کہتے ہوئے مداری ڈگڈگی بجانے لگا اور اس کا ساتھی لڑکا الٹی سیدھی قلابازیاں لگانے لگا۔ مداری کی بات سن کر وہاں پر کھڑا گاؤں کا ہر لڑکا خود کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ مداری جس لڑکے کی طرف بھی اشارہ کرتا وہ انکار کر دیتا۔ کچھ دیر اسی انتظار میں گزر گئی کہ کوئی آگے بڑھ کر مداری کا ساتھ دے لیکن کوئی بھی آگے آنے کو تیار نہ تھا۔ ''شاباش...... شاباش...... ہمت کریں...... بھئی ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں...... یہ کھیل تماشے آپ لوگوں کی دلچسپی کے لئے ہوتے ہیں...... بے فکر رہیں کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا...... ویسے تو میرے ساتھ میرا اپنا بیٹا بھی ہے لیکن میں اسے اس لئے سامنے کھڑا نہیں کر رہا کہ پھر آپ ہی لوگ کہیں گے کہ مداری نے اسے پہلے سے ہی سب کچھ سکھایا ہوا تھا...... اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے ہی کوئی سامنے آ جائے۔''

مداری نے بھرپور اپیل کی لیکن ادھر سے وہی خاموشی تھی۔ ایسے میں مجھ سے رہا نہ گیا اور میں ہمت کر کے مداری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر میری ہمت اور حوصلے کی داد دی۔ گو کہ میں اندر سے کچھ کچھ گھبرایا ہوا تھا لیکن پھر بھی میں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر سب کا شکریہ ادا کیا۔

''یہ آ گیا مرد کا بچہ میدان میں......'' مداری نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ ''اس کے لئے ایک بار پھر زور دار تالیاں بجا دیں......'' مداری کے کہنے پر لوگوں نے پھر تالیاں بجا دیں۔ ''ہاں بھئی بچے جمورے! تمہارا نام کیا ہے؟'' مداری نے مجھ سے سوال کیا۔

''جیلو......'' میں نے اپنا نام بتایا۔

''جیلو!...... میرے ساتھ تماشہ کرو گے......؟''

''جی کروں گا......''

''ڈرو گے تو نہیں......؟''

''نہیں ڈروں گا......''

''بھاگو گے تو نہیں......؟''

''نہیں بھاگوں گا......''

''تو پھر تیار ہو جاؤ...... میں تمہاری طرف آ رہا ہوں...... ذرا ہوشیار رہنا...... پھر نہ کہنا مجھے خبر نہ ہوئی......'' مداری یہ کہتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ میں کچھ سکے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میری ناک کے قریب آ کر چٹکی بجاتا اور سکہ غائب ہو جاتا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے سارے کے سارے سکے چٹکیوں میں غائب ہو گئے۔ میں بہت غور سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے یہ سکے کہاں غائب کر دیئے تھے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''لاؤ بھئی...... میرے سکے واپس کر دو......''

''سکے میرے پاس نہیں ہیں...... تم نے خود ہی انہیں کہیں چھپا دیا ہے......'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''لو بھئی جیلو...... اگر یہ سکے تمہارے پاس سے ہی نکلے تو پھر......؟''

''میں نے سکے لئے ہی نہیں...... تو میرے پاس سے کہاں نکلیں گے......؟''

''اب میں تمہارا کان دباؤں گا اور سارے کے سارے سکے تمہاری ناک سے نکلیں گے۔'' یہ کہہ کر مداری نے سلور کی ایک کٹوری میری ناک کے نیچے رکھ دی اور آہستہ سے میرا کان مروڑا۔ وہ جیسے جیسے میرا کان مروڑتا، چھن چھن کرتے ہوئے سکے کٹوری میں گرتے جاتے۔ ناک سے نکل کر کٹوری میں گرتے ہوئے سکوں کو دیکھ کر لوگ ہنس ہنس کر دہرے ہو رہے تھے اور تالیاں بجا کر مداری کو داد بھی دے رہے تھے۔

میرا بھی ہنستے ہوئے برا حال ہو رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے میرا کان پکڑ کر زور سے

مروڑا جس کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف محسوس ہوئی اور تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں فوری طور پر سمجھ نہ سکا کہ اس سے قبل جب مداری میری ناک کے ذریعے اپنے سکے برآمد کر رہا تھا اور اس نے میرے کان کو پکڑا تھا اس وقت تو مجھے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اب وہ کیوں اس قدر زور سے میرا کان مروڑ رہا تھا۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو میرا کان میرے ابا کے ہاتھ میں تھا جس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ابا نے میرا کان چھوڑ دیا اور مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ مجمع میں مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو یا شاید وہ مداری کے تماشے کی جگہ میرا تماشہ زیادہ دلچسپی سے دیکھنے لگے تھے۔

"ابا.... میرے بال تو چھوڑو..... مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" میں نے التجا کی۔

"ہوتی ہے تو ہوتی رہے...... مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں...... اُلو کا پٹھا...... کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا...... کسی کام کو کہو تو تمہیں موت پڑ جاتی ہے اور کھیل تماشوں میں تمہارا بہت دل لگتا ہے......"

"ابا...... میں نے ایسا کون سا انوکھا جرم کر لیا ہے...... سارے گاؤں کے لوگ ہی تماشہ دیکھ رہے ہیں......" میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تو بجائے اس کے کہ ابا مجھ پر ترس کھا کر میری جان بخشی کرتا اس نے تڑاخ...... تڑاخ...... دو تین تھپڑ میرے منہ پر مار دیئے اور چیخا۔

"حرام خور...... آگے سے بکواس کرتا ہے...... اب زیادہ بک بک کی تو تمہاری زبان کاٹ کر تمہارے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔"

ابا کی باتیں سن کر میں نے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی...... اب میں بغیر کچھ کہے ابا کے ہاتھوں مار کھاتا ہوا چلتا جا رہا تھا۔ بس کبھی کبھی بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل جاتے۔ "ابا! مجھے معاف کر دو...... بس ایک بار...... ابا! بس ایک بار معاف کر دو...... آئندہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

لیکن ابا پر میری کسی بھی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اسی طرح گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک میری اور میرے ابا کی آواز کے علاوہ خاموشی رہی لیکن پھر

کچھ دیر بعد ہی ڈھول، ڈگڈگی اور بانسری کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید مداری نے تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر سے تماشہ دکھانا شروع کر دیا تھا۔

ابا نے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے بالوں سے پکڑ کر صحن میں کھڑی میری ماں کی طرف دھکیل دیا۔ میں سیدھا اماں کے قدموں میں جا گرا۔ اماں نے فوراً مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ میں نے کھڑا ہوتے ہی خود کو اماں کے پیچھے چھپا لیا۔ کیونکہ میرے لئے اس سے محفوظ جگہ اور کہیں نہیں تھی۔

"کیوں مار رہے ہو اسے...... بھلا یوں بھی جانوروں کی طرح کوئی اپنی اولاد کو مارتا ہے......؟" اماں میری ڈھال بنی کھڑی ابا کو سمجھانے لگی لیکن ابا کے سر پر جوں تک نہ رینگی۔

"دیکھ شیدے کی ماں...... تم ان چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر میرے ساتھ مت الجھا کرو...... اور بہتر ہے تم اپنی ٹانگ مت اڑاؤ...... نہیں تو اس حرامی کے ساتھ تمہاری بھی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا......"

ابا گرجا تو اماں تھر تھر کانپنے لگی۔ کیونکہ آئے دن ابا کے ہاتھوں اماں کی کسی نہ کسی بات پر پٹائی ہو جاتی تھی۔ پھر بھی ہمت کر کے بولی۔ "شیدے کے ابا...... مجھے بتاؤ تو سہی کہ اس سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اسے اتنا مارنے کے باوجود بھی تمہارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا......؟"

"اسے چھوٹا سا بھی گھر کا کوئی کام کہہ دو تو اسے فرصت نہیں ہوتی اور اسے سکول کا کام یاد آ جاتا ہے۔ جبکہ کھیل تماشوں کے لئے اس کے پاس بہت وقت ہے......"

"بچہ ہی تو ہے...... کیا ہوا جو تماشہ دیکھ رہا تھا...... سارے کا سارا گاؤں وہیں تماشہ دیکھنے پہنچا ہوا ہے۔ ہمارے گاؤں میں اس طرح کے تماشے کون سے روز ہوتے ہیں۔ پھر...... شیدا، جیرا، ماڑو اور کاکا بھی تو وہیں کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں...... انہیں تو تم نے کچھ نہیں کہا اور اس غریب کو گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لائے ہو۔"

"دیکھ شیدے کی ماں...... تو میرے غصے کو اچھی طرح جانتی ہے...... زیادہ بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کر...... مجھے معلوم ہے کہ وہ چاروں بھی وہیں ہیں...... لیکن وہ دن رات کھیتوں میں محنت کرتے ہیں...... کیا ہوا جو ایک دن وہ کھیل تماشہ دیکھتے ہوئے گزار

دیں گے۔'' ابا نے میرے چاروں بڑے بھائیوں کی حمایت کی تو اماں بھی میری ہمدردی میں بول پڑی۔

''اگر وہ چاروں کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں تو جیلو بھی سکول پڑھنے جاتا ہے اور پڑھائی دماغ کا کام ہے...... آج سکول سے چھٹی تھی۔ اگر وہ تماشہ دیکھنے چلا گیا تو اس میں اس قدر لال پیلا ہونے کی کیا ضرورت ہے......؟'' اماں کا یہ کہنا ابا کی مردانگی کو للکارنے کے برابر تھا۔

''میرے سامنے زبان چلاتی ہو...... تمہاری اتنی جرأت...... اب آگے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو تمہیں یہیں کھڑے کھڑے زمین میں گاڑ دوں گا......''

''اور کر بھی کیا سکتے ہو تم...... تم جیسے مردوں کو عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم بھی تو نہیں آتی۔''

''شیدے کی ماں...... تم میرے پاؤں کی جوتی ہو...... پاؤں میں ہی رہو تو اچھا ہے...... مجھے اپنے سامنے تمہارا تنا ہوا سر اچھا نہیں لگتا...... اور اوپر سے تم بکواس کئے جا رہی ہو...... لگتا ہے پچھلی مار بھول گئی ہو تبھی تو بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہو...... جب تک تمہیں دو چار پڑیں گی نہیں اس وقت تک تمہاری عقل کہاں ٹھکانے آئے گی۔''

ابا غصے میں تھا، جو منہ میں آیا کہے جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی آگے بڑھ کر ابا نے چٹیا سے پکڑ کر اماں کو زمین پر گرا لیا اور اس پر جوتیاں برسانے لگا۔ اماں چیخ و پکار کر رہی تھی لیکن ابا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا اور وہ مسلسل اماں کو جوتے مار رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ابا کو روکنے کی کوشش کی لیکن ابا نے ایک ہی دھکے میں مجھے دور پھینک دیا۔ میں پھر ہمت کر کے اٹھا اور جوتیاں کھاتی ہوئی ماں پر لیٹ گیا۔ ابا نے پھر بھی اپنا ہاتھ نہ روکا اور جوتی چھوڑ کر پاس ہی پڑا ہوا ڈنڈا اٹھا لیا جس سے اماں پتھر کی کونڈی میں مرچ مصالحہ پیسا کرتی تھی۔ میں اماں کو بچانے کے لئے اس کے اوپر الٹا لیٹا ہوا تھا۔ ابا کا برسایا ہوا کوئی ڈنڈا میری کمر پر پڑ رہا تھا اور کوئی ڈنڈا اماں کے حصے میں آ جاتا تھا۔ نہ جانے کتنی ہی دیر تک ہم ماں بیٹے کو سزا ملتی رہی۔ تب کہیں ابا کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور وہ ہمیں تڑپتا ہوا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

ایک تماشہ گھر سے باہر ہو رہا تھا جسے دیکھنے سارا گاؤں جمع تھا اور ایک تماشہ گھر کے

اندر ہمارے ساتھ ہو رہا تھا لیکن ہمارے تماشے کو دیکھنے میں اس روز کسی نے بھی دلچسپی نہ لی۔ کیونکہ ایسا تماشہ تو گاؤں والوں کو آئے دن دیکھنے کو مل جاتا تھا جبکہ باہر ہونے والا تماشہ تو سال میں ایک دو بار ہی دیکھنا نصیب ہوتا تھا۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ میرے کئے کی سزا اماں کو ملی ہو۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے ابا کسی بات پر سزا دینے لگا تو اماں میرے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن اماں ہمیشہ ایسی کمزور دیوار ثابت ہوئی جو ابا کی دو چار ٹھوکروں سے گر پڑی۔ پھر بھی ہمیشہ اماں نے میرے لئے ڈھال کا کام کیا۔

♦ ...... ♦

میرے علاوہ اماں کے چار بیٹے اور بھی تھے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان میں سے کسی بیٹے کی وجہ سے اماں کو سزا ملی ہو۔ اماں پر جب بھی ابا کی طرف سے عذاب نازل ہوا تو وجہ میں ہی بنا۔ ویسے اس کے علاوہ بھی ہفتے میں ایک دو بار کسی نہ کسی بہانے ابا میری ماں پر اپنا غصہ نکال لیتا۔ مجھ میں اور میرے بڑے بھائیوں میں فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ بچپن سے ہی ابا کے ساتھ کھیتی باڑی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے تھے جبکہ میں ایسا نہیں کر پایا تھا۔ ان چاروں نے اپنی اپنی ذمہ داریاں بانٹ رکھی تھیں۔ شیدا اور جیرا صبح سویرے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور بھینسوں کو چارہ ڈالنے کے بعد ان کا دودھ نکالتے۔ جبکہ ماڑو اور کاکا ابا کے ساتھ کھیتوں میں چلے جاتے۔ بعد میں شیدا اور جیرا بھی خود روٹی کھا کر ابا اور بھائیوں کے لئے روٹی باندھ کر لے جاتے اور ان کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے۔ کبھی کبھار کھیتوں میں کام زیادہ ہوتا اور چاروں بھائی ابا کے ساتھ گئے ہوتے تو اماں روٹی اور لسی لے کر خود ان کے پاس پہنچ جاتی۔

ہمارے خاندان میں سے کسی نے بھی سکول کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ لیکن نہ جانے سکول کی یونیفارم پہنے صبح صبح سکول جاتے ہوئے بچے مجھے کیوں اچھے لگتے تھے۔ میرے اندر بھی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار سب سے پہلے اپنی ماں سے کیا۔ اماں میرے منہ سے سکول جانے کا سن کر خوشی سے جھوم اٹھی۔ شاید یہ اس کے دل کی بھی آواز تھی اور وہ چاہتی تھی کہ جس طرح دوسروں کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس کے بچے بھی ہر صبح سکول یونیفارم پہنے گھر

سے نکلیں اور تعلیم حاصل کریں۔ لیکن شاید نہ میرے ابا کی ایسی کوئی خواہش تھی اور نہ ہی میرے بڑے بھائیوں میں سے کسی نے سکول جانے کا نام لیا تھا۔ اس لئے ماں کے دل کے ارمان دل ہی میں دفن ہو کر رہ گئے تھے۔ جب میں نے سکول جانے کی بات کی تو اماں کا چہرہ کھل اٹھا لیکن ابا نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ابا نے نہ صرف کھل کر میرے خیال کی مخالفت کی بلکہ اپنی بات کی تائید میں بہت سے دلائل بھی پیش کر دیئے۔ مجھے اپنا سکول جانے کا خواب ٹوٹتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن پھر نہ جانے اماں نے ابا کو کیسے راضی کر لیا یا شاید ابا کا خیال تھا کہ چند دن میں پڑھائی کا بھوت سر سے اتر جائے گا۔

میں سکول جانے لگا۔ اماں ہر روز صبح پیار سے مجھے الوداع کرتی اور سکول سے واپس لوٹتا تو دروازے پر نظریں جمائے میری منتظر ہوتی۔ چونکہ ہمارے خاندان میں پشت در پشت سے زمین کا سینہ پھاڑ کر روزی کمانے کا پیشہ ہی چلا آ رہا تھا اس لئے کھیتی باڑی کے علاوہ تعلیم حاصل کرنا یا کوئی دوسرا کام کرنا خاندان سے بغاوت تصور کیا جاتا تھا اس لئے ابا کی نظر میں اس کے چاروں بڑے بیٹے تو خاندانی روایات کے عین مطابق چل رہے تھے جبکہ میں باغی تھا اور ایک باغی کو جو سزا دی جا سکتی تھی، ابا کسی نہ کسی بہانے وہ سزا مجھے دے ڈالتا۔ چونکہ میری ماں بھی اس بغاوت میں میری ساتھی تھی اس لئے ابا اسے بھی بات بے بات لعن طعن کرتا رہتا۔ گو کہ میرے سکول جانے سے قبل بھی اماں اکثر ابا کے غصے کا شکار ہوتی تھی لیکن اب اس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

ہمارے گاؤں میں بجلی نہیں تھی۔ گاؤں کے مرد صبح ہوتے ہی اپنی گائے، بیل، بھینسوں اور بکریوں کے ہمراہ کھیتوں کی طرف نکل جاتے اور شام کے وقت اندھیرا ہونے سے پہلے گھروں کو لوٹ آتے۔ گاؤں میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی تفریح کا کوئی سامان نہیں تھا۔ صرف چند گھروں میں ریڈیو تھے جو بیٹری سے چلتے تھے اور ان پر عالم لوہار، شوکت علی اور غلام علی کے علاوہ ''نظام دین دی بیٹھک'' پروگرام بہت شوق اور باقاعدگی سے سنا جاتا تھا۔ سردیوں کے موسم میں شام ڈھلتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس جاتے اور ہر طرف مکمل خاموشی چھا جاتی تاہم دور کہیں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی یا وقفے وقفے سے گاؤں کے چوکیدار کی آواز

سنائی دیتی جو ''جاگتے رہنا...... جاگتے رہنا'' کی صدا بلند کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت گاؤں کے لوگ کھلی جگہ جسے ڈیرہ کہا جاتا تھا، چاند کی روشنی میں بیٹھے رات گئے تک گپ شپ لگاتے اور ساتھ ساتھ حقہ بھی چلتا۔ اکثر زمینوں اور فصلوں کی باتیں ہوتیں اور کبھی کبھار باتوں کا رخ سیاست کی طرف پھر جاتا۔

میں اکثر اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اپنا سکول کا کام ختم کر لیا کرتا۔ مگر امتحانوں کے دنوں میں لالٹین یا دیا جلا کر اپنے پاس رکھ لیا کرتا اور اس کی روشنی میں پڑھا کرتا۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ پڑھائی میرا شوق تھا یا اپنے بھائیوں کو ہر وقت مٹی سے بھرے گندے کپڑوں میں زمینداری کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر کھیتی باڑی کے کاموں سے دور بھاگتا تھا اور اپنے بھائیوں کے برعکس صاف ستھرے لباس میں رہنا چاہتا تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا اسے کچھ بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ مجھے کھیتی باڑی کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہی بات میرے ابا کو سخت ناپسند تھی۔ حالانکہ کئی سو ایکڑ پر مشتمل خاندانی زمین تقسیم ہوتے ہوتے اب چند ایکڑ ہی رہ گئی تھی۔ لیکن ابا زراعت کے خاندانی پیشے سے چمٹا ہوا تھا۔ گو کہ حالات دن بدن مشکل ہوتے جا رہے تھے اور رفتہ رفتہ خوشحالی کی جگہ تنگ دستی اپنے قدم جما رہی تھی۔ لیکن ابا سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کسی صورت میں زمینداری کے پیشے سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا اور اس کی شدید خواہش یہی تھی کہ اس کے پانچوں بیٹے یہی پیشہ اپنائیں۔ ابا کے چار بیٹے تو اس کے نقش قدم پر ہی چل رہے تھے مگر میں نے راستہ بدل لیا۔

♦ ...... ♦

مداری کے تماشے سے مجھے مارتے ہوئے گھر لانے میں بھی اسی بات کا دخل تھا۔ حالانکہ میرے چاروں بڑے بھائی بھی اسی جگہ کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے اور ہم ماں بیٹے پر ڈنڈے اور جوتیاں برسانے کے بعد ابا خود بھی سیدھا وہیں جا پہنچا تھا۔ ابا بمعہ اپنے چاروں بڑے بیٹوں کے کسی بھی کھیل تماشے میں جانا اپنا حق سمجھتا تھا لیکن اس کی نظر میں میرے لئے ہر تفریح شجر ممنوعہ تھی۔ ابا کی میرے ساتھ مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر ابا کسی بات پر اماں کو برا بھلا کہتا یا اماں کو کسی نافرمانی پر سزا دیتا تو میں ابا کو ٹوک دیتا۔ جبکہ میرے بڑے بھائی عورت کو بات بے بات مارنا پیٹنا مرد کا حق سمجھتے

تھے۔ ویسے بھی ہمارے گاؤں کے اکثر گھروں میں عورتوں کی پٹائی ہونا معمول تھا اور اسی کو مردانگی تصور کیا جاتا تھا۔ جبکہ چند گھروں کے مرد جو تھوڑی بہت سمجھ بوجھ کی وجہ سے اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے انہیں نامرد کہا جاتا تھا۔

شام ہوئی تو ابا اور میرے چاروں بھائی ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ ماں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ آتے ہی ابا برس پڑا۔ ''کوئی مر گیا ہے کیا...... جو اس طرح چارپائی پر پڑی ہو......؟'' ابا کی آواز سنتے ہی اماں اٹھ بیٹھی لیکن اتنے میں ابا پھر گرجا۔ ''لگتا ہے سوائے چارپائی توڑنے کے تمہیں اور کوئی کام نہیں...... اب بیٹھی بیٹھی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو...... اٹھو اور جلدی سے کھانا لے کر آؤ...... سخت بھوک لگی ہے۔''

اماں خاموشی سے اٹھی اور کھانا تیار کرنے میں لگ گئی۔ اماں چولہے میں آگ سلگا رہی تھی۔ لکڑی کے دھوئیں سے اماں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ پھونکنی سے پھونکیں مار کر آگ جلانے کی کوشش میں تھی کہ ابا نے اسے چٹیا سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اماں اس طرح کے کسی بھی حملے کے لئے تیار نہ تھی۔ ابا کے بال کھینچنے سے اسے بری طرح تکلیف ہوئی۔ ''کیا کرتے ہو شیدے کے ابا...... میرے بال چھوڑو...... خدا کے لئے میرے بال چھوڑ دو۔ مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''

''سور کی بچی...... حقے کی چلم ٹھنڈی پڑی ہے...... اسے تیرا باپ بھرے گا...... دن بھر کا تھکا ہارا مرد گھر لوٹے اور اسے حقہ تازہ کیا ہوا نہ ملے...... ایسی بیوی کو تو تین لفظ بول کر بندہ اس کے گھر نہ بھیج دے......''

میں بے بسی کے عالم میں خاموشی سے بیٹھا اپنی ماں پر ہونے والا ظلم دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر خود کو کوس رہا تھا جبکہ میرے چاروں بھائی اس بات سے لاتعلق ہو کر آپس میں باتیں کر رہے تھے جیسے ان کے لئے اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔

اماں منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر خاموشی سے اٹھی۔ چلم میں آگ بھری، حقہ تازہ کیا اور چارپائی پر بیٹھے ابا کے سامنے رکھ دیا۔ حقہ دیکھ کر میرے چاروں بھائی بھی ابا کے پاس ہی آ بیٹھے اور پھر باری باری حقے کے کش لگانے لگے اور ماں کھانا تیار کرنے کے لئے جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

ہر روز کی طرح کھانا کھانے کے بعد میرے بھائی اٹھے اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا کہ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتے اور کہیں دوستوں میں بیٹھے رات گئے تک تاش کھیلتے یا ہلڑ بازی کرتے۔ واپسی پر ماں چپ چاپ کنڈی کھول دیتی۔ اسے اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ دیر سے آنے پر ان سے وضاحت طلب کرتی۔ جبکہ ابا تو ان کے دیر سے آنے کو ان کا حق سمجھتا تھا وہ بھلا ان سے کیوں پوچھتا۔ تمام تر پابندیاں صرف میرے لئے تھیں کیونکہ وہ چاروں کماؤ پوت تھے اور میں بے کار میں کتابوں کے ساتھ مغز ماری کرتا تھا۔

میں جیسے تیسے سکول جاتا رہا اور ماں چوری چھپے میرے سکول کی فیس بھی بھرتی رہی۔ جس کے لئے وہ کبھی گندم، کبھی مکئی، کبھی کپاس بیچ کر کسی نہ کسی طرح انتظام کر لیا کرتی اور میں پاس ہو کر ماں کا بھرم رکھ لیتا۔ میٹرک کا داخلہ بھجوانے کے لئے ماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ گھر میں کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جسے بیچ کر داخلے کی رقم پوری کر لی جاتی۔

داخلہ بھجوانے کے لئے ابا سے کہتا تو وہ کسی صورت میں بھی نہ مانتا۔ آخر کار کافی سوچ بچار کے بعد اماں نے اپنے کانوں کی بالیاں میرے حوالے کر دیں تاکہ میں انہیں بیچ کر داخلہ فیس جمع کروا سکوں۔ میں نے اماں کو بار بار منع کیا لیکن وہ نہ مانی۔ حالانکہ ان بالیوں سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ جب میرا سب سے بڑا بھائی شیدا پیدا ہوا تھا تو ابا نے بیٹا پیدا ہونے پر خوش ہو کر اماں کو بنوا کر دی تھیں تب سے اماں نے ان بالیوں کو کبھی بھی اپنے کانوں سے نہیں اتارا تھا۔

''دیکھ اماں...... ابا نے یہ بالیاں تمہیں بڑے پیار سے بنوا کر دی تھیں...... تم انہیں نہ بیچو۔'' میں نے اماں کو سمجھایا۔

''اب تو اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ مجھے سمجھانے لگا ہے...... بس تو کسی بات کی پرواہ مت کر اور اللہ کا نام لے کر داخلہ بھجوا دے۔'' اماں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اماں! ایسی چیزیں بار بار نہیں بنا کرتیں اور میری بات یاد رکھنا، یہ بک گئیں تو پھر ابا نے ساری زندگی بھی تمہیں ایسی بالیاں بنوا کر نہیں دینی...... اور...... پھر تمہارے خالی کان اچھے لگیں گے بھلا......؟''

"اچھا تیرا باپ بنوا کر نہیں دے گا تو نہ سہی...... جب تو بڑا ہو کر کمانے لگے گا تو پھر خود بنوا دینا...... اور اگر نہ بھی بنیں تو اس سے کچھ خاص فرق بھی نہیں پڑے گا...... میری دولت، میرا سونا اور میرے ہیرے جواہرات تو میرے بچے ہی ہیں...... تم لوگوں سے بڑھ کر تو ان چیزوں کی اہمیت نہیں ہے ناں۔"

اماں نے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ اس سے آگے مزید کچھ کہنے کی گنجائش کہاں رہی تھی۔ اس لئے میں نے خاموشی سے ماں کے ہاتھوں سے بالیاں لے لیں اور احتیاط سے انہیں جیب میں ڈال لیا۔ اماں نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ شہر میں جا کر کس طرح سنار سے بات کرنا ہے اور پھر رقم لے کر شام ہونے سے قبل سیدھا واپس گھر آنا ہے تاکہ ابا کو اس بات کی خبر نہ ہو۔

میں اگلے روز سکول جانے کے لئے گھر سے نکلا تو اماں کی بالیاں میری جیب میں تھیں۔ کلاس میں بیٹھے ہوئے بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے میں جیب پر ہاتھ لگا کر تسلی کر لیتا کہ بالیاں میری جیب میں موجود ہیں۔ چھٹی ہوئی تو میں اِدھر اُدھر سے پوچھتا ہوا سنار کی دُکان پر جا پہنچا۔ جب میں نے اسے بالیاں دیں تو اس نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا اور پھر طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں یہ بالیاں کہیں سے چوری کر کے لایا ہوں۔ میرے بار بار بتانے کے باوجود بھی اس کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد وہ بالیاں رکھنے کو تیار ہوا۔ مگر جب اس نے رقم بتائی تو وہ ماں کی بتائی ہوئی رقم سے بہت کم تھی۔ ماں کا اندازہ تھوڑا بہت تو غلط ہو سکتا تھا لیکن سنار تو اماں کے اندازے سے آدھی رقم سے بھی کچھ کم پیسے دے رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ چوری کا مال ہے، میں جتنے پیسے بھی کہوں گا یہ لڑکا اتنے ہی لے کر فوراً یہاں سے نکل جائے گا۔ لیکن چونکہ یہ مال چوری کا نہیں تھا اس لئے میں نے اس سے بالیاں واپس لے لیں اور دوسرے سنار کے پاس جا پہنچا۔ وہاں بھی مجھے شک کی نظر سے دیکھا گیا اور دام بہت کم لگائے گئے۔ یوں میں ایک ایک کر کے کئی دکانوں پر گیا لیکن ہر جگہ معاملہ ایک جیسا ہی تھا۔ وقت بھی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مجھے گھر واپس بھی جانا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اب جس دکان پر جاؤں گا اس نے جتنے بھی پیسے دیئے، خاموشی سے جیب میں ڈال کر گھر کی راہ لوں گا۔

میں اپنی آخری کوشش بھرپور طور پر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جیولر کی دکان میں داخل ہوتے ہی دکاندار کا بغور جائزہ لیا۔ وہ مجھے کچھ معقول آدمی لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ کرتا، میں نے اسے تمام تفصیل سنا دی کہ کس طرح مجبوری میں مجھے ماں کی بالیاں فروخت کرنا پڑ رہی ہیں۔ شاید یہ میری باتوں کا اثر تھا یا پھر وہ خود اچھا انسان تھا۔ کیونکہ اس نے بالیوں کا وزن کر کے مجھے جو رقم بتائی، وہ پچھلے دکانداروں کی نسبت کچھ زیادہ تھی۔

میں نے رقم جیب میں ڈالی اور سائیکل کو تیز تیز پیڈل مارتا ہوا گاؤں کی طرف چل پڑا۔ مجھے شام ہونے سے پہلے ہر حال میں گھر پہنچنا تھا۔ کیونکہ ابا شام کے وقت کھیتوں سے واپس گھر آ جاتا تھا۔ اور گھر میں مجھے نہ پا کر اس نے طرح طرح کے سوالات سے اماں کو پریشان کر دینا تھا۔ اس لئے میں جس قدر تیز سائیکل چلا سکتا تھا، چلا رہا تھا۔

موسم خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ میں کسی بھی بات کی پرواہ کئے بغیر جلد از جلد گھر پہنچنے کی دھن میں مگن سائیکل دوڑاتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک دم زوردار پٹاخے کی آواز نے مجھے ڈرا کر رکھ دیا۔ میں ڈر کی وجہ سے وہیں ٹھہر گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ ذہن میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ کیونکہ میری جیب میں ایک مناسب رقم بھی موجود تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کو کوئی لوٹ نہ لے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اِدھر اُدھر کا بغور جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ اچانک میری نظر سائیکل پر پڑی تو اس کا پہیہ پوری طرح سے زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا...... اب ساری بات میرے ذہن میں آ چکی تھی۔ میں نے غصے میں سائیکل کو ایک زوردار لات رسید کی جس کا سائیکل پر تو کچھ اثر نہ ہوا تاہم مجھے چوٹ ضرور لگی۔

قریب کوئی پنکچر لگانے والی دکان بھی نہ تھی اور مجھے بلا تاخیر گھر بھی پہنچنا تھا۔ اس لئے میں سائیکل ہاتھ میں پکڑے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ اب گاؤں جلد پہنچنا میرے لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کیونکہ سائیکل کو پنکچر بھی لگوانا تھا اور اس بات کا بھی ڈر تھا کہ میرے گاؤں پہنچنے سے پہلے کہیں پنکچر لگانے والا دکان بند کر کے نہ چلا جائے۔ کیونکہ گاؤں میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا ہونے سے پہلے

ہی گاؤں سے باہر پکی سڑک پر جو چند دکانیں تھیں وہ بند ہو جاتی تھیں۔ صرف میاں جی کی ہٹی رات آٹھ بجے تک کھلی رہتی تھی۔ یہ دکان گاؤں کے وسط میں واقع تھی۔ اس دکان کا مالک ستر سالہ بوڑھا تھا جسے چھوٹے بڑے سبھی میاں جی کہہ کر پکارتے تھے۔ سردیوں میں میاں جی اپنی چارپائی دکان کے اندر بچھا لیتا اور لحاف میں گھس کر بیٹھا رہتا اور اپنی چارپائی کے پاس ہی لالٹین جلا کر رکھ لیتا۔ جب کوئی گاہک سودا سلف لینے آتا تو لالٹین کی بتی تیز کر لیتا اور پھر فارغ ہو کر لحاف میں جا گھستا۔ گرمیوں کے دنوں میں وہ اپنی چارپائی دکان سے باہر کھلی ہوا میں بچھا کر بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھار شام کے بعد گاؤں کے چند بوڑھے بھی آ کر اس کے پاس بیٹھ جاتے۔ میاں جی کی گپ شپ بھی جاری رہتی اور ساتھ ساتھ دکانداری بھی چلتی رہتی۔

میں اپنے ساتھ ساتھ سائیکل کو دوڑاتا ہوا لے جا رہا تھا۔ میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ میری پنڈلیوں میں مزید چلنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے کچھ فاصلے پر بیل گاڑی جاتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی طرح میں اس بیل گاڑی تک پہنچ جاؤں تو وہ بیل گاڑی گاؤں پہنچنے میں میرے لئے مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر اپنی تمام تر توانائیوں کو یکجا کیا اور دوڑ لگا دی۔ میں رفتہ رفتہ بیل گاڑی کے قریب ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے میرے اور بیل گاڑی کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا ویسے ویسے میرا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔

آخر کار اپنی بھرپور کوشش سے میں بیل گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ بیل گاڑی کے قریب پہنچتے ہی مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کیونکہ وہ بیل گاڑی ہماری ہی تھی۔ اس میں کاکا اور ماڑو بیٹھے تھے۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں میرا بھید نہ کھل جائے اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان کی نظروں میں نہ آؤں۔ لیکن مجھ میں مزید ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت نہ تھی اس لئے مجبوراً مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ میں نے ماڑو کو آواز دی۔ اس نے میری آواز سنی تو پلٹ کر دیکھا اور مجھے دیکھ کر بیل گاڑی روک دی۔ میں نے جلدی سے سائیکل بیل گاڑی پر رکھی اور خود بھی سوار ہو گیا۔

''اوئے جیلو...... تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو......؟'' میرے بیل گاڑی میں بیٹھتے ہی ماڑو نے سوال کیا۔ میں ماڑو کے سوال کرنے سے پہلے ہی خود کو ہر طرح کے

سوالات کے لئے تیار کر چکا تھا۔ اس لئے بغیر کسی تاخیر کے فوراً بول پڑا۔

''تمہیں تو پتہ ہی ہے...... میرے سالانہ امتحان سر پر آ رہے ہیں اس لئے ہم کچھ لڑکے مل کر سکول ہی میں امتحان کی تیاری کرتے رہتے ہیں...... آج سائیکل کا پٹاخہ بول گیا تھا اس لئے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... مگر وقت پر گھر پہنچ جایا کرو...... یہ کوئی وقت تو نہیں ہے ناں گھر آنے کا۔'' ماڑو نے مجھے سمجھایا۔

''بس آج دیر ہو گئی...... کل سے وقت پر گھر آ جایا کروں گا...... بلکہ امتحانوں کی تیاری گھر پر ہی کر لیا کروں گا۔''

میرے جواب پر ماڑو مطمئن ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میرے سائیکل کے ساتھ کتابوں کا بستہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ ورنہ ہو سکتا ہے اسے میری بات کا یقین نہ آتا۔

بیل گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور میری فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ کیونکہ کاکا اور ماڑو تو میرا جواب سن کر خاموش ہو گئے تھے لیکن ابا کو مطمئن کرنا اتنا آسان کام نہ تھا۔ اور پھر پنکچر والی دکان کے بند ہونے کا بھی ڈر تھا۔ ادھر بظاہر تھوڑا سا فاصلہ بھی ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے گاؤں آیا۔ میں پنکچر والی دکان کے سامنے ہی اتر گیا۔ وہ دکان بند کر رہا تھا اور اگر ایک دو منٹ کی مزید تاخیر ہو جاتی تو وہ نکل جاتا۔ میں نے اترتے ہی اسے آواز دی۔ ''چاچا...... او چاچا...... ذرا ٹھہرو...... میری سائیکل پنکچر ہو گئی ہے...... بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں...... ذرا مہربانی کر کے پنکچر لگا دو۔''

''اچھا ہوا تم وقت پر پہنچ گئے...... ورنہ میں تو جا رہا تھا...... بس تم ایک منٹ بیٹھو، میں ابھی پنکچر لگا دیتا ہوں۔''

میں اس کے پاس ہی لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں تو جلدی میں تھا ہی، اسے بھی گھر جانے کی جلدی تھی۔ کیونکہ وہ ساتھ والے گاؤں کا رہنے والا تھا اور اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اسے راستے میں اندھیرا نہ ہو جائے۔ اس لئے اس نے بغیر کوئی وقت ضائع کئے پنکچر لگا دیا اور میں فوراً گھر جا پہنچا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ ابا میرے گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد گھر آیا اور میں ہر طرح کی تفتیش سے بچ گیا۔ ورنہ نہ جانے مجھے کس قسم کے

سوالات کا سامنا کرنا پڑتا۔

میں صحن میں ہی سائیکل کھڑی کر کے کتابوں والا بستہ ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہوا تو اماں بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی اور آتے ہی سوال کیا۔ ''خیر تو تھی، اتنی دیر لگا دی؟ میں تو کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی...... کام تو ہو گیا ناں؟''

''ہاں ماں! کام تو ہو گیا...... مگر کچھ نہ پوچھو...... جس سنار کے پاس جاتا وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتا...... اماں! تم ہی بتاؤ، کیا میں شکل سے چور دکھائی دیتا ہوں؟''

''نہیں جیلو نہیں...... ایسا نہیں سوچتے...... ان لوگوں کا روز کا کام ہے اور پھر کسی کے چہرے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ چور ہے یا سادھو......''

''وہاں تو جو دیر ہوئی تھی وہ اپنی جگہ، رہی سہی کسر سائیکل کے پنکچر نے نکال دی...... اسی لئے تو اتنی دیر ہو گئی ورنہ میں کبھی کا تمہارے پاس ہوتا۔''

''اچھا خیر...... تو ان باتوں کو چھوڑ...... لا پیسے مجھے دے دے...... صبح سکول جاتے ہوئے مجھ سے لے لینا۔''

میں نے تمام رقم گن کر اماں کے حوالے کر دی اور خود سکول کی یونیفارم تبدیل کرنے لگا۔ ماں کو کھانا وغیرہ تیار کرنا تھا اس لئے وہ کمرے سے نکل گئی۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو اماں روز کی طرح حقہ تازہ کر کے ابا کو دینے گئی۔ یہ شاید اس کے اندر کا چور تھا یا ابا کا خوف، وہ بار بار دوپٹے سے اپنے کانوں کو چھپا رہی تھی۔ میں سکول جانے کی تیاری کر رہا تھا لیکن کن اکھیوں سے ادھر بھی دیکھ رہا تھا۔ ایک دو بار ابا کی نظر اماں کے کانوں پر پڑی لیکن ابا نے کوئی سوال نہ کیا مگر جب اماں وہاں سے پلٹنے لگی تو ابا نے اماں کو آواز دی۔

''شیدے کی ماں...... ذرا ادھر آؤ۔''

''کیا بات ہے...... کچھ کہنا ہے کیا......؟'' ماں سمجھ گئی تھی مگر پھر بھی ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

''یہاں تو آؤ۔''

''ہاں بولو...... کیا کہنا ہے؟''

''شیدے کی ماں! یہ تمہارے کانوں کی بالیاں کہاں گئیں؟''

''وہ...... وہ...... بالیاں...... ہاں...... وہ میلی ہو گئی تھیں...... میں نے اتار کر رکھی ہیں...... انہیں دھو کر شام کو پہن لوں گی۔'' خوف کے مارے اماں سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''پہن لینا شیدے کی ماں...... عورت کے خالی کان اچھے نہیں لگتے...... ویسے بھی خالی کان دیکھ کر گاؤں کے لوگ باتیں بناتے ہیں کہ مرد کے ہوتے ہوئے بھی کان خالی ہیں۔''

''تم کیوں پریشان ہوتے ہو...... گاؤں والوں کا کیا ہے...... انہیں باتیں بنانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔''

اماں یہ کہتے ہوئے وہاں سے کھسک آئی اور ابا حقے کے کش لگانے لگا۔ میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو فی الحال بات ٹل گئی۔ اماں کمرے میں چلی گئی اور جاتے ہوئے مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کر گئی۔ میں بھی اماں کے ساتھ ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

''اماں! اب کیا ہو گا......؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم فکر کیوں کرتے ہو...... جو ہو گا، میں دیکھ لوں گی۔ تم داخلے کے پیسے لو اور سکول جاؤ۔ میرا کیا ہے...... بات بات پر گالیاں سننا اور پٹائی ہونا تو شاید میرے نصیب میں ہی لکھ دیا گیا ہے۔ ایک بار تمہارے لئے ایسا ہو گیا تو کیا فرق پڑے گا...... اور ویسے بھی میں نے اپنے بچے کی بھلائی کے لئے قدم اٹھایا ہے۔ کوئی گناہ تو نہیں کیا۔''

اماں یہ کہتے ہوئے رو پڑی اور اس نے مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے۔ اس سے پہلے کہ میں بھی رو پڑتا اور ابا کو خوامخواہ کوئی شک پڑ جاتا، میں نے کتابوں کا بستہ سائیکل کے ہینڈل سے لٹکایا اور سکول کے لئے نکل گیا۔

سکول میں بھی میرا دھیان اماں کی طرف لگا رہا۔ دوپہر کو گھر پہنچا تو گھر میں ہر چیز معمول کے مطابق تھی مگر اماں کی آنکھوں سے خوف ٹپک رہا تھا۔ میں نے اماں کی آنکھوں کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میرے جانے کے بعد روتی رہی ہے۔ ابا اور میرے چاروں بھائی کھیتوں میں گئے ہوئے تھے۔ ویسے وہ گھر میں ہوتے بھی تو کون سی ان میں سے کسی کو ماں کے رونے کی پرواہ ہوتی۔

اس روز نہ جانے کیوں میرا کسی چیز میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں یونہی کچھ وقت دوستوں کے ساتھ گزارنے کے لئے گھر سے نکل گیا۔ گاؤں میں کسی بھی لڑکے کا بلا مقصد کہیں چکر کاٹنا اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اس لئے میں گاؤں سے باہر کھلے میدان میں چلا گیا جہاں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ میں کچھ دیر بے دلی سے وہاں بیٹھا انہیں کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا لیکن پھر گھر لوٹ آیا۔

گھر میں داخل ہوا تو جس بات سے میرا دل ڈر رہا تھا وہی ہو رہا تھا۔ ابا کھا جانے والی نظروں سے اماں کو گھور رہا تھا اور اماں کسی مجرم کی طرح گردن جھکائے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''صاف صاف کیوں نہیں بتاتی کہ بالیاں کہاں ہیں......؟'' ابا گرجا۔

''میں نے کہا ناں...... کہیں نہیں گئیں بالیاں...... میں نے خود ہی اتار کر رکھ دی ہیں۔ جب دل چاہے گا تو پہن لوں گی......'' اماں نے ابا کو ٹالنے کی ناکام کوشش کی۔

''اچھا اگر پڑی ہیں تو لا کر دکھا دو...... تاکہ مجھے تسلی ہو۔'' ابا کی بات سن کر اماں کچھ دیر خاموش کھڑی رہی تو ابا پھر بول پڑا۔ ''اب کھڑی کیوں ہو...... جاتی کیوں نہیں۔ اگر بالیاں پڑی ہیں تو مجھے لا کر دکھا دو...... بات ختم ہو جائے گی۔''

اماں اب اور کیا جواب دیتی۔ ابا کی تسلی کے لئے کمرے میں چلی گئی۔ مگر بالیاں وہاں موجود ہوتیں تو لا کر دکھاتی۔ ایک دو منٹ کمرے میں یونہی گزار کر واپس چلی آئی۔ اماں شاید اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح یہ وقت گزر جائے پھر وہ رات کو تسلی سے تمام تفصیل بتا دے گی۔ مگر ابا کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اماں کے خالی ہاتھ دیکھ کر ابا برس پڑا۔

''مجھے تو پہلے ہی شک تھا......''

''کیسا شک......؟'' اماں نے حیران کن نظروں سے ابا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سور کی بچی...... مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مت الجھاؤ...... سیدھی طرح بتاؤ بالیاں اپنے کس یار کو دے آئی ہو......؟''

''ہوش میں تو ہو شیدے کے ابا...... جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو تم......؟''

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں...... سچ ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے۔

تم جس قدر چاہے چیخو...... میں حقیقت جان کر ہی رہوں گا۔'' ابا نے یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے اماں کو گردن سے دبوچ لیا اور بولا۔ ''میں کہتا ہوں اب بھی وقت ہے...... مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو...... ورنہ میں تمہارا گلا دبا کر تمہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گا۔''

معاملہ بہت بگڑ چکا تھا اور اماں جس کرب سے گزر رہی تھی، وہ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا اس لئے میں خود میدان میں کود پڑا اور ابا کو کہا کہ وہ اماں کو چھوڑ دے۔ لیکن ابا کو میری یہ ادا ناگوار گزری۔ اس لئے اس نے مجھے بری طرح جھٹک دیا۔ ابا کی گرفت کمزور پا کر اماں نے اپنی گردن چھڑوا لی اور ایک طرف ہو گئی۔ ابا مجھ پر جھپٹ پڑا۔

''ارے تو گز بھر کا چھوکرا...... اب میرے معاملات میں ٹانگ اڑائے گا...... سانپ سے پہلے سنپولیے کو کیوں نہ مار دوں...... ماں سے پہلے ماں کے حمایتی کو کیوں نہ ختم کر دوں......''

''دیکھو ابا! پہلے سکون سے میری بات سن لو...... پھر جو جی میں آئے کرنا۔''

''ہاں بول، کیا کہتا ہے؟''

''ابا...... بات یہ ہے کہ اماں نے اپنے کانوں کی بالیاں کسی کو نہیں دیں...... میری میٹرک کی داخلہ فیس جمع کروانا تھی مگر پیسوں کا کہیں سے انتظام نہیں ہو رہا تھا...... تم سے کہتے تو تم نہ جانے کیا کیا باتیں سناتے اس لئے مجبوراً اماں نے میرے ذریعے اپنی بالیاں سنار کو بیچ دیں...... اماں نے تو بھلے کا کام کیا اور تم خوانخواہ اس پر الزام لگائے جا رہے ہو۔''

میں نے ابا کو تفصیل سنائی تو اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ''میں تمہارا دشمن ہوں کیا......؟ بالیاں بیچنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ مجھ سے کہا تو ہوتا۔ میں کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر ہی لیتا۔ تم پڑھنے جاتے ہو تو کیا اس کی خوشی تمہاری ماں کو ہی ہوتی ہے...... ارے نہیں...... تمہیں سکول جاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔''

ابا کے منہ سے ایسی باتیں سنیں تو مجھے حیرانی ہوئی مگر ساتھ ساتھ خوشی بھی محسوس کر رہا تھا کیونکہ اس طرح کی باتیں ابا کے منہ سے زندگی میں پہلی بار سنی تھیں۔

♦ ...... ♦

ہمارے گاؤں میں بجلی نہیں تھی۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان ہوا تو ہمارے حلقے سے انتخابات میں حصہ لینے والا ہر امیدوار گاؤں میں بجلی پہنچانے کا وعدہ کرتے ہوئے ووٹ مانگنے لگا۔ لیکن اس طرح کے وعدے پچھلے کئی انتخابات میں بھی گاؤں والوں کے ساتھ کئے جاتے رہے تھے مگر ہر بار انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد کسی نے بھی پلٹ کر اس طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے گاؤں والوں کا ایک ہی اعلان تھا کہ گاؤں کے سارے ووٹ صرف اس امیدوار کو ملیں گے جو الیکشن سے قبل ان کے گاؤں میں بجلی پہنچائے گا۔

اس سے قبل ہر بار گاؤں کے لوگ اپنی اپنی برادری کے امیدوار کو ووٹ ڈالتے تھے اور گاؤں میں مختلف برادریوں کے ہونے کی وجہ سے مختلف گروپوں میں تقسیم ہو کر رہ جاتے تھے۔ لیکن اس بار گاؤں والے متحد تھے اور ان کی ایک ہی ڈیمانڈ تھی کہ انتخابات سے پہلے ان کے گاؤں میں بجلی پہنچانے والا امیدوار ہی ان کے ووٹ کا مستحق ہوگا۔

گاؤں والوں کا اتحاد و اتفاق کام آیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں بجلی کے کھمبے نصب کر دیئے گئے اور بجلی کی تاروں میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ بجلی سے ہر گھر روشن ہو گیا اور گاؤں والوں کو مٹی کے تیل سے جلنے والے دیے اور لالٹین سے نجات مل گئی۔ کئی گھروں سے بجلی سے چلنے والے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈروں کی آوازیں آنے لگیں اور کسی کسی چھت پر ٹیلی ویژن کا انٹینا لگا ہوا بھی دکھائی دینے لگا۔ جہاں شام ڈھلتے ہی لوگ گھروں میں گھس جایا کرتے تھے وہاں رات گئے کہیں نہ کہیں سے ٹی وی یا ریڈیو کے چلنے کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔

گاؤں میں بجلی آنے کی سب کو خوشی تھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر میں خوش تھا کیونکہ میرے لئے رات کو بھی امتحانوں کی تیاری کرنا آسان ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے میرے امتحان قریب آتے جا رہے تھے، میری پڑھائی کے اوقات بھی بڑھتے جا رہے تھے کیونکہ میں نے اپنے ہی گاؤں کے چند پڑھے لکھے لوگوں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تھا تو ان سب کا یہی کہنا تھا کہ یوں تو ایک طالب علم کو سارا سال ہی محنت کرنی چاہئے لیکن امتحانوں کے دنوں میں پڑھا ہوا زیادہ کام آتا ہے۔ خاص طور پر جس روز جس مضمون کا پرچہ ہو اس روز صبح سویرے جس قدر دہرائی کر لی جائے وہ پرچہ حل

کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس وقت ذہن میں ہر چیز تازہ ہوتی ہے۔ میں سکول سے آنے کے بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر کتابیں اٹھاتا اور کسی درخت کے سائے تلے جا بیٹھتا۔ کبھی کبھی قریب ہی آموں کے باغ میں جا بیٹھتا اور کسی روز نہر کے کنارے بیٹھا پڑھتا رہتا۔ میری ماں کو تو خوشی تھی ہی لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ ابا بھی مجھے پڑھتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتا۔ گاؤں کے لوگ بھی آتے جاتے مجھے کہیں کتابیں لئے بیٹھا دیکھتے تو نہ صرف مجھے دعائیں دیتے بلکہ اپنے بچوں کو میری مثالیں دیتے۔

میں اپنی تیاری سے پوری طرح مطمئن تھا۔ رول نمبر سلپ آئی تو جہاں ہمارا امتحانی مرکز بنا تھا وہ میرے گاؤں سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پرچہ صبح 9 بجے شروع ہونا تھا۔ میں صبح سات بجے ہی گھر سے نکل پڑا تاکہ وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے کمرۂ امتحان میں جا پہنچوں۔ اڈے تک میں اپنی سائیکل پر آیا۔ وہاں چاچا علم دین کی کریانے کی دکان تھی۔ میں نے اپنی سائیکل وہاں کھڑی کر دی اور خود بس پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ بس جگہ جگہ سواریاں اتارتی چڑھاتی جا رہی تھی۔ میری نظر بار بار گھڑی پر پڑتی۔ گو کہ ابھی پرچہ شروع ہونے میں کافی وقت تھا لیکن میں ڈر رہا تھا کہ کسی وجہ سے لیٹ نہ ہو جاؤں۔

بس نے مجھے امتحانی مرکز سے کچھ دور اتار دیا۔ میں وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرۂ امتحان تک جا پہنچا۔ وہاں ابھی امتحان دینے والے چند لڑکے ہی آئے تھے۔ کیونکہ ابھی پرچہ شروع ہونے میں چالیس منٹ باقی تھے اس لئے میں کتاب لے کر ایک طرف بیٹھ گیا اور ضروری ضروری سوالات پر ایک بار پھر نظر مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد لڑکے کمرۂ امتحان میں اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھنے لگے تو میں بھی اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہلکا ہلکا پسینہ بھی آنے لگا تھا اور گھبراہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔

سوالات کا پرچہ ہاتھ میں آیا تو اسے دیکھنے سے پہلے جتنی بھی دعائیں یاد تھیں وہ پڑھ ڈالیں۔ بار بار خدا سے دعائیں مانگنے کے بعد Question Paper دیکھا تو کچھ اطمینان ہوا کیونکہ میرے لئے پرچہ آسان تھا۔ میں نے خدا کا نام لیا اور سوالات کے

جوابات لکھنے لگا۔ پھر ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا سوال حل کیا اور یوں باقی کا پرچہ بھی با آسانی حل کر لیا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ پرچہ حل کرنے کے لئے تین گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا جو اس قدر تیزی سے پورا ہو گیا کہ پتہ بھی نہ چلا۔

میں کمرۂ امتحان سے باہر نکلا تو بہت خوش تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ جس طرح کا پرچہ آج ہوا ہے باقی کے سبھی پرچے بھی اسی طرح کے ہوں۔ میرا واپسی کا سفر بھی جلدی سے طے ہو گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔

جوں جوں میرے پرچے ختم ہوتے جا رہے تھے، میں خود کو پہلے سے ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اب یہ میرا معمول تھا کہ رات گئے تک امتحانوں کی تیاری کرتا اور صبح جلدی اٹھ کر پھر سے دہرائی کر لیتا۔ اس دوران ماں نے بھی اپنا معمول بنا لیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے وہ نیم گرم دودھ کا گلاس لے آتی اور جب تک میں دودھ پی نہ لیتا میرے پاس بیٹھی رہتی۔ گو کہ گاؤں میں دودھ عام تھا لیکن پینا کسی کسی کو نصیب ہوتا تھا۔ کوئی وقت تھا جب دودھ کا پیالہ پیئے بغیر کسی کو نیند ہی نہیں آتی تھی اور صبح صبح لسی اور تازہ مکھن کے بغیر ناشتہ نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن پھر کچھ لوگ گاؤں والوں سے دودھ خرید کر لے جانے لگے۔ شروع شروع میں تو ان لوگوں کو برا بھلا کہا گیا جو دودھ فروخت کرتے تھے لیکن پھر دیکھا دیکھی ہر کوئی اسی راہ پر چل پڑا۔ پیسہ آتے ہوئے کسے برا لگتا ہے۔ لوگ سارے کا سارا دودھ بیچ ڈالتے۔ بس اس میں سے تھوڑا سا دودھ رکھ لیتے جس سے چائے بن جاتی۔ ان حالات میں ماں کا ہر روز میرے لئے دودھ لانا مجھے اچھا لگتا اور ماں کی اس ادا پر مجھے بہت پیار آتا۔ میں سوچا کرتا کہ میری ماں کتنی اچھی ہے اور میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ پھر سوچتا کہ شاید ماں نام ہی پیار کا ہے اور سبھی مائیں اپنے بچوں کا اسی طرح خیال رکھتی ہیں جیسے میری ماں۔ اسی لئے تو خدا نے اپنی جنت کو ماں کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔

میرے دو پرچے ابھی باقی تھے۔ میں بہت خوش تھا کہ چلو آج کا پرچہ دینے کے بعد آخری ایک پرچہ رہ جائے گا۔ میں انہی سوچوں میں گم سائیکل کو پیڈل مارتا ہوا اڈے پر جا پہنچا۔ دکان پر سائیکل کھڑی کرنے کے بعد روز کی طرح میں بس سٹاپ پر

جا کھڑا ہوا۔ اس روز عام دنوں کی نسبت لوگوں کا زیادہ رش تھا۔ جس طرف سے بس نے آنا تھا سبھی کی نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں مگر کوئی بس آتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور دونوں طرف دور دور تک سڑک خالی دکھائی دے رہی تھی۔

بس سٹاپ پر کھڑے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن وہاں کوئی گاڑی نہیں آئی تھی اور نہ ہی دوسری طرف کوئی گاڑی گزر کر گئی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج کسی طرف سے کوئی بس یا ویگن کیوں نہیں آ رہی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم کھڑا تھا کہ دور سے ایک بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہاں پر موجود تمام لوگ بس پر سوار ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ جیسے جیسے بس قریب آ رہی تھی، لوگ ایک دوسرے سے آگے ہو کر کھڑے ہو رہے تھے تاکہ جیسے ہی بس اسٹاپ پر آ کر رکے وہ سب سے پہلے سوار ہو جائیں۔ مگر بس آئی اور وہاں رکے بغیر تیزی سے گزر گئی۔ اس بس کی چھت بھی سواریوں سے بھری ہوئی تھی اور بہت سے لوگ دروازوں سے بھی لٹک رہے تھے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے کوئی بھی اس پر سوار ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ تاہم ایک دو نوجوان اپنی کوشش سے بھاگ کر کسی نہ کسی طرح بس کے پیچھے لٹک گئے اور باقی لوگ بس کو جاتا ہوا دیکھتے ہی رہ گئے۔

میرا پرچہ شروع ہونے میں صرف چند منٹ ہی باقی رہ گئے تھے۔ میری پریشانی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن ٹریفک نہ چلنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگ گالیاں نکالتے ہوئے جیسے آئے تھے ویسے ہی گھروں کو واپس لوٹنے لگے۔ پھر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کچھ لوگوں سے معاملے کی تفصیل پوچھی تو پتہ چلا کہ ہمارے ملک کے وزیر اعظم چند روز بعد علاقے میں جلسہ کرنے والے ہیں جسے کامیاب بنانے کے لئے پہلے سے ہی زبردستی بسیں اور ویگنیں پکڑ کر اپنے قبضے میں کر لی گئی تھیں تاکہ جلسے کے روز لوگوں کو ان میں بھر بھر کر جلسہ گاہ میں پہنچایا جا سکے اور مخالفین کو دکھایا جا سکے کہ کس طرح لاکھوں کی تعداد میں لوگ وزیر اعظم کے جلسے میں دوڑے چلے آئے ہیں۔ جہاں جو گاڑی نظر آئی اسے وہیں روک کر سواریوں کو اتار دیا گیا تھا اور گاڑی پکڑ کر لے گئے تھے اور اگر کہیں ایسا نہ ہو سکا تو گاڑی کے کاغذات قبضے میں کر لئے اور ڈرائیور کو مقررہ جگہ پر واپس آنے کا حکم دے ڈالا۔ جو ان سے بچ نکلے تھے انہوں نے

اپنی گاڑیاں گھروں میں کھڑی کر دی تھیں تا کہ وہ پکڑ دھکڑ سے محفوظ رہ سکیں۔

لوگ حکمرانوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ جس کسی کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ حکومت کے خلاف کہے جا رہا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ دبے الفاظ میں اور کچھ ننگی گالیاں دے رہے تھے۔ ہر کوئی غصے میں بھرا ہوا تھا اور اپنے منہ سے زہر اگل رہا تھا۔ لیکن وہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے اس لئے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے اور سارا سٹاپ خالی ہو گیا۔ وہ سڑک جہاں ہر طرح کی گاڑیاں دوڑتی پھرتی تھیں وہ سنسان اور ویران پڑی تھی۔ تاہم وقفے وقفے سے کوئی کار وہاں سے گزرتی ہوئی دکھائی دے جاتی۔ بسوں کا وہ اڈہ جہاں کچھ دیر پہلے گہما گہمی تھی اور آس پاس کے مختلف دیہاتوں سے آئے ہوئے لوگوں کا رش لگا ہوا تھا، وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک دیہاتی نوجوان لڑکا اپنی گدھا گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ گدھا گاڑی پر کوئی گٹھری نما چیز رکھی تھی جس کو اچھی طرح کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ میری طرح اس نوجوان کی نظریں بھی مسلسل اسی طرف لگی ہوئی تھیں جس طرف سے بس نے آنا تھا۔

میرا پرچہ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ میرا کمرۂ امتحان میں پہنچنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا کیونکہ اگر مجھے کوئی تیز ترین رفتار والی گاڑی بھی میسر آ جاتی تو پھر بھی پانچ منٹ میں منزل تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس دوران میں نے آخری کوشش کے طور پر وہاں سے گزرنے والی ہر کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر لفٹ مانگی لیکن کسی نے بھی وہاں بریک نہ لگائی۔ میں ہر طرح سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایسے میں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اگر وہ سربراہ جس کی وجہ سے مجھے یہ وقت دیکھنا پڑ رہا تھا کسی طرح میرے سامنے آ جائے تو میں بلا تاخیر اسے گولی سے اڑا دوں لیکن ایسا کہاں ممکن تھا۔ اس لئے بے بسی کے عالم میں میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ قریب تھا کہ میں دھاڑیں مارنے لگتا، اسی وقت میرے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز پڑی۔ میں اپنا رونا بھول کر اس طرف کو پلٹا جہاں سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ گدھا گاڑی کے پاس کھڑا ہوا نوجوان گٹھری کو دیکھ دیکھ کر رو رہا تھا۔

میں فوری طور پر اس کے پاس گیا تا کہ اس کے رونے کا سبب جان سکوں۔

''کیا بات ہے......؟ رو کیوں رہے ہو......؟'' میں نے نوجوان سے سوال کیا۔

''میرا...... باپ مر گیا......'' نوجوان نے روتے ہوئے بتایا۔

''باپ مر گیا...... مگر کب......؟'' میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''ابھی ابھی فوت ہوا ہے۔''

''تمہیں یہاں کھڑے کھڑے کیسے معلوم ہوا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے؟''

''یہ دیکھو...... ابھی میرے سامنے ہی تو اس نے دم دیئے ہیں......'' نوجوان گٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔ ''رات سے ہی اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔ گاؤں کے ڈاکٹر نے اسے ہسپتال لے جانے کا کہا تھا۔ اس لئے میں صبح سویرے ہی ریڑھی پر لٹا کر یہاں لے آیا تھا تا کہ اسے ہسپتال لے جاؤں۔ مگر بس کے نہ آنے کی وجہ سے میرے باپ نے یہیں تڑپتے ہوئے جان دے دی۔''

اسے روتا ہوا دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ آنسو اس نوجوان کو روتا ہوا دیکھ کر نکل پڑے تھے یا ان میں میرا اپنا دکھ بھی شامل تھا۔ لیکن ہم دونوں ہی رو رہے تھے۔ ہمارے رونے کی آوازیں سن کر دکاندار بھی وہاں اکٹھے ہو گئے۔ ہر کسی کو نوجوان کے باپ کی موت کا دکھ تھا۔ سب مل کر نوجوان کو تسلی بھی دے رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ حکمرانوں کو گالیاں بھی نکال رہے تھے۔ کیونکہ ٹریفک بند ہونے کی وجہ سے اڈے پر لوگوں کے نہ آنے سے ان کا کاروبار بھی متاثر ہوا تھا۔

اڈے کے دو تین دکاندار اس نوجوان کے گاؤں کے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر اپنی دکانیں بند کر دیں اور اپنی اپنی سائیکل اٹھا کر اس گدھا گاڑی کے ساتھ ہو لئے جس پر نوجوان اپنے باپ کی لاش لے جا رہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد دوسرے دکاندار بھی اپنی اپنی دکانوں میں جا بیٹھے اور میں ایک بار پھر وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تو پرچہ شروع ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ اب وہاں کھڑے رہنا بے معنی تھا اس لئے میں نے خاموشی سے اپنی سائیکل اٹھائی اور گھر کی راہ لی۔

گاؤں تک کا سفر ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مجھ سے سائیکل ٹھیک طرح سے چلائی نہیں جا رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے

میرے جسم میں سے جان نکال لی ہو۔

جیسے تیسے سفر ختم ہوا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اماں تڑپ اٹھی۔ میں ابھی سائیکل کھڑی کر رہا تھا کہ وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔

''جیلو...... خیر تو ہے......تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے...... یوں لگتا ہے جیسے تم رو کر آئے ہو......لگتا ہے تمہارا پرچہ اچھا نہیں ہوا۔''

اماں کے اتنے سارے سوالوں کا جواب میں کیسے دیتا؟ مجھ میں تو ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اماں کو کس طرح سے جواب دوں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں اماں بول پڑی۔

''جیلو! تو کچھ بتاتا کیوں نہیں...... کچھ تو بتا کہ ماں کی پریشانی دور ہو......''

''اماں...... میں کیا بتاؤں......بس یوں سمجھ لو کہ جیسے گھر سے گیا تھا ویسے ہی لوٹ آیا ہوں۔''

''کیا مطلب......؟ تو...... امتحان دے کر نہیں آیا......؟''

''کیسا امتحان...... اماں!...... میں تو وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکا...... امتحان کیا دیتا۔''

''لیکن کیوں......؟ گھر سے تو، تو امتحان دینے کے لئے ہی نکلا تھا...... پھر وہاں پہنچا کیوں نہیں......؟''

''کوئی گاڑی ہی نہیں ملی اماں!''

''کیوں...... سب بسوں ویگنوں کو آگ لگ گئی ہے کیا......؟'' اماں کی پریشانی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

''کہتے ہیں کسی جگہ وزیراعظم کا جلسہ ہو رہا ہے۔ وہاں لوگوں کو جمع کر کے لے جانے کے لئے گاڑیاں پکڑ لی گئی ہیں۔ اس وجہ سے مجھے بھی کوئی گاڑی نہیں ملی اور میں تھک ہار کر واپس گھر آ گیا ہوں......''

میری بات سنی تو اماں رو پڑی۔ وہ میرے بار بار سمجھانے اور چپ کرانے کے باوجود بھی خاموش نہیں ہو رہی تھی اور روتے ہوئے مسلسل حکمرانوں کو کوس رہی تھی۔ اس وقت ابا نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ اماں نے ابا کو دیکھ کر اور بھی آسمان سر پر اٹھا لیا۔

''ارے شیدے کے ابا...... سنا تم نے...... جیلو آج بغیر پرچہ دیئے ہی گھر آ گیا......

ہائے میں کیا کروں...... میں اپنا دُکھڑا کسے سناؤں......؟''

''شیدے کی ماں!......تم ایک منٹ زبان بند کرو تو میں کوئی بات کروں۔'' ابا نے اماں کو چپ ہونے کو کہا تو اماں سہم کر فوراً خاموش ہو گئی۔ پھر ابا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اوئے جیلو......تو بتا، معاملہ کیا ہے......؟''

''ابا!...... آج کسی قسم کی ٹریفک ہی نہیں چل رہی...... اس لئے مجبوراً مجھے پرچہ دیئے بغیر ہی گھر واپس آنا پڑا۔''

''دیکھ جیلو! تو مجھے سچ سچ بتا دے کہ کہاں آوارہ گردی کرتا رہا ہے۔ ورنہ تجھے میرا اچھی طرح پتہ ہے۔''

''ابا! میرا یقین کرو...... میں سچ کہہ رہا ہوں...... بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں اپنا پرچہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا پھرتا۔''

''دیکھ جیلو...... میں آخری بار کہہ رہا ہوں...... مجھے سچ سچ بتا دے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔''

''اب اور کیا بتاؤں ابا......تم مانو یا نہ مانو، جو بتایا ہے وہی سچ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تو سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ ٹھہر جا، ابھی بتاتا ہوں تجھے۔'' ابا نے یہ کہتے ہوئے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، وہاں اسے چمٹا پڑا ہوا نظر آ گیا۔ اس نے چمٹا اٹھا لیا اور مجھ پر برسانا شروع کر دیا۔ ابا کے ہاتھوں لوہے کا چمٹا میرے جسم پر پڑتا تو میری چیخ نکل جاتی۔ مجھے ناکردہ گناہ کی سزا مل رہی تھی اور میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اماں سے میرا تڑپنا برداشت نہ ہو سکا اور وہ ابا کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ابا کسی کی ماننے والا کہاں تھا۔ اس نے ماں کو دھکا دیا اور میری پٹائی جاری رکھی۔ ماں نے ایک بار پھر ہمت کی اور ابا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن ابا کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس نے ماں کی اس گستاخی پر کچھ سزا اسے بھی دے ڈالی۔ ہم ماں بیٹے کی کسی بھی فریاد کا ابا پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ آخر تھک کر خود ہی ابا نے چمٹا ایک طرف پھینک دیا اور خود وہاں سے نکل گیا۔ اماں چکر کھا کر زمین پر گر پڑی اور میں فوری طور پر اماں کے پاس پہنچ گیا۔

ابا کی یہ عادت بن چکی تھی کہ جب بھی کسی بات پر وہ مجھے یا اماں کو سزا دینے لگتا تو

اس وقت تک اس کا ہاتھ نہ رکتا جب تک وہ خود نہ تھک جاتا اور پھر اچھی طرح اپنی تسلی کرتے ہی گھر سے باہر نکل جاتا۔ وہ تو بس پٹائی کرنا جانتا تھا۔ اسے اس بات کی ہرگز پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ چوٹ کہاں کہاں لگ رہی ہے۔

اماں بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اس کے گالوں کو ہلکا ہلکا تھپتھپایا لیکن وہ ہوش میں نہ آئی۔ میں بھاگ کر گلاس میں پانی ڈال لایا اور اماں کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تب کہیں جا کر ماں کو ہوش آیا۔ میں نے اماں کو بازوؤں سے پکڑ کر بمشکل کھڑا کیا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ چارپائی پر لیٹتے ہی اماں پھر بے ہوش ہوگئی۔ میرے پانی کے چھینٹے ڈالنے پر اس نے آنکھیں کھولیں مگر پھر بے ہوش ہوگئی۔

اماں کے بار بار بے ہوش ہونے پر میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ماں کو بے ہوشی کی حالت میں ہی چھوڑ کر میں چوہدری نبی بخش کے ڈیرے کی طرف دوڑا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ابا یہاں سے نکل کر سیدھا وہیں گیا ہوگا۔ میں ڈیرے پر پہنچا تو ابا درختوں کی چھاؤں تلے چارپائی پر بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی ابا کو بتایا کہ ماں کو نہ جانے کیا ہوا ہے۔ وہ ہوش میں ہی نہیں آ رہی۔ میری بات سن کر ابا بولا۔

"ابھی زندہ ہی ہے ناں...... مری تو نہیں......"

"ابا! کیسی باتیں کر رہے ہو...... چل کر دیکھو تو سہی۔"

"میں ڈاکٹر یا حکیم ہوں جو مجھے بتانے آ گئے ہو...... جاؤ میرا دماغ خراب مت کرو...... کہیں نہیں مرتی وہ......"

اب میں ابا کو کیا بتاتا۔ خاموشی سے واپس چل پڑا۔ میرے کانوں میں ابا کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص کی آواز پڑی تو میں رک گیا۔ وہ شخص کہہ رہا تھا کہ جا کر دیکھ تو لو، کہیں حالت زیادہ ہی خراب نہ ہو۔ مگر ابا کہاں کسی کی ماننے والا تھا، فوراً بول پڑا۔ "تم پتہ پھینکو یار...... مجھے سب معلوم ہے...... یہ ان عورتوں کے بہانے ہوتے ہیں۔"

مجھے اماں کی فکر لگی ہوئی تھی اس لئے میں وہاں سے فوراً واپس گھر آ گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو اماں ہوش میں آ چکی تھی اور چارپائی پر گردن جھکائے بیٹھی تھی۔

"اماں...... تم ٹھیک تو ہو......؟"

"تم میری فکر مت کرو...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اماں کی حالت دیکھ کر مجھے اس پر بہت ترس آ رہا تھا۔ میں اماں کے پیچھے بیٹھ کر اس کی کمر دبانے لگا۔

"اماں...... مجھے معاف کر دینا...... میری وجہ سے تمہیں بھی ابا سے مار پڑ جاتی ہے۔ بس تم میرے معاملات میں دخل ہی نہ دیا کرو۔"

"سبھی ماؤں کو اپنے بچوں سے پیار ہوتا ہے اور وہ اپنے بچوں کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہیں...... میں بھلا تمہیں روتا تڑپتا دیکھ کر کیسے خاموش رہ سکتی ہوں......؟"

"پھر بھی اماں......"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو...... ادھر میرے سامنے آؤ......" اماں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا اور پھر مجھے لٹا کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اماں آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں میرے بالوں میں پھیرنے لگی اور میری آنکھ لگ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ صحن کا بلب روشن تھا۔ اماں چارپائی پر لیٹی تھی۔ ابا اس پر جھکا ہوا تھا۔ شیدا اور ماڑو بھی چارپائی کے پاس کھڑے تھے۔ انہیں اماں کے پاس کھڑا دیکھ کر میری پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔ کیونکہ انہیں کھیتی باڑی اور گائے بھینسوں کے علاوہ کسی دوسری چیز کی کہاں پرواہ تھی اور وہ بھی ماں کی جوان کی نظر میں فالتو اور غیر اہم تھی۔ اس لئے میں گھبرا کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ماں کے پاس آ گیا۔

"کیا ہوا اماں! تم ایسے کیوں لیٹی ہو؟" میں نے گھبرا کر اماں سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے...... بس ایسے ہی ذرا سی تکلیف ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔" اماں نے تسلی دی۔

اماں کے جواب سے مجھے تسلی نہ ہوئی اس لئے میں نے ابا سے پوچھ لیا۔ "ابا! کچھ تم ہی بتاؤ ناں...... اماں کو کیا ہوا ہے......؟"

"جب میں غصے میں تمہیں مار رہا تھا تو یہ میرے سامنے آ گئی اور میں نے اسے دھکا دے دیا۔ یہ سینے کے بل سیدھی چارپائی کے پائے پر جا گری...... شاید سینے میں کوئی اندرونی چوٹ لگی ہے جس کی وجہ سے تمہاری ماں کو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اس کے اندر خون کے قطرے گر رہے ہیں...... اسے دو بار خون کی الٹیاں بھی آئی ہیں...... میں

خود جا کر حکیم سے دوائی لے کر آیا ہوں لیکن یہ دوائی کھانے کو تیار ہی نہیں...... ہماری تو مانتی نہیں، تم کوشش کر کے دیکھ لو، شاید تمہارے کہنے سے دوائی کھا لے۔“

ابا کی بات سنی تو مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہو۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ماں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکل کر گالوں پر پڑ رہے تھے۔ اماں نے آنسو چھپانے کی غرض سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے حکیم کی دی ہوئی دوائی ابا کے ہاتھ سے پکڑی اور اماں کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”اماں...... دوائی کھا لو......“ میں نے اماں کو منانے کی کوشش کی۔

”میں نے کہہ دیا ناں...... میں نے دوائی نہیں کھانی۔“

”اماں!...... ضد مت کرو...... دوائی لے لو۔“

”تم سب لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو...... میں نے جب ایک بار کہہ دیا کہ میں نے دوائی نہیں کھانی......“

”دیکھو اماں...... تم دوائی نہیں کھاؤ گی تو ٹھیک کیسے ہو گی......؟“

”کچھ نہیں ہونے والا مجھے...... اور ویسے بھی گھر میں میری پرواہ کسے ہے...... اگر میں مر بھی گئی تو کسی کو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔“

”اماں...... بس اب جانے بھی دے ناں......“ پاس کھڑا ہوا ماڑو بھی بول پڑا۔

”دیکھ شیدے کی ماں...... تجھے غصہ مجھ پر ہے ناں...... ان بچوں نے تو تیرا کچھ نہیں بگاڑا...... چل تو میری نہیں مانتی نہ سہی...... تیری مرضی...... لیکن ان کی تو مان لے۔“ ابا نے التجا کی۔

”اماں...... چل اب مان جا...... دیکھ ہم سب مل کر تمہاری منت کر رہے ہیں...... ابا خود حکیم جی سے دوائی لے کر آیا ہے...... تمہاری وجہ سے ماڑو اور جیلو بھی پریشان کھڑے ہیں...... جیرا اور کاکا بھی آتے ہی ہوں گے۔ انہیں تو ابھی تمہاری بیماری کے بارے میں معلوم ہی نہیں......“ شیدا بھی ماں کو سمجھانے لگا۔

شیدے کی بات سن کر اماں نے لیٹے لیٹے باری باری ہم سب کی طرف دیکھا، پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوائی میرے ہاتھ سے لے کر کھا لی اور لیٹ گئی۔ اس کے قریب ہی

ہم بھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ہم سب کی نظریں اماں پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد دوا نے اپنا اثر دکھایا اور اماں خراٹے لینے لگی۔

کچھ ابا کے رویے کی وجہ سے اور کچھ اماں کی طبیعت خراب ہونے کے باعث میں اپنے آخری پرچے کی تیاری نہ کر سکا۔ ویسے بھی ٹریفک کی پوزیشن بدستور ویسی ہی تھی۔ میرا امتحانی مرکز تک پہنچنا بھی آسان نہ تھا اس لئے میں نے وہ پرچہ بھی چھوڑ دیا۔ میں اپنے دو پیپر چھوٹ جانے کی وجہ سے جس عذاب سے گزر رہا تھا اس کا اندازہ مجھے ہی تھا۔ میرے ارمانوں کی کرچیاں بکھر چکی تھیں۔ میں نے جس قدر شوق اور لگن سے امتحان کی تیاری کی تھی، یقینی طور پر میں اچھے نمبر لے کر کامیاب ہوتا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور میں ٹوٹ کر رہ گیا۔

♦ ...... ♦

کھیتی باڑی کے کاموں میں تو مجھے پہلے سے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی، اب کتابوں سے بھی دور بھاگنے لگا۔ دن بدن میرے لئے وقت گزارنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اماں کی طبیعت سنبھلنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ گرتی پڑتی گھر کے کام نمٹا لیتی، لیکن پھر تھک کر چارپائی پر لیٹ جاتی۔ حکیم جی کا علاج جاری تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ پھر کسی نے شاہ صاحب سے دم کروانے کو کہا۔ میں ابا کے کہنے پر اماں کو ہفتے میں دو بار دم کروانے شاہ صاحب کے پاس لے جاتا۔ شاہ صاحب نے ایک ماہ تک دم کیا، تعویذ دیئے اور پانی پڑھ کر پینے کو دیا لیکن اماں ٹھیک نہ ہوئی۔ اماں کی صحت اچھی بھلی تھی مگر کچھ ہی عرصے میں وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

گاؤں کے چند سیانوں نے ابا کو مشورہ دیا کہ وہ اماں کو کسی ہسپتال لے جائے۔ ابا کو خود بھی اماں کی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا اس لئے طے پایا کہ مزید وقت ضائع کئے بغیر اماں کو شہر کے کسی ہسپتال میں چیک کروایا جائے۔ ابا نے اپنے ہمراہ چاچی رخسانہ کو بھی لے لیا تاکہ ڈاکٹروں نے اگر اماں کو ہسپتال داخل کر لیا تو وہ اماں کا خیال رکھ سکے۔ میں بھی اماں کے ہمراہ جانا چاہتا تھا لیکن ابا راضی نہ ہوا۔

صبح سویرے ہی ماڑو نے بیل گاڑی تیار کر کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی کر دی۔ اماں کو پکڑ کر بیل گاڑی میں بٹھایا گیا۔ ابا اور چاچی بھی بیل گاڑی پر سوار ہو

گئے۔ میں بھی ضد کر کے بیل گاڑی پر چڑھ گیا۔ ابا نے اس شرط پر اجازت دی کہ وہ انہیں بس پر بٹھا کر ماڑو کے ساتھ ہی بیل گاڑی پر گھر واپس آ جائے گا۔ وہاں گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے جو اماں کو ہسپتال جاتے ہوئے دیکھنے آئے تھے۔

راستے میں اماں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ میری ماں جا رہی تھی۔ میں اس کی تصویر دل میں اتار لینا چاہتا تھا۔ اماں کے چہرے پر مکھیاں بیٹھ رہی تھیں۔ چاچی وقفے وقفے سے اپنے دوپٹے کے پلو سے مکھیاں اڑا دیتی لیکن وہ پھر اماں کے چہرے پر آ بیٹھتیں۔ اڈے پر پہنچ کر احتیاط سے اماں کو بیل گاڑی سے اتارا گیا۔ بیل گاڑی سے اتر کر اماں کو بس میں سوار ہونا تھا۔ اماں نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نظر ماڑو پر پڑی۔ ماڑو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اماں نے ماڑو کو گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ پھر میری طرف بڑھی۔ میں بھی رو رہا تھا۔ دوڑ کر اماں کے گلے لگ کر اور بھی رونے لگا۔ اماں نے مجھے بھی پیار کیا۔ اتنے میں بس آ کر رکی۔ ہم سب نے مل کر اماں کو بس میں سوار کروایا۔ بس چل پڑی مگر میں اور ماڑو وہیں کھڑے بس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد ہم دونوں بیل گاڑی پر واپس گاؤں آ گئے۔

♦ ...... ♦

اماں کو گھر سے گئے تین روز گزر چکے تھے۔ اس دوران تینوں وقت کی روٹی چچا بشیر کے گھر سے پک کر آتی جو ہم بے دلی سے کھا لیتے۔ ہم پانچوں بھائی گھر پر ہوتے لیکن گھر میں مکمل خاموشی چھائی رہتی۔ گاؤں میں فون کی سہولت بھی نہ تھی کہ ہم کسی طرح اماں کے متعلق معلوم کر لیتے یا ابا ہی ہمیں اماں کی کچھ خبر دے دیتا۔ میرے چاروں بھائی تو اپنے اپنے کام پر نکل جاتے لیکن میں گھر میں پڑا رہتا۔

میں لیٹا ہوا تھا کہ دور کہیں سے ایمبولینس کے سائرن کی آواز میرے کانوں میں پڑی جو آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن فوری طور پر اماں کی طرف گیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے کیونکہ اس سے قبل دو تین بار ایسی ہی گاڑیوں میں ہسپتال گئے ہوئے مریضوں کی لاشیں گاؤں پہنچی تھیں۔ آواز اور بھی قریب ہوتی گئی۔ پھر ہمارے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میں فوراً اٹھا اور ننگے پاؤں ہی دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔ میرے چاروں بھائی جو میرے قریب ہی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے وہ بھی میرے ساتھ ہو لئے۔

میں باہر نکلا تو ایمبولینس ہمارے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ ہمارے جانے سے پہلے ہی بہت سے لوگ ایمبولینس کے اردگرد جمع ہو چکے تھے اور کچھ لوگ دوڑے چلے آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کا سارا گاؤں وہیں آ جمع ہوا۔ کاکا دوڑ کر چارپائی اٹھا لایا۔ اماں کو بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر ایمبولینس سے اتار کر چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ ہمارے ساتھ ساتھ اور بھی کئی لوگ آنسو بہا رہے تھے۔ عورتیں گھروں کی چھتوں پر چڑھی بین کرنے لگیں۔ ابا نے جب بتایا کہ اماں زندہ ہے اور محض اس کی خراب حالت کی وجہ سے اسے ایمبولینس میں لانا پڑا تو رونے پیٹنے کی آوازیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔

اماں پہلے سے بھی کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی چارپائی برآمدے میں رکھ دی گئی۔ صحن

عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ چاچی سے اماں کے متعلق تمام تفصیلات معلوم کر رہی تھیں۔ ابا مردوں میں کھڑا اماں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہم سب بھائی ایک کونے میں لگے کھڑے تھے۔ پھر کسی نے ہمیں بیٹھنے کو کہا تو ہم چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔

جب ایک ایک کر کے سب لوگ چلے گئے تو ابا ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اماں کے پاس تائی اور چاچی بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ہی ہماری چچا اور تایا زاد بہنیں بھی بیٹھی تھیں۔ اماں لیٹی ہوئی تھی۔ کوئی اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی اور کوئی اس کے بازو دبا رہی تھی۔

''ابا! ڈاکٹر کیا کہتے ہیں......؟'' شیدے نے ہمت کر کے ماں کے متعلق پوچھا۔

''بس دوائیاں لکھ دی ہیں...... کہتے ہیں گھر پر ہی کھلاؤ......'' ابا نے مختصر جواب دیا۔

''ابا!...... اماں کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی...... اور تم اسے واپس لے آئے ہو۔'' ماڑو نے ابا کو کریدا۔

''میں بھلا ڈاکٹروں سے کیا الجھتا...... انہوں نے کہا واپس لے جاؤ...... میں واپس لے آیا۔''

ماڑو کچھ بولنے والا تھا کہ جیرا بول پڑا۔ ''ابا! جب تم اماں کو ہسپتال لے ہی گئے تھے، وہاں تسلی سے اس کا علاج کرواتے اور اماں خود اپنے پیروں پر چل کر آتی۔''

''اچھا اللہ اب بھی خیر کر دے گا۔ انہوں نے جو دوائیاں لکھ کر دی تھیں میں لے آیا ہوں۔ تمہاری ماں وہ دوائیاں کھائے گی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' ابا نے تسلی دی۔

ابا بھائیوں سے بات کر رہا تھا اور میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابا ہم سے کچھ چھپا رہا ہو اس لئے مجھے تسلی نہ ہوئی اور میں نے ابا سے سوال کیا۔ ''ابا...... پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم ہم سے کچھ چھپا رہے ہو...... ذرا تفصیل سے بتاؤ تو سہی کہ ہسپتال والوں نے اماں کو علاج کئے بغیر واپس کیوں بھیج دیا......؟''

میری بات سن کر ابا کچھ کہے بغیر گردن جھکا کر کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اپنے بچوں کو حقیقت سے آگاہ کر دے یا نہیں۔ وہ اسی طرح گردن جھکائے کچھ دیر بیٹھا رہا، پھر اس نے گردن اٹھائی تو اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو ساری بات خود سنا رہے تھے۔ پھر بھی ابا نے ہمت کی اور بولا۔

''جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو...... تمہاری ماں...... اب کچھ دنوں کی ہی مہمان ہے...... میں تمہاری ماں کو لے کر ہسپتال پہنچا تو انہوں نے اس کی حالت دیکھتے ہی فوری طور پر داخل کر لیا تھا...... پھر کئی طرح کے ٹیسٹ کروائے اور جب رپورٹیں آئیں تو تمام ڈاکٹر سر جوڑ کر بیٹھ گئے...... پھر مجھے بلا کر پہلے تو تسلی دیتے رہے، بعد میں بڑے ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہاری بیوی کو کینسر ہے اور یہ مرض پورے جسم میں پھیل چکا ہے جسے کنٹرول کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں...... اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے واپس گھر لے جاؤ۔ پھر اس نے دوائیاں لکھ کر دے دیں اور کہا کہ یہ کھلاتے رہو...... شاید خدا کچھ بہتری کر دے۔''

ابا کے منہ سے اماں کی بیماری کا سن کر ہم میں سے کسی کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ کوئی مزید بات کرتا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اماں کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ ہماری تمام رشتے دار خواتین اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ چاچی نے اماں کے پاس ہی اپنی چار پائی بچھا لی اور ہم بھی خاموشی سے اپنی اپنی چار پائیوں پر لیٹ گئے۔

اگلے روز سے اماں کو ڈاکٹروں کی ہدایات کے مطابق دوا دی جانے لگی۔ شاید یہ دوا کا اثر تھا یا کمزوری کہ اماں ہر وقت چار پائی پر پڑی رہتی۔ کبھی کبھی آنکھیں کھولتی اور ہم میں سے کسی کو اپنے قریب پا کر اپنی چار پائی پر بٹھا لیتی اور پھر اپنے سینے پر لٹا کر پیار کرنے لگتی۔ شاید اسے اپنی اندرونی حالت کا علم تھا اس لئے ہمیں پیار کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے مگر زبان سے اس نے کبھی کوئی لفظ نہ نکالا۔

آخر...... وہ دن آن پہنچا...... جب...... ہم سب اماں کی چار پائی کے پاس کھڑے رو رہے تھے اور وہ ہمیں روتا ہوا چھوڑ کر خدا کو پیاری ہو گئی...... اماں کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں کی عورتیں روتی پیٹتی ہمارے گھر آ پہنچیں۔ ہمارا گھر عورتوں سے بھر گیا۔ گھر کے اندر اور باہر لوگوں کے بیٹھنے کے لئے زمین پر دریاں بچھا دی گئیں۔ نہ صرف ہمارے گاؤں میں بلکہ آس پاس کے دیہاتوں کی مساجد میں بھی اماں کے فوت ہونے کے اعلانات کروا دیئے گئے۔ دور و نزدیک کے سبھی رشتہ داروں کو بھی اطلاعات پہنچا دی گئیں۔ شام ہونے تک بہت سے لوگ جنازے میں شرکت کے لئے ہمارے ہاں پہنچ گئے۔

عشاء کی نماز کے بعد اماں کا جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ اٹھتے ہی عورتوں کی چیخ و پکار پھر

سے شروع ہو گئی۔ جنازے کو لے کر گھر سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر ابا اور ہم سب بھائیوں نے مل کر ماں کے جنازے کو کندھا دیا اور قبرستان کی طرف چل پڑے۔ گاؤں کے کچھ نوجوان ہاتھوں میں لالٹین اور کچھ گیس لیمپ لئے جنازے کے ساتھ موجود تھے تا کہ جنازے میں شرکت کرنے والوں کو راستے میں کسی قسم کی دُشواری نہ ہو۔ ہر کوئی ہمیں تسلی دے رہا تھا اور صبر کی تلقین کر رہا تھا لیکن جس کی ماں ہی مر جائے اسے صبر کہاں۔

دس روز تک دریاں بچھی رہیں۔ افسوس کے لئے آنے والوں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ پھر دریاں اٹھا دی گئیں۔ ان دس دنوں میں ابا اور بھائیوں میں سے کوئی بھی کھیتوں پر نہیں گیا تھا۔ ہمارے چچا زاد اور تایا زاد بھائیوں کو بھی کھیتی باڑی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ بھی ہمارے دُکھ میں ہمارے ساتھ برابر کے شریک تھے اس لئے سارا سارا دن ہمارے پاس بیٹھے رہتے۔ کھیتی باڑی اور گائے بھینسوں کے تمام تر معاملات گاؤں والوں نے خود ہی سنبھال رکھے تھے کیونکہ گاؤں میں سب کے دُکھ سُکھ سانجھے سمجھے جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ زندگی کے معاملات معمول کے مطابق چلنے لگے۔ لیکن ماں کی کمی ہر پل محسوس ہوتی۔ پہلے پہل کبھی چاچی، کبھی تائی اور کبھی ان کی بیٹیاں آ کر گھر کے کام کاج کر جاتیں مگر اس طرح کب تک چلتا۔ اس لئے ابا نے نائن اور مراثن کو گھر کے کام کاج سونپ دیئے۔ نائن کھانا وغیرہ تیار کر جاتی اور مراثن گھر کی صفائی ستھرائی کر جاتی۔

میں سارا سارا دن گھر سے باہر نہ نکلتا۔ گو کہ گھر مجھے کھانے کو دوڑتا۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی دکھائی دیتی لیکن میرا کہیں جانے کو دل نہ کرتا۔ ابا جو کبھی مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیتا تھا اب مجھے خود کہتا کہ میں کہیں باہر گھوم پھر آؤں۔ میں ابا کے کہنے پر گھر سے نکل بھی پڑتا لیکن پھر فوراً ہی گھر میں آ گھستا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ابا گھر میں داخل ہوا تو میں چارپائی پر لیٹا تھا۔ ابا سیدھا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”اس طرح سے بھی زندگی گزرتی ہے بھلا...... مرنے والوں کے ساتھ تو مرا نہیں جاتا ناں......“

”بس ابا! کسی چیز میں دل ہی نہیں لگتا...... جی چاہتا ہے ہر وقت خاموش بیٹھا ماں کو یاد کرتا رہوں......“

”میں سمجھتا ہوں جیلو...... مگر موت کو کون ٹال سکا ہے۔ یہ تو برحق ہے۔ آ کر رہتی

ہے...... کسی کو پہلے کسی کو بعد میں یہاں سے چلے جانا ہے...... اور ہاں، میں تو تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ باہر ریچھ کا تماشہ ہو رہا ہے...... تم بھی دیکھ لو......“

”ابا کیا کروں...... مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”جا کر دیکھو تو سہی...... دل بہل جائے گا......“

ابا نے زبردستی مجھے ریچھ کا تماشہ دیکھنے بھیج دیا۔ ریچھ والا ڈگڈگی بجا کر ریچھ کو نچا رہا تھا اور کافی لوگ اس کے اردگرد جمع تھے۔ کبھی وقت تھا کہ اس طرح کے کھیل تماشے مجھے اچھے لگا کرتے تھے لیکن اب میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہاں ایک منٹ بھی نہ رکوں۔ اس لئے بمشکل ہی میں چند منٹ وہاں کھڑا رہ سکا پھر گھر آ کر لیٹ گیا۔

کچھ روز بعد ہمارے گاؤں کی آبادی سے باہر ایک سائیکل والا اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آ گیا۔ وہاں ڈھول بجتا رہتا اور پاکستانی و ہندوستانی فلمی گانے سنائی دیتے رہتے۔ سائیکل والا دن رات سائیکل پر سوار دائرے میں چکر کاٹتا رہتا۔ اس نے سات دن اور راتیں سائیکل پر ہی گزارنا تھیں۔ کسی بھی صورت میں زمین پر پاؤں نہیں لگانا تھے۔ میں بھی ہر روز وہاں جا کھڑا ہوتا اور سارا سارا دن وہیں رہتا۔ وہ سائیکل والا نوجوان سائیکل پر ہی کھانا کھاتا۔ سائیکل پر ہی نہاتا اور کپڑے تبدیل کرتا۔ وہ انتھک نوجوان جب دیکھو سائیکل چلاتا ہوا دکھائی دیتا اور ساتھ ساتھ سائیکل کے مختلف کرتب بھی دکھاتا۔

کبھی کوئی اس کے سامنے روپے دو روپے یا پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتا تو وہ نوٹ رکھنے والے کی خواہش کے مطابق کبھی تو چلتا چلتا ہی تھوڑا سا جھک کر ہاتھ سے اٹھا لیتا، کبھی دانتوں اور کبھی اپنی آنکھوں سے نوٹ اٹھا کر داد وصول کرتا ہوا سائیکل چلانے لگتا۔

میری دلچسپی کے لئے وہاں کافی کچھ تھا اس لئے میرا وقت با آسانی کٹ جاتا اور دل بھی لگا رہتا۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اب ابا کی طرف سے بھی مجھے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ایک ہفتے کے بعد جس روز اس سائیکل سوار نوجوان کو سائیکل سے اتارا جانا تھا، یوں تو وہاں دعوتِ عام تھی مگر گاؤں کے کئی معززین کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

ڈھول بج رہا تھا۔ خوب گہما گہمی تھی۔ نوجوان سائیکل سوار کا جوش بڑھتا جا رہا تھا جبکہ میری افسردگی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اب یہ کھیل بھی ختم ہو جانا تھا۔ وقت مقررہ پر گاؤں

کے چوہدری نے آگے بڑھ کر سائیکل سوار نوجوان کو سائیکل سے اتارا اور خوش ہو کر اسے نقدی کی شکل میں انعام دیا۔ پھر چوہدری کی تقلید میں اور لوگوں نے بھی اپنی اپنی ہمت کے مطابق سائیکل سوار کو انعام دیا۔

آہستہ آہستہ لوگ وہاں سے جانے لگے اور ان لوگوں نے بھی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ان لوگوں کا یہی ذریعہ معاش تھا، وہ کہیں نہ کہیں جا کر پڑاؤ لگا لیتے اور پھر اس طرح سلسلہ جاری رہتا۔ سب لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں تنہا کھڑا رہ گیا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ آخر کب تک یوں بے کار کھڑا رہتا اس لئے گھر کو چل دیا۔

♦ ...... ♦
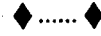
اماں زندہ تھی تو ہمیشہ ابا اور چاروں بھائی صبح کے گئے شام کو ہی گھر لوٹتے تھے۔ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ ابا یا بھائیوں میں سے کوئی دن کے وقت گھر میں دکھائی دیا ہو۔ اگر ان میں سے کسی کو کبھی کسی غرض سے دن کے وقت گھر آنا بھی پڑا تو وہ تھوڑی ہی دیر میں گھر سے نکل جاتے تھے۔ لیکن اب اس کے برعکس ابا گھر سے نکلنے کا نام ہی نہ لیتا جبکہ شیدا اور جیرا بھی دن میں گھر کے ایک دو چکر لگا جاتے۔ پہلے پہل تو میں یہی سمجھتا رہا کہ اماں کے فوت ہونے کی وجہ سے ابا کا کہیں کسی کام میں دل نہیں لگتا اس لئے وہ زیادہ وقت گھر میں ہی گزارتا ہے۔ اسی طرح بھائیوں کا بھی جب جی اداس ہوتا ہے تو گھر کا چکر کاٹ جاتے ہیں لیکن معاملہ میری سوچ سے الٹ نکلا۔

کبھی وہ وقت تھا جب ابا مجھے گھر سے باہر قدم نکالنے نہیں دیتا تھا۔ میرے لئے ہر طرح کی تفریح پر پابندی عائد تھی اور خلاف ورزی کرنے پر باقاعدہ سزا ملتی تھی۔ لیکن اب ابا کی کوشش ہوتی کہ وہ مجھے کسی نہ کسی بہانے گھر سے باہر بھجوا دے۔ میرا کھیل کود میں دل نہ بھی لگتا تو ابا کی ضد ہوتی کہ میں دوستوں کے ساتھ وقت گزاروں۔ ایسا ہی رویہ بھائیوں کا ہو گیا تھا۔ شیدے یا جیرے میں سے جب بھی کوئی دن کے وقت گھر میں آتا اگر اس وقت ابا گھر میں موجود ہوتا تو وہ جلد ہی گھر سے نکل جاتے لیکن ابا کو گھر میں نہ پا کر وہ بھی گھر سے جانے کا نام نہ لیتے۔

میں کوئی بچہ نہیں تھا جو مجھے کسی بات کی خبر نہ تھی۔ جو کچھ گھر میں ہو رہا تھا میں سب سمجھتا تھا لیکن اس کے باوجود میرا ذہن کسی بھی طرح اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار

نہ تھا۔ اماں کے وفات پا جانے سے گھر میں نائن اور مراثن کی آمد نے گھر کا ماحول ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ ابا اور بھائیوں کی خون پسینے کی کمائی نائن اور مراثن کی نظر ہونے لگی۔ کبھی ابا، کبھی شیدا اور کبھی جیرا ان میں سے کسی ایک کو لئے کمرے میں جا گھستا اور پھر اس کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال کر رخصت کرتا۔ ابا نے ساری زندگی ماں سے کبھی ہنس کر بات نہ کی تھی اور اسے ہمیشہ جوتے کی نوک پر رکھا تھا لیکن اب وہی شخص عام سی شکل و صورت کی مالک گھر میں کام کرنے والی ادھیڑ عمر نوکرانیوں کے آگے پیچھے خوشامد کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

دونوں نوکرانیاں ہمارے گھر کو گھن کی طرح چاٹ رہی تھیں۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی آخر کب تک خاموش رہتا۔ پھر برداشت کی سبھی حدود ختم ہو گئیں۔ میں ابا اور بھائیوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ ان سے اس طرح کی بات کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ نائن اور مراثن میں سے جس کسی سے بھی مجھے بات کرنے کا موقع مل گیا میں بات کروں گا۔

میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ آخر وہ موقع مجھے مل گیا۔ اس روز ابا نے مراثن کو اس کی سپردگی کے عوض خوش ہو کر گندم کے دو تھال بھر کر دیئے اور خود باہر نکل گیا۔ مراثن نے جلدی سے گھر کا کام نپٹایا اور ابا کی دی ہوئی گندم کی گٹھری باندھ کر چل پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"یہ کیا ہے......؟" میں نے اچانک سوال کیا تو وہ گھبرا گئی۔ لیکن فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا اور بولی۔

"دیکھ لو، گندم ہے...... اور تو کچھ نہیں۔"

"کہاں لے جا رہی ہو......؟"

"اپنے گھر لے جا رہی ہوں...... اور کہاں......؟"

"کیوں......؟"

"تمہارے ابا نے خود اپنے ہاتھوں سے دی ہے...... کوئی شک ہے تو اپنے ابا سے پوچھ لینا۔"

"لیکن...... ابا نے...... تمہیں یہ گندم کیوں دی ہے......؟"

"ہائے...... جیلو! کیا ہو گیا ہے تمہیں...... میں ادھر مزدوری کرتی ہوں...... تمہارے نے تھوڑی سی گندم دے دی تو کون سی قیامت آ گئی۔"

"سب سمجھتا ہوں...... تم اور وہ تمہاری کچھ لگتی نائن...... مل کر دونوں ہاتھوں سے ہمارے گھر کو لوٹ رہی ہو...... لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"لگتا ہے، بہت غصے میں ہو تم۔"

"ایسا ہی سمجھ لو...... آج کے بعد پھر کبھی تم اس گھر میں نظر آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا...... اور اس دوسری ڈائن کو بھی بتا دینا کہ اب ادھر کا رخ نہ کرے۔ ورنہ وہ اپنی ٹانگوں پر چل کر گھر واپس نہ جا سکے گی۔"

"جیلو! میں تو تمہیں بچہ ہی سمجھتی رہی......"

"اس میں بچے اور بڑے والی کون سی بات ہے...... مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔"

"اچھا...... چلو چھوڑو...... آؤ کچھ دیر کمرے میں بیٹھتے ہیں...... شاید تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔" مراثن نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ مجھے سنبھلنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، وہ بول پڑی۔ "کیا سوچتے ہو...... چلو تو سہی...... پھر جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہو گا......" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن اب میں سنبھل چکا تھا اس لئے اس کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔

"تمہاری انہی حرکتوں کی وجہ سے تو تمہارا اس گھر میں داخلہ بند کر رہا ہوں...... اس سے پہلے کہ یہ بات پورے گاؤں میں پھیلے، بہتر ہے تم یہاں سے نکل جاؤ۔"

"ایک تو تم لوگوں کی خدمت کرو...... اور اوپر سے باتیں بھی سنو...... میں جا رہی ہوں...... اب تم لوگ بلاؤ گے بھی تو نہیں آؤں گی۔" مراثن نے آخری داؤ کے طور پر آنکھوں میں آنسو لا کر بات کی۔ مگر مجھ پر اثر کہاں ہونے والا تھا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا اور وہ چلی گئی۔

ابا گھر واپس آیا تو گھر میں اکیلا میں ہی تھا۔ ابا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا لیکن گھر میں اپنی مطلوبہ چیزیں نہ پا کر اس سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا اور بول پڑا۔ "پتہ نہیں...... یہ دونوں ہی آج کہاں مر

گئی ہیں؟"

"ابا...... تم کن کی بات کر رہے ہو......؟" میں نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔

"ارے وہی یار...... جو کام کرنے آتی ہیں...... سخت بھوک لگی ہے اور وہ دونوں ہی غائب ہیں۔"

"اچھا...... تم نائن اور مراثن کی بات کر رہے ہو......؟"

"ہاں...... ہاں...... انہی کے بارے میں تو پوچھ رہا ہوں۔"

"لیکن ابا...... اب وہ نہیں آئیں گی۔"

"کیوں......؟" ابا نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"میں نے انہیں منع کر دیا ہے۔"

"تم نے انہیں منع کر دیا ہے......؟"

"ہاں ابا! میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ اب اس گھر میں نہ آئیں...... کوئی کام تو کرتی نہیں تھیں۔"

"لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے...... وہ نہیں ہوں گی تو گھر کے کام کاج تمہارا باپ کرے گا؟"

"جو بھی کہہ لو ابا! میں انہیں اس گھر میں نہیں آنے دوں گا۔ میں گھر کے سارے کام خود اپنے ہاتھوں سے کر لوں گا...... اور تینوں وقت کی روٹی چاچی سے پکوا کر لا دیا کروں گا۔"

ابا کو بھلا یہ بات کیسے پسند آتی۔ وہ میری بات سنتے ہی چیخ پڑا۔ "تم ہوتے کون ہو گھر کے معاملات میں دخل دینے والے...... وہ تو خیر واپس آ ہی جائیں گی...... مگر اب تم اس گھر میں نہیں رہو گے......" یہ کہتے ہی ابا نے جوتا اتار کر مجھ پر برسانا شروع کر دیا۔ ابا کے جوتے میرے جسم پر برس رہے تھے اور میں تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ابا سے معافی کی اپیلیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ لیکن ابا کہاں ماننے والا تھا۔

"آج میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا...... حرام خور...... سور کا بچہ...... سارا سارا دن چارپائیاں توڑتا رہتا ہے...... تمہاری ماں نے تمہیں سر پر چڑھا رکھا تھا...... ورنہ میں نے

تمہیں کب کا سیدھا کر دیا ہوتا۔"

ابا نے جوتوں سے میری خوب پٹائی کی اور دھکے دے کر مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ اماں کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ابا نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اماں زندہ تھی تو ابا کے ہر وار کے آگے خود آکھڑی ہوتی تھی۔ گو کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا تھا کہ میری جگہ اماں کی اپنی پٹائی ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی اماں مجھے کسی نہ کسی طرح ابا کے عذاب سے بچالیا کرتی تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں دیوار سے لگ کر خوب رویا۔ مجھے اماں بہت یاد آ رہی تھی۔ میں وہیں دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ میرے چاروں بھائی میرے سامنے گھر میں داخل ہوئے۔ میں اس انتظار میں رہا کہ شاید ابھی ابا آئے اور مجھے منا کر گھر لے جائے یا اگر وہ غصے کی وجہ سے خود نہ بھی آیا تو بھائیوں میں سے کسی کو مجھے لینے بھیج دے۔ اسی انتظار میں رات بیت گئی۔ لیکن مجھے لینے کوئی نہ آیا اور میں نے ساری رات دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے ہو کر گزار دی۔

صبح ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر آ جا رہے تھے۔ اس لئے میرا وہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں ٹہلتا ہوا گاؤں سے باہر نکل گیا۔ پھر دیر تک یونہی بلا مقصد اِدھر اُدھر کھڑا رہا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ دھوپ بھی چمک رہی تھی۔ بھوک کی وجہ سے میرا برا حال ہو رہا تھا اس لئے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچا تو ابا اور بھائی کھیتوں میں جا چکے تھے جبکہ دونوں نوکرانیاں گھر میں موجود تھیں۔

میں نے صحن میں لگے ہینڈ پمپ کے پانی سے اپنا منہ ہاتھ دھویا اور چپ چاپ چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نظریں جھکائے خود کو اس قدر بے بس و مجبور سمجھ رہا تھا کہ آنکھ اٹھانے کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ہی اپنی کامیابی اور میری ناکامی پر خوش ہو رہی تھیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے آگے کھانا لا کر رکھ دیا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو نائن میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ میرے پاس کھانا رکھ کر چلی گئی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی کھانا کھانے لگا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ کھانا کھا کر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

میں کافی دیر تک سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو وہ دونوں جا چکی تھیں۔ میں کچھ دیر یونہی

لیٹا اِدھر اُدھر کی باتیں سوچتا رہا۔ پھر دل چاہا کہ یوں بیکار پڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ کوئی کام کیا جائے۔ بہت دن گزر چکے تھے، میں نے کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا جبکہ رزلٹ بھی آنے والا تھا اور جو پرچے چھوٹ گئے تھے ان کی تیاری بھی کرنا تھی۔ میں نے کتابوں کا بستہ اٹھایا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کافی عرصے کے بعد کتابوں کو پڑھنا شروع کیا تھا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ میری ایسی حالت ہو گئی تھی کہ کتاب کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا۔

ابا گھر میں داخل ہوا تو میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے میرا پڑھنا بھلا کہاں پسند تھا۔ اس نے آتے ہی میرے ہاتھوں سے کتاب چھین کر دور پھینک دی اور چیخا۔ "دیکھ جیلو! بہت ہو گئی...... اب اس گھر میں رہنا ہے تو وہی کرنا ہو گا جو میں چاہوں گا...... ورنہ تمہارے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔"

"لیکن ابا...... میں پڑھنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں پڑھنے کی...... جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔"

"مگر ابا......"

"میں نے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا...... بہت توڑ لیں مفت کی روٹیاں...... بس کل سے بھائیوں کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرو......"

"مجھے نہیں آتی کھیتی باڑی......"

"کیا کہا...... کیا کہا...... ذرا پھر سے کہنا......" یہ کہتے ہی ابا نے جوتی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ میں بھلا اب کیا بولتا۔ گردن جھکائے کھڑا رہا۔ "بول...... بولتا کیوں نہیں...... اب سانپ سونگھ گیا ہے کیا؟...... ابھی تو بڑے پٹاخ پٹاخ بول رہے تھے...... تم بھی کیا کرو...... جیسا ماں سکھا کر گئی ہے، ویسا ہی تو کرو گے۔"

"اماں کو بیچ میں مت لاؤ ابا......"

ابا کو اس طرح کی گستاخی بھلا کہاں پسند تھی کہ کوئی اس کے سامنے زبان کھولے۔ اس لئے ابا کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی جوتی میرے جسم پر برسنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد ابا نے جوتی پاؤں میں پہن لی مگر اس کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اس لئے چھڑی سے میری پٹائی کرنے لگا اور پھر اسی طرح پٹائی کرتے کرتے مجھے گھر سے باہر نکال دیا اور اندر سے

کنڈی لگا دی۔

اس سے پہلے ابا جب بھی مجھے کسی بات پر سزا دیتا تو اپنی تسلی کرنے کے بعد مجھے ہوا چھوڑ کر خود باہر نکل جاتا تھا اور پھر غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد ہی گھر میں داخل ہوتا۔ لیکن اب دو دن میں دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ ابا نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ میں پچھلی رات کی طرح دیوار سے لگ کر روتا رہا۔ پھر روتے روتے اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ دوں۔ کیونکہ اپنی آنکھوں کے سامنے گھر کی بربادی کا تماشہ ہوتے دیکھنا میرے بس میں نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جیرا اور شیدا آئے تو نے ان کے لئے کنڈی کھول دی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ بعد میں کاکا اور ماڑو بھی آ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہو گیا۔ ابا چارپائی پر لیٹا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

کھانا کھا کر سب لیٹ گئے۔ میں بھی اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ ابا اور بھائی دن بھر کے تھکے ہارے تھے، وہ لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے اور میں اپنے پروگرام کو ترتیب دینے لگا۔ جب مجھے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ وہ سب گہری نیند سو چکے ہیں تو میں چپکے سے اپنی چارپائی سے اٹھا اور ٹرنک میں سے اپنے دو جوڑے شلوار قمیض نکال کر گٹھری میں باندھ لئے۔ مجھے علم تھا کہ ابا پیسے کہاں رکھتا ہے۔ میں نے وہاں سے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ روپے نکال کر جیب میں ڈال لئے اور کپڑوں کی گٹھری اٹھا کر احتیاط سے دروازے کی کنڈی کھولی اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور چاند اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔ میں ڈرتا ڈرتا گاؤں سے باہر پکی سڑک پر نکل آیا۔ سڑک ویران پڑی تھی۔ میں سڑک کے کنارے آ کر رک گیا۔ کیونکہ مجھے علم تھا کہ رات کے دو بجے ایک بس یہاں سے گزرتی ہے جو مختلف دیہاتوں سے ہوتی ہوئی سواریاں لے کر لاہور جاتی ہے اور جن لوگوں کو اپنے کسی مقدمے کے سلسلے میں لاہور کی عدالتوں میں جانا ہوتا تھا وہ اسی بس میں سوار ہو کر لاہور پہنچتے تھے تاکہ وقت پر عدالت میں حاضر ہو سکیں۔

ہمارے گاؤں سے بھی اکثر لوگ اسی بس کے ذریعے لاہور جایا کرتے تھے اس لئے

مجھے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ ادھر وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں انتہائی خوف زدہ تھا کہ کہیں کوئی کسی جانب سے نہ آ نکلے اس لئے کبھی اپنے دائیں، کبھی بائیں اور کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا۔ طویل انتظار کے بعد دور سے روشنی حرکت کرتی ہوئی میری طرف بڑھتی دکھائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی بس تھی جس میں مجھے سوار ہونا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد بس میرے پاس آ کر رک گئی۔ بس کے رکتے ہی میں فوراً بس میں سوار ہو گیا۔ بس ڈرائیور نے ایک دو بار وقفے وقفے سے ہارن بجائے تاکہ اگر کوئی بس میں سوار ہونا چاہتا ہو تو پہنچ جائے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بس کی سیٹ پر بیٹھے میری نظریں بس کے گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ بس نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس روز ہمارے گاؤں سے کوئی بھی سوار نہ ہوا۔

بس کے چلتے ہی میں نے ایک نظر بس میں سوار دوسرے لوگوں پر ڈالی جن میں سے زیادہ تر لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر سو رہے تھے۔ بس کا کنڈیکٹر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس سے لاہور کا ٹکٹ لیا تو وہ واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ مگر باہر اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے اچھی طرح سے اس بات کی تسلی کر لی تھی کہ بس میں میری جان پہچان والا کوئی شخص نہیں تھا اس لئے ذہنی طور پر مطمئن تھا۔ بس آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور میں اپنے گاؤں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بس چھوٹی سڑک سے نکل کر بڑی سڑک پر چڑھی تو بسوں کا اڈہ آ گیا۔ اس وقت اڈے کی تمام دکانیں بند تھیں۔ ایک دو دکانوں کے باہر کے بلب جل رہے تھے جن کی وجہ سے وہاں کچھ روشنی تھی ورنہ وہاں اندھیرا ہی چھایا ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی نہ جانے کیوں گزرے ہوئے دنوں کے واقعات میرے ذہن میں آ گئے۔ کیونکہ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے میری زندگی کی راہیں بدل کر رہ گئی تھیں اور وقت نے اس طرح کے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ مجھے گھر سے بے گھر ہونا پڑ رہا تھا۔

میرے دل میں کیسے کیسے ارمان تھے کہ میں پڑھ لکھ کر کچھ نہ کچھ بن کر دکھاؤں گا اور میں اس میں کامیاب بھی ہو جاتا کیونکہ میں نے تعلیم کے ابتدائی سالوں میں کبھی بھی

ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ یقینی بات تھی کہ میں میٹرک میں بھی ضرور کامیابی حاصل کرتا۔ لیکن وزیراعظم کے جلسہ کی وجہ سے گاڑیوں کے نہ چلنے کے باعث میں آخری دو پیپر نہ دے سکا۔ میری وجہ سے ہی اماں، ابا کے عذاب کا نشانہ بنی اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ہمارا گھر تباہ ہو گیا۔ ہم سب بکھر کر رہ گئے۔ اور اب میں بھی گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔

بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ بس کے تمام مسافر سو رہے تھے۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں لاہور پہنچنے تک سویا رہا۔ لاہور پہنچ کر کنڈیکٹر نے مجھے جگا دیا۔ میری آنکھ کھلی تو بس کے زیادہ تر مسافر اتر رہے تھے۔ میں نے بھی اپنی گٹھری سنبھالی اور بس سے اتر گیا۔ مسافروں کو وہاں اتار کر بس آگے بڑھ گئی۔ بس سے اترتے ہی تمام مسافر رکشوں، ویگنوں اور گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے اور میں وہاں کھڑا ان سب کا منہ دیکھتا رہا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ سورج نکل آیا تھا۔ سڑکوں پر خوب رش تھا۔ سائیکل، موٹر سائیکل، تانگے، ویگنیں اور چھوٹی بڑی گاڑیاں سڑک پر دوڑتی پھر رہی تھیں۔

میں گاؤں سے تو نکل آیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرف کا رخ کروں۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا۔ مجھے وہاں کھڑے مینارِ پاکستان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مینارِ پاکستان کے سامنے کھلے میدان میں بہت سے لوگ گھاس پر بیٹھے گپیں لگا رہے تھے۔ میں بھی بغیر کچھ سوچے گھاس پر جا بیٹھا۔ میرا ذہن مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ میں اگلا قدم کیا اٹھاؤں۔ لاہور میں نہ تو میں کسی کو جانتا تھا اور نہ ہی مجھے کسی جگہ کا علم تھا۔ کئی سال قبل ہمارے گاؤں سے بہت سے لوگ ایک بس میں بیٹھ کر داتا دربار سلامی کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ داتا دربار کا خیال آتے ہی میں نے وہیں جانے کا پروگرام بنا لیا۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے دربار پر پہنچ کر میں نے اپنے جوتے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لئے اور دربار کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہو گیا۔ کچھ لوگ مزار کے پاس کھڑے فاتحہ خوانی کر رہے تھے اور کچھ لوگ مزار کے ایک طرف بیٹھے تلاوتِ کلام پاک کر رہے تھے۔ میں نے جوتے اور گٹھری ایک طرف رکھ کر اچھی طرح سے منہ دھویا

اور وضو کیا۔ مزار پر حاضری دی، فاتحہ خوانی کی اور دعا مانگی۔ دعا مانگتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ مجھے ابا کا وہ رویہ اور سلوک یاد آنے لگا جس کی وجہ سے مجھے گھر سے نکلنا پڑا۔

میں دعا سے فارغ ہو کر مزار کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ابھی باہر نکل کر کہیں سے پیٹ کی آگ بجھاتا ہوں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے ایک روٹی جس پر حلوہ لگا ہوا تھا میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے روٹی کھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ میں دیر تک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ کوئی میرے ہاتھ پر کھانے رکھ جاتا، کوئی بھنے ہوئے چنے۔ میں ان میں سے کچھ کھا لیتا اور کچھ اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ شام کو بھی وہیں بیٹھے بٹھائے روٹی کھانے کو مل گئی۔ میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پی لیا۔

دن میں کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں آیا تھا جب مزار پر حاضری دینے والوں میں کمی آئی ہو۔ دن بھر مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے آنے والوں کا رش رہا۔ دن تو جیسے تیسے گزر گیا تھا، رات ہوئی تو مجھے سونے کی فکر لگ گئی کہ رات کیسے کٹے گی۔ ابھی میں اسی فکر میں تھا کہ کچھ لوگوں کو دربار کے احاطے میں لیٹتے ہوئے دیکھا۔ میں نے بھی ہمت کی۔ اپنے جوتے گٹھری میں رکھ کر گٹھری سر کے نیچے دے لی اور ایک کونے میں جا کر لیٹ گیا۔

◆ ...... ◆
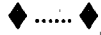
میرے شب و روز داتا صاحب کے دربار پر گزرنے لگے۔ یہاں رہتے ہوئے مجھے کھانے پینے کی کوئی فکر نہ تھی۔ تینوں وقت کھانے کو مل جاتا۔ دن بھر فاتحہ خوانی کرتا، قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور دعائیں مانگتا۔ رات ہوتی تو وہیں کسی کونے میں چادر تان کر سو جاتا۔ وہاں رہتے ہوئے کچھ لوگوں سے میری واقفیت بھی ہو گئی تھی۔ ان میں سے چند تو میری ہی طرح اپنے اپنے گھروں سے بھاگے ہوئے تھے اور کچھ وہ تھے جو گھر سے کمائی کی غرض سے نکلے تھے۔ وہ دن میں محنت مزدوری کرتے اور رات کو دربار سے کھانا کھا کر وہیں سو جاتے اور اگلے روز اٹھ کر پھر محنت مزدوری کے لئے نکل پڑتے۔

گاؤں میں تھا تو گاؤں کا نائی خود گھر آ کر شیو کر جاتا تھا جسے بدلے میں ہم سال میں

ایک بار گندم دے دیا کرتے تھے۔ میں نے کئی دن سے شیو نہیں کروائی تھی اس لئے داڑھی کافی بڑھ گئی تھی۔ میں دربار سے نکل کر قریب ہی نائی کی دُکان دیکھ کر اس میں گھس گیا۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے شیو کروا رہے تھے اور کچھ نہا کر نکل رہے تھے۔ میں نے بھی پہلے شیو کروائی اور پھر وہیں نہایا۔ جس کے لئے مجھے پندرہ روپے ادا کرنا پڑے جو میرے لئے بہت زیادہ تھے۔ کیونکہ جب میں گاؤں سے نکلا تھا، میری جیب میں کچھ زیادہ رقم نہ تھی۔ میرے پاس گنتی کے کچھ روپے تھے جنہیں بوقت ضرورت سنبھل سنبھل کر ہی خرچ کرتا تھا۔

اس رات کھانا اس قدر مزے کا تھا کہ میں ہاتھ نہ روک سکا اور خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ کھانا کھاتے ہی مجھے نیند آ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔ صبح اٹھا تو مجھے اپنی جیب کچھ ہلکی محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا تو جیب خالی تھی اور کوئی سوتے میں میری جیب سے تمام رقم نکال کر لے گیا تھا۔ میری تمام تر پونجی وہی تھی جو لٹ چکی تھی۔ مجھے بہت دُکھ ہوا مگر میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کیا۔

گو کہ مجھے کھانا دربار سے ہی مل جاتا تھا اور وہیں پڑا بھی رہتا لیکن دیگر ضروریاتِ زندگی کے لئے تو کچھ نہ کچھ پیسے درکار تھے مگر میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں یا بھیک مانگوں۔ میرا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا اور ہم آج تک غریبوں کو دیتے ہی آئے تھے۔ اس لئے میرے ہاتھ کسی کے سامنے کیسے اٹھ سکتے تھے۔ تاہم ایک دو بار ایسا ضرور ہوا کہ میں دربار کی دیوار سے ٹیک لگائے نظریں جھکائے بیٹھا تھا کہ کوئی پانچ یا دس کا نوٹ میری جھولی میں ڈال گیا جو میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اس بات کی تسلی کرنے کے بعد کہ مجھے کوئی دیکھ تو نہیں رہا، جیب میں ڈال لئے۔

جمعہ کی نماز سے فارغ ہوئے تو وہ لوگ جو دور دراز سے فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوئے تھے، واپس چل پڑے۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے نمازیوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ میں بھی مسجد سے نکل کر دربار کے احاطے میں آ گیا۔ وہاں ایک شخص جس کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال ہو گی، مستحقین میں سو سو کے نوٹ بانٹ رہا تھا۔ میں قریب کھڑا دیکھتا رہا۔

ایک دو بار دل میں خیال آیا کہ میں بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دوں لیکن میرے ضمیر نے مجھے لعنت ملامت کر کے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں سو سو کے نئے نوٹوں کی پوری گڈی تھی جسے بانٹنے میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگے۔ وہ نوٹ بانٹ رہا تھا تو لوگ اس پر چڑھے جا رہے تھے مگر نوٹ ختم ہوتے ہی سب لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے اور وہ شخص تنہا کھڑا رہ گیا۔

اس شخص کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تمام رقم خیرات ہو چکی تھی اور لوگ بھی وہاں سے جا چکے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں میں وہیں کھڑا اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید وہ اپنے کسی ساتھی کو اشارہ کر کے بلا رہا ہے۔ جب میں وہیں کھڑا رہا تو اس نے پھر سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے اپنے پاس بلایا اور ساتھ ہی اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”برخوردار! اِدھر آؤ۔ میں تمہیں ہی بلا رہا ہوں......“

”جی...... مجھے......؟“ میں نے حیران ہو کر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہاں...... ہاں...... بھئی میں تمہیں ہی بلا رہا ہوں۔“

میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی میں فوراً اس کے قریب ہو گیا۔

”کیا بات ہے برخوردار...... کوئی پریشانی ہے؟...... میں کافی دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں...... لوگ آئے اور اپنے اپنے حصے کی خیرات لے کر چلتے بنے مگر تم اسی طرح کھڑے دیکھے جا رہے ہو......؟“

مجھے علم نہ تھا کہ وہ اچانک کسی قسم کا سوال کر دے گا۔ اس لئے گھبرا گیا اور اس کی کسی بات کا جواب دیئے بغیر نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”برخوردار! کسی قسم کی کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ......“ میں اس کی بات سن کر بھی خاموش رہا تو وہ پھر بول پڑا۔ ”دیکھو...... یوں نظریں جھکائے کھڑے رہنے سے تو کسی بات کا پتہ نہیں چلے گا...... اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کھل کر بتاؤ...... شاید میں تمہارے کسی کام آ

سکوں۔"

اجنبی شہر میں کسی کو ہمدرد پا کر میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور میرے سر پر بوسہ دیا۔ پھر میری کمر پر تھپکیاں دے کر چپ کرانے لگا۔ میں اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اچھا چلو چھوڑو...... آؤ تم میرے ساتھ چلو...... مجھے گھر چل کر تسلی سے اپنی بات سنانا۔" یہ کہہ کر وہ چل پڑا اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اس کی باتوں میں اس قدر خلوص اور پیار جھلک رہا تھا کہ مجھ سے انکار نہ ہو سکا اور اپنے کپڑوں کی گٹھری ہاتھ میں لئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اس نے مجھے گاڑی کی اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ ہی بٹھالیا۔ گاڑی شہر کے مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی ایسے علاقے میں پہنچ گئی جہاں بڑے بڑے اور عالیشان گھر بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گھر کے سامنے گاڑی روک دی اور گاڑی کا ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز سنتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

وہ شخص مجھے لئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جس کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا جس پر چلتے ہوئے پاؤں اندر دھنس رہے تھے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہ ڈرائنگ روم تھا جسے خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ وہاں کئی طرح کے صوفے پڑے تھے اور کھڑکیوں پر لمبے پردے لٹک رہے تھے۔ اس نے مجھے وہاں بٹھایا اور بولا۔

"لو بھئی برخوردار...... ساتھ ہی باتھ روم ہے...... تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ...... میں بھی کچھ دیر میں فارغ ہو کر یہیں آ جاؤں گا۔ پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے...... ٹھیک ہے؟"

"جی...... ٹھیک ہے۔"

اُس شخص کے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں کمرے میں پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر واپس کمرے میں آیا تو وہ شخص بھی آ گیا اور میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہی بولا۔

"ہاں بھئی برخوردار...... باقی باتیں بعد میں کریں گے پہلے اپنا نام بتاؤ۔"

"میرا نام جمیل احمد ہے......" میں نے اپنا اصل نام بتایا۔ کیونکہ ماں باپ نے پیدا ہونے پر میرا یہی نام رکھا تھا جو بگڑ کر جیلو بن گیا تھا۔ مگر اب میں جیلو کو وہیں گاؤں میں دفن کر آیا تھا۔

"جمیل احمد...... بہت خوبصورت اور پیارا نام ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔"

"تم نے میرا نام تو پوچھ لیا...... اب اپنا نام بھی بتاؤ ناں......"

"بری بات جمیل احمد...... اپنے سے بڑوں کو تم نہیں آپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔"

"اوہ...... معاف کیجئے گا...... ہم دیہات میں رہنے والے لوگ ادب و آداب کو کیا جانیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں...... تم میرا نام پوچھ رہے تھے۔ بھئی ویسے تو میرا نام شیخ عشرت علی ہے لیکن لوگ شیخ جی کہہ کر پکارتے ہیں...... تم چاہو تو تم بھی شیخ جی کہہ سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے شیخ جی۔"

"اچھا اب مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ تاکہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔"

شیخ جی کے پوچھنے پر میں نے اپنی تمام تر روداد بیان کر ڈالی۔ وہ ایک ہمدرد انسان تھا۔ میری باتیں سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے لیکن اس نے انہیں بہنے سے روکے رکھا۔ باتوں کے دوران ہی نوکرانی ہمارے لئے میز پر چائے اور دیگر لوازمات رکھ گئی تھی۔ ہم دونوں باتیں بھی کرتے رہے اور ساتھ ساتھ چائے بھی پیتے رہے۔ اس دوران شیخ جی نے کچھ کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔

شیخ جی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ انکے دونوں بیٹے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ امریکہ میں مقیم تھے جبکہ ایک بیٹی بیاہ کر اپنے میاں کے ہمراہ انگلینڈ چلی گئی تھی اور دوسری بیٹی کا خاوند اسے اپنے ساتھ سعودی عرب لے گیا تھا۔ شیخ جی کی پہلی بیوی جس میں سے ان کی اولاد تھی، فوت ہو چکی تھی۔ شیخ جی کا اپنا ذاتی کاروبار تھا۔ بچے بچیاں اپنے اپنے گھروں کے ہو لئے تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد گھر میں تنہائی ہر وقت انہیں کھانے کو دوڑتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے بیٹوں اور عزیز رشتے داروں کے کہنے پر دوسری شادی کر لی تھی۔ بظاہر خوش اور مطمئن نظر آنے والے شیخ جی اندر سے کس قدر دکھی تھے، اس کا اندازہ ان کی باتیں سن کر ہوا۔

بھلا اس باپ کی بھی کیا زندگی ہوگی جو بیٹوں کا باپ ہونے کے باوجود بھی تنہا ہو۔ جو پوتے پوتیوں کے ہوتے ہوئے بھی دادا کا لفظ سننے کو ترستا ہو۔ نواسے نواسیوں کی برسوں شکل دکھائی نہ دیتی ہو۔ میں انہی خیالوں میں گم بیٹھا تھا کہ شیخ جی چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

''لو بھئی جمیل...... اب تمہیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں...... تم اسی گھر میں رہو گے۔ گھر میں اتنے کمرے خالی پڑے ہیں...... بس بیگم جان سے کہہ کر تمہارے رہنے کا انتظام کر دیتا ہوں۔''

شیخ جی ابھی بات ہی کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک پری چہرہ نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے دونوں بازوؤں میں سونے کی چوڑیاں اور کڑے نظر آ رہے تھے اور ہاتھوں کی سبھی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ اس کے آتے ہی کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔

''آؤ...... آؤ...... بیگم جان...... ابھی میں تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا۔ اس سے ملو، یہ ہے جمیل۔ جس کے بارے میں ابھی کچھ دیر پہلے میں نے تم سے بات کی تھی۔ آج سے یہ اس گھر میں ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔''

شیخ جی نے بیگم جان سے میرا تعارف کروایا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم جی۔'' میں نے گردن کو تھوڑا جھکا کر بیگم جان کو سلام کیا تو اس نے میرے سلام کا جواب گردن ہلا کر دیا اور بولی۔

''ٹھیک ہے، بیٹھو۔'' پھر شیخ جی کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''اچھا شیخ جی! میں چلتی ہوں...... آپ لوگ بیٹھیں اور باتیں کریں، تب تک میں جمیل کے لئے کمرہ صاف کروا دیتی ہوں۔''

''تھینک یو بیگم جان......'' شیخ جی نے بیگم جان کا شکریہ ادا کیا اور بیگم جان کوئی بات کئے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میری اس گھر میں کیا حیثیت ہوگی۔ آیا گھر میں ملازم بنا کر رکھا جا رہا تھا یا محض ہمدردی کی وجہ سے مجھے گھر میں رہنے کی جگہ دی جا رہی تھی۔ یہ جو کچھ بھی تھا مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ مجھے اتنے بڑے اجنبی شہر میں نہ صرف شیخ جی جیسا

ہمدرد مل گیا تھا بلکہ سر چھپانے کو جگہ بھی مل گئی تھی۔ بیگم جان کے وہاں سے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ملازمہ نے آ کر بتایا کہ بیگم جان کہہ رہی ہیں کہ کمرہ تیار کروا دیا ہے آپ جمیل کو لے کر آ جائیں۔ ملازمہ پیغام دے کر چلی گئی تو شیخ جی بولے۔

''آؤ بھئی جمیل...... تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔''

میں شیخ جی کی بات سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور شیخ جی چلے تو ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر راہداری میں آئے تو راہداری کے دونوں طرف آمنے سامنے دو کمرے تھے۔ شیخ جی نے ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر بتایا کہ وہ کمرہ مہمانوں کے لئے مخصوص ہے اور اس کے ساتھ والا کمرہ انہوں نے اپنا اسٹڈی روم بنا رکھا تھا جس میں ایک طرف انہوں نے بیڈ بھی لگایا ہوا تھا۔ اگر پڑھتے پڑھتے کبھی زیادہ دیر ہو جاتی تو وہ وہیں سو جاتے ورنہ اسٹڈی روم کے بالکل سامنے والا کمرہ ان کا بیڈ روم تھا۔ وہ سٹڈی روم سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ جاتے تھے۔ ان کے بیڈ روم کے ساتھ گیسٹ روم کے سامنے والا کمرہ میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ ان کمروں کے پیچھے ذرا ہٹ کر سرونٹ کوارٹر بنا ہوا تھا جس میں چوکیدار اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ چوکیدار کی بیوی ہی گھر کے تمام کام کرتی تھی۔

شیخ جی تمام تفصیلات بتاتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے جسے انہوں نے میرے لئے مخصوص کیا تھا۔ کمرے میں بیڈ پڑا تھا اور بیڈ کے پاس دو کرسیاں اور میز رکھا ہوا تھا۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ میں نے کپڑوں کی گٹھری ایک طرف رکھی اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''لو بھئی برخوردار! یہ ہے تمہارا کمرہ......'' شیخ جی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کھڑے کھڑے بات کی۔

''تمہارا احسان ہے شیخ جی......''

''بری بات...... تمہارا نہیں...... آپ کا کہتے ہیں۔ رہ گئی احسان کی بات تو میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ دنیا میں انسان ہی انسان کے کام آتے ہیں۔''

''پھر بھی شیخ جی......''

''بس...... بس...... آگے ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ بس اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہو اور

کوئی تکلیف ہو تو بلا تکلف مجھے یا بیگم جان کو کہہ دینا...... اب میں چلتا ہوں۔ فی الحال تم آرام کرو۔ رات کا کھانا تمہیں یہیں تمہارے کمرے میں مل جائے گا۔''

شیخ جی کمرے سے چلے گئے اور میں پھر سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں ایک طرف لکڑی کی الماری بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ کپڑوں کی الماری تھی جو خالی پڑی تھی تاہم اس میں بہت سے ہینگر لٹک رہے تھے۔ میں نے الماری کو بند کر دیا۔ ساتھ ہی ایک اور دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو وہ باتھ روم تھا۔ باتھ روم میں داخل ہوتے ہی بہت بڑا شیشہ لگا ہوا تھا۔ میں شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر بغور دیکھنے لگا۔ گاؤں سے آنے کے بعد میں کچھ کمزور ہو گیا تھا مگر میرا رنگ پہلے سے کچھ صاف ہو گیا تھا۔ وہاں ضرورت کی سبھی چیزیں پڑی تھیں۔ صابن، تولیہ، تیل، کنگھی سبھی کچھ موجود تھا۔ باتھ روم میں شاور بھی تھا اور دیوار کے ساتھ ایک طرف نہانے کے لئے ٹب بھی بنا ہوا تھا جس کے اردگرد خوبصورت ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔

میں گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایسی چیزیں پہلے کہاں دیکھی تھیں اس لئے ہر چیز کو تجسس اور حیرانگی سے دیکھتا رہا۔ باتھ روم سے نکلا تو کمرے کے ایک کونے میں مجھے ایک اور دروازہ دکھائی دیا جس کی چٹخنی بند تھی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تا کہ جان سکوں کہ ادھر کیا ہے مگر وہ دوسری طرف سے بند تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں کمروں کے درمیان والا دروازہ تھا جو ساتھ والے بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ میں نے اسی طرح چٹخنی چڑھا دی اور بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ جس روز سے گاؤں سے آیا تھا فرش پر ہی لیٹتا رہا تھا۔ چارپائی پر لیٹنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ نرم نرم بیڈ پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں اور پتہ بھی نہ چلا کہ کب نیند آ گئی۔

میں اسی طرح کافی دیر تک سویا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو میری نظر دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا، بالوں میں کنگھی کی اور کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور نوکرانی داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے پکڑی ہوئی تھی۔ وہ کھانا میز پر رکھ کر جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔

''سنو......''

وہ میری آواز سن کر رک گئی اور پوچھا۔ ''کیا ہے......؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ماں باپ نے تو میرا نام نصیبو رکھا تھا مگر سب مجھے لاڈلی کہہ کر پکارتے ہیں۔''

''اچھا لاڈلی...... گھر میں کھانا کون بناتا ہے؟''

''لو سنو...... ارے جمیل بابو! میرے ہوتے ہوئے گھر میں کھانا بھلا اور کون بنائے گا...... میرا گھر والا گھر کی چوکیداری کرتا ہے اور باقی گھر کے سبھی کام میں کرتی ہوں۔''

''اچھا یہ تو بتاؤ...... تمہیں میرا نام کس نے بتایا؟''

''شیخ جی نے بیگم جان کو بتایا اور بیگم جان نے مجھے بتا دیا...... ہم پچھلے پندرہ سال سے اس گھر میں ہیں...... بھلا اس گھر کی کوئی بات ہم سے چھپی رہ سکتی ہے؟...... بیگم جان کو تو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے اس گھر میں آئے ہوئے۔ وہ بھی بہت اچھی ہیں...... لیکن شیخ جی جیسا بندہ کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا...... خدا تعالیٰ نے انہیں اتنا کچھ دیا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں...... بہت خدا ترس انسان ہیں۔ ہر کسی سے اس قدر پیار، محبت اور شفقت سے پیش آتے ہیں کہ جو ان سے ایک بار مل لے، انہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔''

''ہاں لاڈلی...... یہ تو ہے۔''

''اچھا جمیل بابو! میں چلتی ہوں...... بہت سے کام کرنے ہیں۔ تم کھانا کھا کر برتن یہیں رکھ دینا...... میں خود ہی آ کر لے جاؤں گی۔''

لاڈلی چلی گئی اور میں کھانا کھانے لگا۔ لاڈلی نے بہت مزیدار کھانا پکایا ہوا تھا۔ ویسے بھی کافی دنوں کے بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا تھا اس لئے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ میں کھانا کھا کر کمرے میں ہی ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد لاڈلی آئی اور خالی برتن اٹھا کر لے گئی۔ اس نے کوئی بات کی اور نہ میں نے اس سے کوئی سوال کیا۔

لاڈلی کے کمرے سے جانے کے بعد میں بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ شیخ جی سے انسانیت کے رشتے کے سوا میرا کوئی اور رشتہ نہیں تھا لیکن وہ کس قدر مہربان بن کر مجھے ملے۔ شاید یہ دنیا ایسے ہی اچھے انسانوں کی وجہ سے قائم ہے...... ورنہ کب کی ختم ہو چکی ہوتی...... یہ دنیا جہاں قدم قدم پر دھوکہ اور فریب ہے...... جہاں لٹیرے ہر جگہ اپنا

جال بچھائے بیٹھے ہیں...... جہاں اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کا گلا دبا دیا جاتا ہے جہاں ضروریاتِ زندگی تو مہنگی ہیں مگر انسان کی کوئی قیمت نہیں جسے چند روپوں کی خا گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

نہ جانے کب تک میں انہی خیالوں میں گم رہا۔ پھر اچانک میں ابا اور بھائیوں کے متعلق سوچنے لگا کہ میرے اچانک غائب ہو جانے پر انہوں نے میری تلاش میں بھا دوڑ کی ہوگی اور ہر طرف سے مایوس ہو کر بیٹھ گئے ہوں گے یا شاید مجھے کوئی فالتو چ سمجھ کر بھول گئے ہوں گے۔ پھر میں نے اپنی سوچ کی خود ہی نفی کر دی کہ باپ کیسا ہوا سے اپنی اولاد پیاری ہی ہوتی ہے۔ اور پھر میں کوئی ایسا نافرمان بھی نہیں تھا کہ میر نہ ملنے پر ابا کو کوئی دکھ نہیں ہوا ہوگا۔ یقیناً مجھے ڈھونڈنے کے لئے ابا نے کیا کچھ نہیں ہوگا۔ میرے چاروں بھائیوں نے بھی مجھے تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہوگی۔ ا باتوں کے متعلق سوچتے سوچتے رات بیت گئی۔ اس دوران کئی بار میری آنکھ ڈبڈبائیں۔ کئی بار میری آنکھوں سے آنسو بہے۔ میں نے ان خیالات کو بار بار ذہن جھٹکنے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنی سوچوں پر کنٹرول نہیں رہا تھا اس لئے رات بھر سو نہ سکا۔

صبح ہوئی تو گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ ویسے بھی گھر میں شیخ جی اور بیگم جان کے علا تھا ہی کون۔ لاڈلی اور اس کا شوہر افضل خان تو اپنے کوارٹر میں تھے۔ انہیں بھی خدا اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ اس لئے کہیں سے بھی کسی بچے یا بڑے کی آواز نہی رہی تھی۔ میں کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ پچھلے روز سے میں اسی کمرے میں بند تھا اس لئے مجھے گھٹن محسوس ہونے لگی۔ میں بیڈ سے اٹھا اور باتھ روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تمام کمروں کے دروازے بند تھے ا کسی کمرے سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں وہاں سے گزر کر ٹی وی لاؤنج میں گیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ٹی وی لاؤنج کے ساتھ ہی کچن تھا۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے کچن میں جھانک کر دیکھا تو وہاں لاڈلی موجود تھی۔

"کیا کر رہی ہو لاڈلی......؟" میں نے سوال کیا تو لاڈلی نے مڑ کر دیکھا اور بولی۔

"شیخ جی کے لئے چائے بنا رہی ہوں...... اگر تم بھی پیو گے تو تمہارے لئے بھی دوں؟"

"نہیں لاڈلی! میں تو صبح صبح چائے نہیں پیتا۔"

"تو پھر دودھ کا گلاس لے آؤں؟"

"نہیں لاڈلی...... ابھی تو کسی چیز کو بھی دل نہیں چاہ رہا......"

"اچھا تم بیٹھو...... میں شیخ جی کو چائے دے آؤں۔"

"یہ شیخ جی ہیں کہاں......؟"

"وہ باہر لان میں پودوں کو پانی دے رہے ہیں۔"

"اچھا پھر چائے کا کپ مجھے پکڑا دو۔ میں انہیں وہیں دے آتا ہوں۔"

"شیخ جی کے لئے چائے تم لے کر جاؤ گے؟"

"کیوں، اس میں کیا حرج ہے؟"

"جمیل بابو! میرا مطلب ہے میرے ہوتے ہوئے شیخ جی کے لئے تم چائے لے کر جاؤ گے...... اچھا نہیں لگے گا۔ اور پھر شیخ جی بھی خفا ہوں گے۔"

"ارے نہیں ہوتے خفا...... لاؤ تم چائے کا کپ مجھے دو...... کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

میں نے لاڈلی سے چائے کا کپ لیا اور باہر لان میں آ گیا۔ شیخ جی پودوں کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر ان کی توجہ میری طرف ہوئی اور میرے ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑا ہوا دیکھ کر فوراً بول پڑے۔ "یہ کیا...... چائے تم لے کر آ رہے ہو...... لاڈلی کہاں ہے؟"

"لاڈلی کچن میں کام کر رہی ہے...... میں کمرے میں پڑا بور ہو رہا تھا...... باہر نکلا تو وہ آپ کے لئے چائے بنا کر لا رہی تھی۔ میں نے اس سے چائے کا کپ پکڑ لیا اور آپ کے پاس لے آیا۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے...... تم چائے وہاں میز پر رکھ دو میں فارغ ہو کر پی لیتا ہوں۔"

"نہیں شیخ جی! آپ آرام سے بیٹھ کر گرم گرم چائے پئیں اور یہ کام میرے حوالے کر دیں۔"

"ارے میں تو بس یونہی وقت گزاری کے لئے صبح صبح پھول پودوں کی دیکھ بھال میں لگ جاتا ہوں ورنہ پودوں کی باقاعدہ دیکھ بھال کے لئے مالی رکھا ہوا ہے...... مگر جمیل! تم یہ کام کر لو گے......؟"

"شیخ جی! دیہات کا رہنے والا ہوں...... کیا ہوا جو کبھی ایسے کام نہیں کئے۔ لیکن ابا
بھائیوں کو تو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے ناں۔"

"ٹھیک ہے بھئی جیسی تمہاری مرضی۔"

شیخ جی نے میرے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑا اور لان میں بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر
چائے پینے لگے۔ وہیں میز پر اخبار بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے ساتھ ساتھ
اخبار بھی پڑھتے رہے اور میں پودوں کی دیکھ بھال میں لگا رہا۔ شیخ جی کچھ دیر تک وہاں
بیٹھے اخبار پڑھتے رہے، پھر اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی فارغ ہو کر
اپنے کمرے میں آ گیا۔ ابھی نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا ہی تھا کہ لاڈلی ناشتہ لے کر
گئی۔

"لاڈلی...... یہ کیا ہے......؟"

"تمہارے لئے ناشتہ ہے۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر......؟"

"پھر کیا...... لاڈلی! اس طرح تو تم مجھے بیکار کر دو گی۔"

"لیکن وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ میں اس گھر میں کوئی مہمان ہوں جو تم میرے لئے ناشتہ اور کھانا یہاں
کمرے میں لے کر آتی ہو...... تم یہاں نہ لایا کرو...... میں وہیں کچن میں آ کر تم سے لے
لیا کروں گا۔"

"مجھے تو شیخ جی نے کہا تھا کہ میں تمہارا ناشتہ اور کھانا تمہارے کمرے میں ہی پہنچایا
کروں۔"

"شیخ جی سے میں خود ہی بات کر لوں گا...... بس تم ویسا کرو جیسا میں کہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے جمیل بابو...... جیسی تمہاری مرضی۔"

ناشتہ کرنے کے بعد میں ایک بار پھر فارغ تھا۔ لاڈلی برتن اٹھا کر لے گئی تھی۔ وقت
گزارے نہیں گزرتا تھا۔ کمرہ مجھے قید لگنے لگا تھا اس لئے میں ایک بار پھر لاڈلی کے پاس
جا پہنچا۔ وہ گھر کا سودا سلف لانے کے لئے بازار جا رہی تھی۔ میں نے جانتے ہوئے بھی

اس سے سوال کیا۔ "کہیں جا رہی ہو کیا......؟"

"بازار جا رہی ہوں...... کوئی کام ہے کیا......؟"

"کمرے میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا...... اس لئے تمہارے پاس چلا آیا......
اب تم بازار جا رہی ہو...... اگر تم برا نہ مانو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں...... کہیں شیخ جی ناراض نہ ہوں۔"

"شیخ جی کا مجھے پتہ ہے، وہ کچھ نہیں کہیں گے...... ہاں البتہ بیگم جان کہیں خفا نہ ہو
جائیں۔"

"بیگم جان نے بھی کیا کہنا ہے...... ویسے بھی وہ ابھی تک سوئی پڑی ہیں...... ان کے
اٹھنے سے پہلے تو ہم واپس بھی آ جائیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو لاڈلی! اتنا دن چڑھ آیا ہے اور بیگم جان ابھی تک سو رہی ہیں؟"

"ارے جمیل بابو! یہ سب بڑے لوگوں کی باتیں ہیں...... یہ لوگ رات بھر جاگتے
رہتے ہیں اور پھر جب سوتے ہیں تو کہیں دوپہر تک ہی ان کی آنکھ کھلتی ہے۔"

"لیکن ہمارے شیخ جی بھی تو بڑے آدمی ہیں...... وہ تو صبح سویرے ہی اٹھے ہوئے
تھے۔"

"اب سارے لوگ ایک جیسے تو نہیں ہوتے ناں...... اچھا تم ان باتوں کو چھوڑو......
اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو جلدی چلو...... مجھے واپس آ کر دوپہر کا کھانا بھی تیار کرنا
ہے۔" یہ کہتے ہی لاڈلی چل پڑی اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ لاڈلی میرے آگے آگے
چل رہی تھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں چلتے چلتے اپنے دائیں بائیں بھی
دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور عالیشان گھر بنے ہوئے تھے۔ ہم ان
گھروں کے پاس سے گزرتے ہوئے باہر آئے تو وہاں ہر طرح کی چھوٹی بڑی دکانیں بنی
ہوئی تھیں۔ لاڈلی جس دکان میں داخل ہوئی وہ سب دکانوں سے بڑی تھی۔ میں نے
زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی دکان دیکھی تھی۔ میں حیرانگی سے دکان میں پڑی ہوئی چیزوں
کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں ضروریاتِ زندگی کی سبھی اشیاء ایک چھت کے نیچے پڑی دکھائی دے
رہی تھیں۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے لاڈلی سے سوال کر ڈالا۔

"لاڈلی! یہ ایک ہی دکان ہے کیا؟"

"ہاں جمیل بابو...... دکان تو ایک ہی ہے......اسے ڈیپارٹمنٹل سٹور کہتے ہیں۔"

"یہاں تو ہر طرح کی چیزیں ہی نظر آ رہی ہیں۔"

"جمیل بابو! یہی تو فائدہ ہے ایسی جگہوں پر آنے کا...... جگہ جگہ خریداری کے دھکے نہیں کھانے پڑتے......تقریباً ضروریاتِ زندگی کی سبھی چیزیں ایک ہی جگہ مل جاتی ہیں۔"

وہاں ایک طرف لوہے کی سلاخوں سے بنی بہت سی ٹوکریاں اور ٹرالیاں پڑی تھیں۔ لاڈلی نے وہاں سے ایک ٹوکری اٹھا لی۔ وہ چلتے چلتے میرے ساتھ باتیں بھی کرتی تھی اور اپنی ضرورت کے مطابق مختلف جگہوں سے چیزیں اٹھا کر ٹوکری میں بھی رکھتی تھی۔ اس نے ٹوکری لا کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ وہاں پر موجود کیشئر نے بل بنا کر لاڈلی کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس کے ساتھی نے تمام چیزیں دو بڑے بڑے شاپروں میں ڈال دیں۔ لاڈلی نے بل ادا کیا اور میں نے دونوں شاپر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ لاڈلی کی کوشش تھی کہ میں دونوں یا کم از کم ایک شاپر تو اس کو پکڑا دوں لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور دونوں شاپر خود اٹھائے رکھے۔ بھلا یہ اچھا لگتا کہ ایک مرد کے ہوتے ہوئے عورت بوجھ اٹھاتی۔

گھر پہنچے تو بیگم جان اپنے کمرے سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھی تھیں۔ مجھے لاڈلی کے ساتھ دیکھ کر انہوں نے کسی قسم کا کوئی سوال نہ کیا۔ لاڈلی، بیگم جان کے پاس بیٹھ گئی اور میں وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود لاڈلی دوپہر اور پھر رات کا کھانا کمرے میں ہی دے گئی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی رات تک خود کو اسی کمرے میں قید رکھا تاکہ کہیں بیگم جان میرے گھر میں آزادانہ گھومنے پر برا نہ منا لیں۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کرسی پر ٹیک لگائے اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا کہ لاڈلی کھانے کے خالی برتن اٹھانے کمرے میں آئی اور بولی۔ "جمیل بابو! شیخ جی تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"کب آئے شیخ جی؟"

"کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے آئے تھے اور اب کھانے سے فارغ ہو کر سامنے والے

کمرے میں بیٹھے تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لاڈلی...... میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

لاڈلی اور میں ایک ساتھ ہی کمرے سے باہر نکلے۔ لاڈلی برتن اٹھائے کچن کی طرف چلی گئی اور میں اسٹڈی روم میں داخل ہو گیا جہاں شیخ جی کسی کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے پاس بلا کر اپنے برابر والی کرسی پر بٹھا لیا اور بولے۔

"ہاں بھئی جمیل...... کہو، کیسا دن گزرا؟"

"صحیح پوچھیں تو بہت بور دن گزرا۔"

"وہ کیوں......؟"

"سارا دن کمرے میں اکیلے اور بیکار بیٹھے بھلا وقت کیسے گزرتا ہے...... جب سے یہاں آیا ہوں تب سے مجھے مہمان بنا کر رکھا ہوا ہے۔ لاڈلی آتی ہے اور وہیں کمرے میں کھانا دے جاتی ہے......بس کھانا کھاؤ اور کمرے میں پڑے رہو......"

"ابھی نئے نئے آئے ہو ناں...... آہستہ آہستہ دل لگ جائے گا......اور پھر یہ سارے کا سارا گھر تمہارا اپنا ہے۔ جہاں چاہے اٹھو بیٹھو...... اور یہ میرا اسٹڈی روم ہے۔ یہاں بہت سی کتابیں پڑی ہیں۔ کبھی دل چاہے تو یہاں آ کر بیٹھ جایا کرو اور جس کتاب کو پڑھنے کو دل چاہے پڑھ لیا کرو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے شیخ جی...... مگر میرے کرنے کو بھی تو کوئی کام ہونا چاہئے۔"

"اچھا اچھا، وہ بھی دیکھ لیں گے...... فی الحال تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو..... میں کچھ دیر کتاب پڑھوں گا۔"

میں اپنی کرسی سے اٹھ کر شیخ جی کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور ان کے کندھے دبانے لگا تو وہ فوراً بول پڑے۔ "ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو......؟"

"شیخ جی! آپ دن بھر کے تھکے ہوئے ہوں گے...... تھوڑا سا دبا دوں...... آپ کو سکون مل جائے گا......"

"نہیں بھئی نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔"

"کچھ نہیں ہوتا شیخ جی......بس آپ آرام سے بیٹھے کتاب پڑھتے رہیں۔ اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔"

"اچھا بھئی، جیسے تمہاری خوشی......" شیخ جی یہ کہتے ہوئے خاموشی سے کتاب پڑھنے لگے اور میں ان کے کندھے دبانے لگا۔

رفتہ رفتہ میں خود کو کمرے میں قید رکھنے کی بجائے گھر کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا۔ مجھ سے پہلے شیخ جی ہر صبح ایک دو گھنٹے پودوں کی دیکھ بھال میں لگا دیتے تھے اور ہفتے میں ایک دو بار ہی مالی آتا تھا۔ میں نے شیخ جی کی جگہ پھولوں اور پودوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ پہلے پہل وہ اپنی اس ڈیوٹی سے دستبردار ہونے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہ تھے لیکن آخر کار میری ضد کے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب میں پودوں کی دیکھ بھال میں لگا رہتا اور وہ اخبار کا مطالعہ کرتے رہتے۔

گھر کا سودا سلف اور سبزی وغیرہ لینے لاڈلی کو بازار جانا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے یہ کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ میرے اس اقدام سے لاڈلی بہت خوش تھی کیونکہ اس طرح اس کا کافی وقت بچ جاتا تھا اور وہ با آسانی گھر کے دیگر کام بروقت نمٹا لیتی تھی۔ مجھے اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک تو مجھے کھلی فضا میں ہوا خوری کا موقع مل جاتا اور دوسرے کچھ وقت با آسانی کٹ جاتا۔

شیخ جی کا دفتر گھر سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ ان کے لئے دوپہر کا کھانا گھر سے ہی جاتا تھا۔ کھانا پہنچانے کی ذمہ داری ایک سائیکل والے کے سپرد تھی جو ماہانہ معاوضہ لیتا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح شیخ جی کو راضی کر لیا اور دوپہر کو انہیں کھانا پہنچانا بھی اپنی ذمہ داریوں میں شامل کر لیا۔ میں افضل خان کی سائیکل اٹھاتا اور لنچ بکس میں کھانا ڈال کر شیخ جی کو دے آتا۔ گھر میں کوئی کام ہوتا تو کھانا دیتے ہی فوراً گھر واپس آ جاتا ورنہ عام طور پر جب تک شیخ جی کھانا کھانے سے فارغ نہ ہو جاتے، میں وہیں بیٹھا رہتا اور ان کے کھانا کھا لینے کے بعد گھر کی راہ لیتا۔

اب صبح سویرے اٹھ کر پھولوں اور پودوں کی دیکھ بھال کرنا، بازار سے سودا سلف خرید کر لانا، دوپہر کو شیخ جی کا کھانا ان کے دفتر پہنچانا اور رات کو کچھ دیر شیخ جی کے کندھے اور پاؤں دبانا میرے معمولات بن گئے تھے۔ شیخ جی کو دبانے سے فارغ ہو کر میں بھی ان کے پاس اسٹڈی روم میں بیٹھا کوئی نہ کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا اور کبھی کبھار کوئی کتاب مجھے زیادہ دلچسپ لگتی تو میں شیخ جی کی اجازت سے اپنے کمرے میں لے آتا اور

دیر تک کتاب پڑھنے میں مگن رہتا۔ شیخ جی نے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں اپنے پاس جمع کر رکھی تھیں۔ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی کتاب خرید لاتے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں جب بھی کہیں کوئی اچھی کتاب نظر آ جائے وہ ہر قیمت پر اسے خرید لاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ جی کا اسٹڈی روم لائبریری کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

پہلے پہل شیخ جی کا گھر مجھے قید خانہ لگا کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے میری مصروفیات کا کچھ نہ کچھ سامان پیدا ہوتا گیا اور میری اجنبیت دور ہوتی گئی، میں خود کو گھر کا ہی فرد سمجھنے لگا۔ مجھے رہنے کو چھت میسر تھی، کھانے کو اچھا ملتا تھا، پہننے کو شیخ جی نے اچھے کپڑے لا دیئے تھے۔ مجھے بھلا اور کیا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ نہ مجھے کسی قسم کی ضرورت تھی اور نہ ہی میں اس سے بڑھ کر کسی اور چیز کا طلب گار تھا۔

میں معمول کے مطابق شیخ جی کے کندھے دبا رہا تھا کہ ان کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "جمیل......!"

"جی شیخ جی......؟"

"تمہیں اس گھر میں آئے کتنا عرصہ ہو گیا......؟"

"شیخ جی! یہی کوئی چار ماہ تو ہو گئے ہوں گے۔"

"اب تو تمہارا دل لگا ہوا ہے ناں......؟"

"جی بالکل لگا ہوا ہے۔"

"اس دوران تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں گھر کے سارے کام کرتا ہوں مگر شیخ جی نے کبھی تنخواہ کی بات ہی نہیں کی۔"

"شیخ جی...... تنخواہ کا کیا کرنا ہے...... میرے لئے آپ کا پیار ہی کافی ہے...... اور ویسے بھی کھانے پینے کو سب کچھ تو مل جاتا ہے اس سے بڑھ کر مجھے اور کیا چاہئے۔"

"نہیں بھئی نہیں...... برخوردار! ایسا نہیں ہے...... تم جب سے یہاں آئے ہو میں ہر ماہ تمہاری تنخواہ کے پیسے الگ سے رکھ دیتا ہوں...... تاکہ جب تم گاؤں جانا چاہو تو اپنی تنخواہ کی رقم مجھ سے لے لو۔"

"شیخ جی! آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں...... میں آپ کے بیٹوں کی طرح ہوں اور کبھی کوئی بیٹا بھی اپنے گھر میں کام کرنے کی تنخواہ لیتا ہے؟ اور پھر گاؤں میں اب میرا

ہے ہی کیا...... اب تو آپ کے قدموں میں ہی رہنا ہے۔"

"خیر وہ تو تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن تمہاری تنخواہ کی رقم میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ تم جب چاہو لے سکتے ہو۔ اور اگر ہر ماہ تنخواہ لے کر اپنے پاس رکھنا چاہو تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"شیخ جی...... آپ نے مجھے رہنے کو جگہ دی، مجھے پیار دیا، عزت دی۔ کیا میرے لئے آپ کا یہ احسان کم ہے جو میں تنخواہ بھی لوں......؟"

"برخوردار! بات یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا۔ کہیں نہ کہیں اس کے پیچھے اس کا اپنا کوئی نہ کوئی مفاد ضرور چھپا ہوتا ہے...... اب دیکھو ناں تمہارے آنے سے پہلے اس گھر میں کس قدر ویرانی دکھائی دیتی تھی...... اب تمہاری وجہ سے رونق لگی رہتی ہے۔ اور میرا بھی دل لگا رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بیٹے بیٹیوں کے گھر سے چلے جانے کے بعد میں خود کو اس اسٹڈی روم میں قید کئے رکھتا تھا اور تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑتی تھی...... لیکن اب ایسا نہیں...... تو پھر تم ہی بتاؤ کہ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوا یا میرا تم پر......؟"

"شیخ جی! آپ مانیں نہ مانیں، آپ کے مجھ پر اس قدر احسانات ہیں کہ زندگی بھر آپ کے سامنے میری آنکھ نہیں اٹھ سکتی۔"

"اچھا چھوڑو...... آج تم کیسی باتیں لے بیٹھے۔ کافی وقت گزر گیا ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو۔"

"ٹھیک ہے شیخ جی۔ جو آپ کا حکم۔" یہ کہتے ہوئے میں وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

شیخ جی سے باتیں کرنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ وہ جب بھی کسی معاملے میں مجھ سے بات کرتے تو اس قدر پیار اور محبت سے زمانے کی اونچ نیچ کے متعلق سمجھاتے کہ جی چاہتا وہ باتیں کرتے جائیں اور میں سنتا جاؤں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تھوڑے ہی عرصے میں ان سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔

ہر دوسرے تیسرے روز اشیائے ضرورت کی خریداری کے لئے ڈیپارٹمنٹل سٹور کا چکر لگ جاتا تھا۔ اس لئے ڈیپارٹمنٹل سٹور کے کیشئر اکرام سے میری اچھی سلام دعا ہو گئی

تھی۔ میں ضرورت کی اشیاء ٹوکری میں ڈال کر کاؤنٹر پر آیا تو مجھ سے پہلے کوئی صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ کھڑے ادائیگی کر رہے تھے۔ وہ دیکھنے میں کسی اچھے خاندان کے لوگ لگتے تھے۔ انہوں نے کافی زیادہ اشیاء خریدی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے پورے ماہ کی ضرورت کے لئے ایک ہی بار خریداری کر لی تھی۔ میں ان سے دو قدم پیچھے اپنی باری کے انتظار میں کھڑا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے کافی سامان خریدا ہے۔ اچھا خاصا بل بنے گا۔ اکرام نے ایک ایک کر کے تمام اشیاء بل پر لکھ لیں تو اس کا ساتھی تمام اشیاء ترتیب سے شاپروں میں ڈالنے لگا۔ اکرام نے بل بنا کر ان کے حوالے کیا تو انہوں نے ایک نظر بل پر ڈالی اور ادائیگی کر دی۔ اس دوران اکرام کا معاون تمام سامان گاڑی میں رکھ آیا تھا۔ انہوں نے اس سے گاڑی کی چابی لی اور وہاں سے نکل گئے۔

گو کہ میرا اس بات سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ان کے جانے کے بعد میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ انہوں نے کافی لمبی چوڑی خریداری کی تھی مگر بل تو بہت تھوڑا سا بنا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں کاؤنٹر پر آ گیا تو اکرام بولا۔

"آؤ بھئی جمیل...... کیا حال ہے؟"

"میں تو ٹھیک ہوں مگر سوچ رہا ہوں کہ یہ لوگ اس قدر خریداری کر کے گئے ہیں، بل اچھا خاصا بننا چاہئے تھا۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے تم نے ان سے صرف ایک ہزار ایک سو گیارہ روپے لئے ہیں۔ کہیں تم سے غلطی تو نہیں ہو گئی......؟"

میری بات سنتے ہی اکرام کو چکر آ گیا۔ اس نے فوراً بل بک اٹھا کر دیکھی تو اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے اپنے ساتھی کو بلایا اور بولا۔ "بات سنو...... یہ جو ابھی سامان لے کر گئے ہیں...... جلدی سے ان کو روکو...... کہیں ایسا نہ ہو وہ نکل جائیں۔"

اس کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن وہ بات سنتے ہی فوراً باہر کی طرف بھاگا جہاں وہ لوگ گاڑی اسٹارٹ کر چکے تھے اور نکلنے ہی والے تھے۔ اس نے انہیں آواز دی تو وہ رک گئے۔ میری بھی نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں وہ لڑکا انہیں بتا رہا تھا کہ کیشئر صاحب بلا رہے ہیں۔ اکرام کی اڑی ہوئی رنگت اور ماتھے پہ پسینہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تبھی تو وہ اس قدر پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں گاڑی بند کر کے لڑکے کے ساتھ ہی اکرام کے پاس آ گئے۔

"ہاں بھئی کیا مسئلہ ہے......؟" خریدار نے آتے ہی اکرام سے سوال کیا۔

"معافی چاہتا ہوں آپ کو تکلیف دی۔"

"اِٹ از او کے...... آپ بتائیں بات کیا ہے؟"

"اصل میں مجھ سے حساب میں تھوڑی سی غلطی ہو گئی......"

"بھئی مجھے تو آپ نے جتنے پیسے بتائے میں نے اتنے ہی ادا کر دیئے...... آپ نے مجھے ایک ہزار ایک سو گیارہ روپے بتائے تھے۔ میں نے پورے ایک ہزار ایک سو گیارہ روپے ادا کر دیئے۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں سر! غلطی میری ہی ہے.... پلیز ذرا بل دکھائیں گے؟"

اکرام کے کہنے پر خریدار نے اپنی جیب سے بل نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اکرام نے بل دیکھا اور بولا۔ "یہ دیکھیں ناں...... بل گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے ہے جبکہ میں نے آپ سے ایک ہزار ایک سو گیارہ روپے کہہ دیا...... پلیز آپ دس ہزار روپے اور عنایت فرما دیں۔"

"خیر لائیں، بل مجھے دکھائیں۔ میں نے تو ابھی تک صحیح طرح سے بل دیکھا بھی نہیں۔ بس جتنی رقم آپ نے کہی، میں نے اتنی رقم ادا کی اور بل جیب میں ڈال لیا۔"

"کوئی ایسی بات نہیں جناب! پہلے آپ تسلی سے بل دیکھ لیں، پھر ادائیگی کریں۔" یہ کہتے ہوئے اکرام نے بل خریدار کے حوالے کر دیا۔ میاں بیوی نے باری باری بل کا جائزہ لیا اور اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد باقی کی رقم ادا کی اور وہاں سے چلے گئے۔ ان سے دس ہزار روپے وصول کرنے کے بعد اکرام کی جان میں جان آئی اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

"یار جمیل...... میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں...... آج تم نہ ہوتے تو مجھے دس ہزار کا نقصان ہو جانا تھا۔ میں تو پہلے ہی بمشکل اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ بھلا نقصان کہاں سے پورا کرتا۔"

"خیر شکریے کی تو کوئی بات نہیں...... لیکن اس بات کی خوشی ہے کہ میری وجہ سے تم نقصان سے بچ گئے۔"

مجھے گھر سے نکلے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اس لئے میرے وہاں مزید وقت گزارنے

سے اور بھی تاخیر ہو جاتی۔ مجھے علم تھا کہ لاڈلی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ کیونکہ اس نے آتے ہوئے مجھے تاکید کی تھی کہ میں کہیں بھی وقت ضائع کئے بغیر خریداری کے بعد فوراً گھر کی راہ لوں۔ میرے گھر پہنچنے پر ہی اس نے دوپہر کا کھانا تیار کرنا تھا۔ میں گھر پہنچا تو وہ میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ میں نے سٹور سے خریدی ہوئی تمام اشیاء اس کے حوالے کر دیں اور اپنے تاخیر سے آنے کا سبب بھی بتا دیا۔ لاڈلی میری بات سن کر بہت خوش ہوئی کیونکہ میری وجہ سے اس غریب کیشئر کا بھلا ہو گیا تھا۔

رات ہوئی تو میں نے سٹڈی روم میں بیٹھے شیخ جی سے بھی ڈیپارٹمنٹل سٹور میں ہونے والے واقعہ کے متعلق ذکر کیا۔ انہوں نے بھی میری بہت تعریف کی اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار کیا۔ مجھے شیخ جی کا پیار کرنا بہت اچھا لگا اور نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میرا باپ بھی شیخ جی جیسا ہوتا جو مجھے اپنے پاس بٹھا کر میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتا اور پیار کرتا لیکن اسے ایسا کرنے کی کبھی توفیق ہی نہ ہوئی۔

"کس سوچ میں گم ہو برخوردار......؟" شیخ جی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں فوراً سنبھل گیا اور پوچھا۔

"شیخ جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا......؟"

"میں پوچھ رہا ہوں آج کس سوچ میں گم ہو......؟"

"بس شیخ جی...... یونہی کچھ خیال آ گیا تھا۔"

"بھئی مجھے تو کچھ بتاؤ۔"

"شیخ جی...... ایک بات بتائیں گے آپ......؟"

"ہاں ہاں...... کیوں نہیں...... پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو......؟"

"شیخ جی! کیا آپ اپنے بچوں سے بھی اسی طرح پیار کیا کرتے تھے؟"

میری بات سن کر شیخ جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بولے۔ "اولاد کسے پیاری نہیں ہوتی...... وہ چاہے اچھی نہ بھی ہو لیکن ماں باپ کے پیار میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اور پھر میرے بچے تو ہیں ہی لاکھوں میں ایک۔ انہیں کون پیار نہیں کرے گا......"

"شیخ جی! پھر وہ آپ کو تنہا کیوں چھوڑ گئے؟"

"برخوردار! انہیں زندگی میں کامیابیاں حاصل کرنا تھیں...... میں بھلا ان کی راہ میں رکاوٹ کیوں بنتا...... وہ سب اپنی اپنی جگہ خوش ہیں بھلا مجھے اور کیا چاہئے۔ ماں باپ کو تو اولاد کی خوشیاں اور سکھ عزیز ہوتے ہیں...... میرے بچوں کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بہتر مستقبل کے لئے بیرون ملک جائیں اور وہ چلے گئے...... وہ ہزاروں میل دور سات سمندر پار بیٹھے بھی مجھے یاد رکھتے ہیں۔ وقفے وقفے سے میری خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کرتے ہیں۔ سال دو سال میں پاکستان آ کر مجھ سے مل بھی جاتے ہیں......اور...... آتے ہوئے میرے لئے ڈھیروں تحائف بھی لے کر آتے ہیں۔ یہ بھی ان کی برخورداری ہے۔"

"شیخ جی! پھر بھی یاد تو آتے ہوں گے ناں......"

"بچے ماں باپ کی نظروں کے سامنے ہوں یا کہیں دور، ان کے لئے دل میں پیار ہوتا ہے اور جن کی جگہ دل میں ہو مگر وہ نظروں کے سامنے نہ ہوں تو یاد کیسے نہیں آئیں گے...... میں اکثر تنہا بیٹھا انہیں یاد کرتا ہوں اور کبھی کبھی ان کی یاد میں آنسو بھی بہا لیتا ہوں۔"

"شیخ جی! کبھی آپ کا دل نہیں چاہتا کہ گھر میں بچے ہوں اور رونق ہو......؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں...... جب میرے نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں آتے ہیں تو گھر میں خوب رونق ہو جاتی ہے اور پھر ان کے جانے کے بعد کئی دن تک دل اُداس رہتا ہے۔ گھر میں ہر طرف ویرانی چھائی رہتی ہے۔"

"شیخ جی! میں ان کی بات نہیں کر رہا۔ میں...... میں...... تو...... آپ کے...... اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی بات کر رہا ہوں۔"

میری بات سن کر شیخ جی ہنس پڑے اور بولے۔ "بہت شرارتی ہو گئے ہو تم...... بھلا اس عمر میں بچے کہاں سے آئیں گے۔"

"کیوں شیخ جی...... آپ کوئی بوڑھے ہو گئے ہیں کیا......؟"

"برخوردار! میں ان لوگوں میں سے نہیں جو بوڑھے ہو کر بھی خود کو بوڑھا تسلیم نہیں کرتے اور اپنا بڑھاپا چھپانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں...... جب میں بوڑھا ہو گیا ہوں تو مان لینے میں کیا حرج ہے۔"

شیخ جی سے باتیں کرنے کا بہت مزا آ رہا تھا لیکن میرے ہاتھ ایک بہت ہی دلچسپ

کتاب لگی تھی اس لئے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں جلدی سے اپنے کمرے میں جا پہنچوں اور کتاب پڑھنا شروع کر دوں۔ ادھر نیند کی وجہ سے شیخ جی کی بھی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس لئے میں نے کتاب لی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں اپنے بیڈ پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ کتاب اس قدر دلچسپ تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ بس اب تھوڑی سی دیر میں کتاب رکھ کر سونے کی تیاری کرتا ہوں۔ ابھی میں پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ دو کمروں کے درمیان والا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ کیونکہ وہ دروازہ تو ہمیشہ بند رہتا تھا اور جب سے میں اس گھر میں آیا تھا تب سے اس دوران ایک بار بھی وہ دروازہ نہیں کھلا تھا اور ویسے بھی اس دروازے کی چٹخنی ہر وقت چڑھی رہتی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس کی چٹخنی کب کسی نے کھول دی تھی؟

میری تمام تر توجہ اسی دروازے کی طرف تھی۔ دروازہ بغیر کسی آواز کے آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو وہاں سے بیگم جان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میری حیرانی اور بھی بڑھ گئی۔

بیگم جان کو دیکھتے ہی میں بیڈ سے اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا۔ بیگم جان میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا اور زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے میری قوتِ گویائی ہی ختم کر دی تھی۔ میری آنکھیں بیگم جان پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئیں اور کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ میں اب بھی وہیں کھڑا تھا لیکن خود کو سنبھال چکا تھا اس لئے بیگم جان سے دریافت کیا۔

"بیگم جان...... آپ اور اس وقت یہاں میرے کمرے میں...... خیر تو ہے ناں؟"

"کیوں...... میں یہاں نہیں آ سکتی......؟ کیا میرا اس کمرے میں آنا منع ہے......؟"

"نہیں بیگم جان...... ایسی تو کوئی بات نہیں...... یہ گھر آپ کا اپنا ہے اور آپ بلا روک ٹوک جب اور جہاں جانا چاہیں جا سکتی ہیں۔"

"تو پھر تم نے ایسا سوال ہی کیوں کیا؟"

"معذرت چاہتا ہوں بیگم جان...... اصل میں جب سے میں اس گھر میں آیا ہوں، کبھی آپ کو اس کمرے میں داخل ہوتے نہیں دیکھا...... آج جبکہ آدھی سے زیادہ رات

بیت چکی ہے، آپ کا اچانک کمرے میں آنا میرے لئے تشویش کا باعث بنا...... اسی لئے
میں نے آپ سے سوال کیا تھا۔ خیر...... آپ فرمائیے، میرے لئے کیا حکم ہے؟"

میرے سوال پر بیگم جان نے اپنی نظریں جھکا لیں اور کسی سوچ میں پڑ گئیں۔ میری
نظریں ان پر لگی ہوئی تھیں اور میں اس انتظار میں تھا کہ بیگم جان بولیں تو میں کچھ جان
سکوں۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ بیگم جان اسی طرح نگاہیں نیچی کئے کرسی پر بیٹھی
تھیں۔ میں اپنی جگہ کھڑا تھا اور دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ کہیں
یہ بات نہ ہو...... کہیں وہ بات نہ ہو...... کہیں ایسا نہ ہو گیا ہو...... کہیں ویسا نہ ہو گیا ہو۔
میں اپنے ہر خیال کی خود ہی نفی کر دیتا مگر میرے ذہن میں پھر کوئی دوسرا خیال آن بیرا
کرتا۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ بیگم جان نے نظریں اٹھائیں اور بولیں۔

"تم کھڑے کیوں ہو...... آرام سے بیٹھ جاؤ تا کہ میں تسلی سے اپنی بات کر سکوں۔"

"کوئی بات نہیں بیگم جان...... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں...... آپ فرمائیے، کیا کہنا
ہے؟"

"دیکھو جمیل...... جب تک تم تسلی سے بیٹھ کر میری بات نہیں سنو گے...... تمہیں میری
کسی بات کی سمجھ نہیں آئے گی۔"

بیگم جان کے کہنے پر میں بیڈ کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا تا کہ جو بات وہ کہنے
آئی تھیں، با آسانی کہہ سکیں۔ "جی بیگم جان! اب فرمائیے......"

"جمیل! سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ...... میں...... تمہیں...... کیسی لگتی ہوں......؟"

"جج...... جی......" بیگم جان کا سوال سنتے ہی مجھے اپنا آپ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا اور
میرا گلا خشک ہو گیا...... منہ سے ایک لفظ بھی صحیح طرح سے نہیں نکل رہا تھا۔

"بھئی میں نے تو سیدھا سا سوال کیا ہے کہ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں اور تم نہ جانے کن
خیالوں میں کھو گئے ہو......" بیگم جان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"لیکن...... بیگم جان...... آپ یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں......؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں...... اپنا جواب ہاں یا نہ میں دو۔"

بیگم جان نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بھلا میں ان کے اس سوال کا کیا
جواب دیتا۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے یہی کہنا مناسب سمجھا کہ آپ بہت اچھی ہیں۔ ویسے

بھی وہ تھیں ہی اچھی۔ میں بھلا انہیں کیسے اچھی نہ کہتا۔ وہ میرا جواب سن کر بولیں۔

"میرے ساتھ دوستی کرو گے......؟"

"بیگم جان...... یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں......؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ
رہا۔"

"اچھا چلو اس بات کو چھوڑو...... یہ بتاؤ...... میں کس کی ذمہ داری ہوں؟"

"ظاہر ہے، آپ شیخ جی کی بیوی ہیں...... انہی کی ذمہ داری ہیں۔"

"لیکن وہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے قابل نہیں۔"

"بیگم جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میرے خیال میں تو شیخ جی آپ کا بہت خیال
رکھتے ہیں اور اپنی اس ذمہ داری کو بخوبی نبھا رہے ہیں......"

"میں جانتی ہوں جمیل...... تم نے اس گھر میں آ کر شیخ جی کی بہت سی ذمہ داریاں
اپنے کندھوں پر لے لی ہیں اور شیخ جی تم سے خوش بھی ہیں...... اسی لئے میں چاہتی ہوں
کہ ان کی یہ ذمہ داری بھی تم سنبھال لو......"

"بیگم جان...... مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں۔"

"تو سنو...... ماں باپ صرف یہ سوچ کر کہ ان کی بیٹی بڑے گھر میں بیاہی جا رہی
ہے، اپنی جوان بیٹیاں شیخ جی جیسے بوڑھے اور عمر رسیدہ دولت مند لوگوں کے پلے باندھ
دیتے ہیں جو زندگی کی تمام بہاریں دیکھ چکے ہوتے ہیں اور پھر یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح
ان کی بیٹی عمر بھر عیش و آرام کی زندگی گزارے گی...... لیکن...... شاید وہ یہ نہیں سوچتے کہ
زندگی میں کوٹھی، کار، زیورات اور روپیہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، ان سب سے بڑھ کر
انہیں ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"لیکن شیخ جی تو بہت اچھے ہیں...... اس سے بڑھ کر بھلا آپ کو اور کیا چاہئے؟"

"تمہارے شیخ جی...... نامرد ہیں...... ایک مکمل نامرد...... جو کسی کلی کو مسل تو سکتے ہیں
مگر اسے پھول بنانا ان کے بس میں نہیں......"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم جان......؟ اور پھر مجھے یہ سب بتانے کی کیا ضرورت
تھی......؟"

"مجھے شیخ جی کی دلہن بن کر اس گھر میں آئے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا

ہے...... اس ایک سال کے دوران میں گھٹ گھٹ کر جیتی رہی ہوں...... اپنے
آگ سے خود کو جلاتی رہی ہوں لیکن اس آگ کو کبھی بھڑکنے نہیں دیا...... مگر اب
برداشت کرنا میرے بس میں نہیں رہا...... میں جانتی ہوں کہ تم کسی بھی صورت میں
چاہو گے کہ میں شیخ جی کی عزت کو جگہ جگہ نیلام کرتی پھروں...... اس لئے بہتر یہی ہے
گھر کی بات گھر ہی میں رہے...... میرا خیال ہے اب تم میری بات اچھی طرح سمجھ
گے...... اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

بیگم جان نے اپنی بات مکمل کی اور جس راستے سے آئی تھیں اسی راستے سے
کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میں نے
طرح سے خود کو چادر میں لپیٹ لیا تاکہ کسی طرح کپکپی دور ہو لیکن میری تمام تر کوشش
کے باوجود میری حالت سنبھل نہ سکی اور میں کپکپی کے ساتھ ساتھ پسینے میں بھیگ گیا۔
جان کی باتیں میرے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ میں جب سے اس گھر میں آیا تھا میں
بیگم جان کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی جرأت تھی کہ
کبھی نگاہ بھر کر انہیں دیکھتا۔ بیگم جان نے بھی صرف ایک دو بار کسی کام کے سلسلے میں
سے بات کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کبھی مجھ سے کوئی فالتو بات نہ کی تھی۔ میں
انہیں ہمیشہ خاموش اور اپنے کام میں مگن دیکھا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کے اندر
قدر چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔

بیگم جان کی باتوں نے مجھے عجیب اُلجھن کا شکار کر دیا تھا۔ ان کے کمرے میں آ
سے قبل میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی لیکن اب نیند میری آنکھوں سے غائب ہو
تھی۔ میں بیڈ پر لیٹا بار بار پہلو بدل رہا تھا مگر مجھ سے کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

رات بیت گئی مگر میں سو نہ سکا۔ صبح ہوئی تو میں نے اٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ
کہ اس دروازے کی چٹخنی چڑھا دی جس دروازے سے بیگم جان اندر آئی تھیں۔ میں
دن کا آغاز معمول کے مطابق کیا۔ دن بھر بظاہر خود کو مصروف رکھا لیکن خود کو بیگم جان
کہی ہوئی باتوں سے آزاد نہ کر سکا۔ ان کے کہے ہوئے الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح
میرے دل و دماغ پر برس کر مجھے زخمی کرتے رہے۔

کئی دن اسی حالت میں گزر گئے۔ نہ بیگم جان نے اپنی بات کو دہرایا اور نہ ہی

میرے سامنے آئیں۔ میں ہر رات سونے سے قبل اس بات کی اچھی طرح تسلی کر لیتا کہ
دروازوں کی چٹخنیاں چڑھی ہوئی ہیں۔

اس روز دن بھر کا تھکا ہارا بیڈ پر آ کر لیٹا تھا۔ لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے سوئے
ہوئے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ کمرے میں کسی کے چلنے کی آہٹ میرے کانوں میں
پڑی جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زیرو کا بلب
روشن تھا۔ میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا، کوئی سایہ سا چلتا ہوا میرے قریب آ کر
رک گیا۔ میں گھبرا کر فوراً اٹھ بیٹھا۔ وہ بیگم جان تھیں جو میرے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

بیگم جان میرے اس قدر قریب تھیں کہ ان کی سانسیں میری سانسوں سے ٹکرا رہی
تھیں اور ان کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو میرے جسم میں اتر رہی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو
انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھا دیا اور بولیں۔

"گھبرا کیوں رہے ہو......؟ ایک مرد ہو کر عورت سے دور بھاگتے ہو......؟"

"نہیں...... وہ...... وہ...... بیگم جان...... خدا کے لئے آپ یہاں سے چلی جائیں...... کہیں
شیخ جی نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو بہت برا ہو گا......"

"تم شیخ جی کی فکر چھوڑو...... انہیں میں گہری نیند سلا کر آئی ہوں...... تم اپنی بات
کرو۔"

"بیگم جان! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا......"

"اتنے بھی انجان نہ بنو جمیل...... میں نے ہر بات تو تمہیں کھل کر بتا دی تھی...... میں
اس دن سے تمہارے جواب کی منتظر تھی مگر تم بیگانے بن کر مجھے اور بھی تڑپاتے رہے......"

یہ کہتے ہی بیگم جان نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ میں نے پوری قوت سے خود کو
چھڑانے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ وہ میرے
اوپر جھکی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں کی سانسیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میں کچھ دیر تک
مدافعت کرتا رہا مگر آہستہ آہستہ میری مدافعت کمزور پڑتی گئی اور آخر کار میں نے خود کو بیگم
جان کے سپرد کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کب میری آنکھ لگی اور کب بیگم جان وہاں سے اٹھ کر
اپنے کمرے میں گئیں۔

صبح آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ شیخ جی دفتر جا چکے تھے۔ کسی نے بھی آ کر مجھے نہ

جگایا۔ میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہا تھا۔ کسی سے بھی نظریں ملانے کی ہمت نہیں پڑ رہی
تھی۔ یہ شاید میرے اندر کا چور تھا کہ میں لاڈلی سے بھی آنکھ ملا کر بات نہیں کر پا رہا
میں نے ناشتہ بھی اپنے کمرے میں ہی کیا۔ میں خود کو گناہ گار سمجھ رہا تھا کیونکہ اگر بیگم جان
پر شیطان سوار تھا تو کم از کم مجھے خود پر قابو رکھنا چاہئے تھا۔

میں دن بھر خود کو کوستا رہا اور ساتھ ساتھ یہ عہد کرتا رہا کہ اب جو بھی ہو، بیگم جان کو
سے جھٹک دوں گا۔ میں نے رات کو سونے سے قبل اپنے کمرے کے دروازوں کی
کنڈیاں اچھی طرح چیک کر لیں اور اطمینان سے لیٹ گیا۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ
دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی مگر میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ ایک بار پھر آہستگی سے
دروازے پر دستک دی گئی مگر میں خاموشی سے لیٹا رہا۔ کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ بیگم جان
ہی تھیں۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر دروازہ پیٹا جانے لگا۔ میں نے اس خوف
سے کہ شیخ جی کی آنکھ نہ کھل جائے، مجبوراً دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی بیگم جان اندر آ
گئیں۔ پھر نہ جانے کیوں بیگم جان کو اپنے قریب پا کر میرے خود سے کئے ہوئے تمام
عہد و پیمان کسی ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور بیگم
جان کی ہر رات میرے بیڈ پر گزرنے لگی۔ میں بے ہوشوں کی طرح سویا رہتا اور بیگم جان
نہ جانے کب اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں۔

وہ جب بھی میرے پاس ہوتیں، مجھے بیگم جان کہنے سے روکتی تھیں اور کہتیں کہ مجھے
بیگم جان نہ کہا کرو۔ بیگم تو میں شیخ جی کی ہوں، تم مجھے صرف جان کہہ کر پکارا کرو۔ میں
انہیں جب بھی جان کہتا وہ بہت خوش ہوتیں۔ میں تنہائی میں تو انہیں جان کہہ کر مخاطب کر
لیتا تھا لیکن دوسروں کے سامنے بیگم جان کہہ کر ہی بات کرتا۔

شیخ جی نے ہمدرد بن کر مجھے اپنے گھر میں جگہ دی تھی لیکن میں اپنے محسن کو ہی ڈنک
لگا تھا۔ وہ محسن جو میرے لئے کڑی دھوپ میں سائبان بن کر آیا تھا، میں اسی کی جڑوں کو
کاٹ رہا تھا۔ میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کرتا رہتا لیکن مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا
تھا۔ میں شیخ جی کا مجرم تھا مگر ان کے سامنے اپنا جرم تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ یوں بھی
ان کے سامنے کس منہ سے اعتراف جرم کرتا۔ آخر کار میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا
میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ ایک روز موقع ملتے ہی میں نے ہمت کر کے

اس گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ دیا کیونکہ مجھے اسی میں بہتری دکھائی دی تھی۔
یوں ایک بار پھر میں گھر سے بے گھر ہو گیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس
طرف کا رخ کروں۔ کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک حالات اس طرح
کا رخ اختیار کر جائیں گے۔ مگر گھر چھوڑنے کے علاوہ مجھے کوئی دوسرا راستہ بھی دکھائی نہیں
دیتا تھا۔

میں ذہنی طور پر یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ میں یونہی غیر ارادی طور
پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مارکیٹ کی طرف نکل آیا۔ مارکیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے
جب میں ڈیپارٹمنٹل سٹور کے پاس سے گزرا تو اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ
کیوں نہ اس سلسلے میں اکرام سے بات کر لی جائے۔ یہ خیال آتے ہی میں فوری طور پر
ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہو گیا۔

اکرام کے پاس چند گاہک کھڑے تھے۔ اس لئے میں ایک طرف ہو کر اس کے فارغ
ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے فارغ ہونے میں چند منٹ لگے۔ اس دوران میں خاموشی
سے کھڑا رہا۔ فارغ ہوتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

”آؤ بھئی جمیل! وہاں کیوں کھڑے ہو...... ادھر میرے قریب آ جاؤ...... اور آج خالی
ہاتھ ہو۔ کوئی خریداری بھی نہیں کی......؟“

اکرام کی بات سن کر میں اس کے قریب چلا گیا مگر اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ
دیا۔ مجھے خاموش دیکھا تو وہ پھر بول پڑا۔ ”کیا بات ہے...... آج تم پہلے کی طرح چہک
نہیں رہے...... کوئی پریشانی ہے کیا؟“

”ہاں یار! بس کچھ ایسی ہی بات ہے...... اسی لئے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”ہاں ہاں، تم میرے ہمدرد بھی ہو اور دوست بھی...... کہو کیا کہنا ہے؟“

”بات یہ ہے کہ میں شیخ جی کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ آیا ہوں۔“

”کیوں...... ایسی کیا بات ہو گئی تھی......؟“

”اگر تم برا نہ مانو تو پلیز مجھ سے تفصیل مت معلوم کرو...... بس یوں سمجھ لو کہ میرا گھر
چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔“

”اچھا خیر، تم کہتے ہو تو نہیں پوچھتا۔ اب بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

"تم تو جانتے ہی ہو کہ اتنے بڑے شہر میں تمہارے علاوہ میرا کوئی ہمدرد نہیں اس لیے
سیدھا تمہارے پاس چلا آیا ہوں...... اگر ہو سکے تو وقتی طور پر ہی سہی، کہیں میری رہائش
بندوبست کر دو...... میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔"

میری بات سن کر اکرام کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ میری
مشکل کا کوئی حل نکالے تا کہ میں کسی چھت کے تلے پناہ لے سکوں کیونکہ میں دوسری
اُجڑا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اُجڑنا تکلیف دہ ہے تو بسنے کے لئے اس سے
بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ دیر بعد اکرام نے میری طرف
دیکھا اور بولا۔

"میں چند سال قبل اپنی شادی سے پہلے تک کچھ دوستوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں
رہائش پذیر تھا۔ میں تمہیں وہیں لے چلوں گا۔ امید ہے کہ تمہارے رہنے کا مناسب
بندوبست ہو جائے گا۔ ابھی تم کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہماری چھٹی
ٹائم ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں اپنے ساتھ سیدھا وہیں لے چلوں گا۔"

اکرام کی بات سن کر مجھے کچھ امید بندھ گئی تھی اس لئے میں اس کے پاس ہی کرسی
بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کے پاس چند گاہک بھی آ گئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ حساب
کتاب میں لگ گیا تھا۔ مجھے ایک گھنٹہ انتظار کرنا تھا جبکہ انتظار کی ایک ایک گھڑی مجھ
بھاری گزر رہی تھی۔ کیونکہ یوں تو وقت پَر لگا کر اُڑ جاتا ہے لیکن انتظار کی گھڑیاں کاٹے
نہیں کٹتیں۔ مگر وقت کبھی کہاں ٹھہرتا ہے۔ یہ تو گزر جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے گزرنے
احساس بھی نہیں ہوتا اور کبھی کبھی یہی وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

خدا خدا کر کے اکرام کی چھٹی کا وقت ہوا۔ اس نے تمام کیش گن کر تجوری میں بند
اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنے تاخیر سے گھر پہنچنے
اطلاع بذریعہ فون گھر دے دے تا کہ اس کے دیر سے گھر پہنچنے تک اس کی بیوی انتظار
میں ہی نہ بیٹھی رہے۔ اس نے اپنے گھر کا نمبر گھمایا اور اپنے تاخیر سے گھر پہنچنے کی اطلاع
دے دی۔

ہم دونوں ڈیپارٹمنٹل سٹور سے باہر نکل آئے۔ وہاں اکرام کی موٹر سائیکل کھڑی تھی
اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور مجھے اپنے پیچھے بیٹھنے کو کہا۔ ہمیں اپنی مطلوبہ جگہ پہنچنے

میں آدھ گھنٹہ صرف ہوا۔ اکرام نے ایک عمارت کے سامنے موٹر سائیکل روک دی۔ پھر
ہم دونوں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک فلیٹ میں داخل ہو گئے جہاں چار لڑکوں نے ہمارا
پُرجوش استقبال کیا۔ اکرام ایک طویل مدت تک ان کے ساتھ رہتا رہا تھا۔ اب ایک
عرصے کے بعد وہ میرے ساتھ اس گھر میں آیا تھا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا
فلیٹ تھا جن میں وہ چاروں لڑکے رہائش پذیر تھے۔

ایک کمرے میں فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ہم سب وہیں بیٹھ گئے۔ اکرام نے
بیٹھتے ہی ان سے میرا تعارف کروایا اور میرے آنے کا سبب بیان کیا۔ وہ چاروں اکرام
کے پرانے دوست تھے اس لئے اس کی بات ٹال نہ سکے اور مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر
رضامند ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ان چاروں میں سے ایک لڑکا جس کا نام الیاس تھا، چائے بنا
لایا۔ ہم سب نے مل کر چائے پی اور ساتھ ساتھ گپ شپ بھی ہوتی رہی۔ اس دوران
میں زیادہ تر خاموشی اختیار کئے رہا جبکہ اکرام ان کے ساتھ محوِ گفتگو رہا۔ اکرام کو گھر پہنچنا
تھا اس لئے وہ اجازت لے کر وہاں سے نکل گیا اور جاتے ہوئے انہیں مزید تاکید کر گیا
کہ وہ میرا ہر طرح سے خیال رکھیں اور کسی بھی طرح کی کوئی تکلیف نہ ہونے دیں۔

جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہ الیاس اور غفور کے استعمال میں تھا جبکہ دوسرے
کمرے میں جبار اور تنویر رہتے تھے۔ انہی کے ساتھ مجھے بھی رہنے کو جگہ مل گئی۔ اسی
کمرے میں بیٹھے بیٹھے ان چاروں نے مل کر سبزی وغیرہ تیار کی اور پھر غفور سبزی پکانے
کچن میں چلا گیا۔ وہ کھانا تیار کرنے لگا اور الیاس تندور سے روٹی لینے نکل گیا۔ اس کے
آنے تک جبار نے چٹائی پر ہی دستر خوان بچھا دیا اور پلیٹیں وغیرہ لا کر رکھ دیں جبکہ پانی کا
جگ اور گلاس تنویر نے لا کر رکھ دیا۔

کھانا تیار ہوا تو ہم سب نے مل کر کھایا۔ پھر کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں
اور آپس میں ایک دوسرے سے تعارف بھی ہوا۔ وہ چاروں ہی تعلیم یافتہ تھے اور مختلف
محکموں میں فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سب لوگ اپنی اپنی جگہ
پر لیٹ گئے۔ میں بھی جبار اور تنویر کے پاس ہی ایک طرف ہو کر لیٹ گیا۔

وہ دونوں لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے جبکہ میری آنکھوں سے نیند میلوں دور تھی۔ گزرا ہوا
وقت کسی فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں نے اپنی مختصر سی زندگی میں کس

قدر کٹھن اور مشکل حالات دیکھ لئے تھے۔ ماں کی موت کے بعد میں ابا اور بھائیوں کو تو چھوڑ آیا تھا لیکن شیخ جی جیسے رحم دل اور اچھے انسان نے میرے سر پر دستِ شفقت رکھا تو میں اُجڑنے کے باوجود بھی خود کو خوش قسمت سمجھنے لگا۔ لیکن حالات نے مجھے پھر دربدر ہونے پر مجبور کر دیا اور یوں ایک بار پھر میں ایک اجنبی ماحول میں انجانے لوگوں کے درمیان آ پہنچا تھا۔ شاید ٹھوکریں کھانا ہی میرا نصیب بن چکا تھا۔ میں اس بات سے بے خبر تھا کہ حالات کا طوفان مجھے کس طرف بہا لے جائے گا۔ میری کشتی کسی کنارے لگ پائے گی یا یونہی راستے کی رکاوٹوں سے ٹکراتے ہوئے پاش پاش ہو جائے گی۔ اسی ادھیڑ بن میں رات بیت گئی۔

وہ رات میری زندگی کی ایسی رات تھی جو میں نے انگاروں پر لیٹ کر گزاری۔ صبح ہوئی تو جبار اور تنویر کے ساتھ میں بھی اٹھ بیٹھا۔ الیاس اور غفور بھی بیدار ہو گئے تھے۔ ان سب نے مل کر ناشتہ تیار کیا اور پھر ناشتے کے بعد مجھے ضروری ہدایات دے کر فلیٹ کی چابی میرے حوالے کی اور اپنے اپنے دفتر کی راہ لی۔

اب ایک بار پھر فلیٹ میں، میں تھا اور میری تنہائی تھی۔ ہر طرف اُداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں اس قدر مایوس تھا کہ جی چاہا کہ فلیٹ کی دیواروں سے سر ٹکرا کر اپنی جان دے دوں۔ لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں تھا۔ کیونکہ خود کو موت کے حوالے کرنا بھی بڑے حوصلے کا کام ہے۔ میں شام تک فلیٹ میں قید رہا۔ شام کو ایک ایک کر کے وہ چاروں بھی آ گئے اور کچھ دیر آرام کے بعد کھانے پکانے میں مصروف ہو گئے۔ میں کچھ دیر تک تنہا کمرے میں بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر ان کے پاس ہی کچن میں جا پہنچا۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے ایسا ماحول نہیں دیکھا تھا۔ وہ چاروں اپنے اپنے کاموں میں مصروف مجھے کس قدر عظیم انسان دکھائی دے رہے تھے جو اپنے اہل خانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنے اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور گھر بار چھوڑ کر روزی کی تلاش میں آئے ہوئے تھے۔

♦ ...... ♦

وقت کا پنچھی پَر لگا کر اُڑنے لگا اور مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ فلیٹ کے کرائے کی ادائیگی بھی کرنا تھی اور دیگر اخراجات کے لئے اپنا حصہ بھی دینا تھا مگر میں بے سروسامانی کے عالم میں شیخ جی کے گھر سے نکلا تھا اور اس ایک ماہ کے دوران میں نے کوئی ڈھنگ کا کام بھی نہیں کیا تھا جس سے کوئی معقول آمدن ہو جاتی۔ میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی لیکن ان لوگوں نے باتوں ہی باتوں میں کئی بار مجھے یہ احساس دلا دیا تھا کہ مجھ پر فلیٹ کا کرایہ اور دیگر اخراجات واجب الادا ہیں۔ گو کہ اکرام کا دوست ہونے کی وجہ سے انہوں نے کبھی واضح الفاظ میں تو نہیں کہا تھا مگر دبے الفاظ میں کئی بار وہ اپنے دل کی بات کہہ چکے تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھے کیونکہ وہ سبھی ایسی ملازمتوں پر تھے جہاں سے اپنے گھر والوں کو رقم بھجوانے کے بعد ان کے پاس بمشکل ہی اتنی رقم بچتی تھی جس سے وہ کسی نہ کسی طرح کھینچا تانی کر کے وقت نکال لیتے تھے۔

میرے پاس تعلیم تھی نہ سفارش اور نہ ہی کوئی ذریعہ آمدن لیکن کچھ تو کرنا تھا۔ مگر کرتا تو کیا کرتا......؟ اسی سوچ بچار میں ایک ماہ اور گزر گیا۔ فلیٹ کا کرایہ اور دیگر اخراجات ادا کرنا تھے۔ الیاس نے مجھے علیحدگی میں بلا کر دریافت کیا کہ تم اپنے حصے میں آنے والے ماہانہ اخراجات ادا کیوں نہیں کرتے؟ میں اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بول پڑا۔ ”یوں گردن جھکائے کھڑے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اپنے حصے کی رقم تو تمہیں ادا کرنا ہی ہو گی۔“

”میں جانتا ہوں......لیکن فی الحال میرے حالات اور جیب اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ویسے بھی آپ جانتے ہی ہیں کہ میں پچھلے دو ماہ سے بیکار بیٹھا ہوں۔ جیسے ہی مجھے کوئی کام ملے گا اور آمدن ہو گی، میں اپنے حصے کی تمام رقم ادا کر دوں گا۔“

”دیکھو جمیل...... ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تمہیں دو ماہ ہو چکے ہیں اور یقیناً ہمارے

بارے میں تم اچھی طرح جان چکے ہو گے۔ ہم یہاں مل جل کر جیسے تیسے گزارہ ہو رہا ہے، کرتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں جو تمہارے حصے کا خرچ اپنے لے سکے۔ اکرام ہمارا بھی دوست ہے اور ایک عرصے تک ہم ایک ساتھ رہے ہیں، اس کے دوست ہو اسی ناطے سے ہم اب تک خاموش رہے ہیں......"

"میں بھی چاہتا ہوں کہ میں تم لوگوں پر بوجھ نہ بنوں۔ آپ بے فکر رہیں، انشاءاللہ جلد کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔"

ہماری باتوں کے دوران تنویر اور جبار بھی آ پہنچے۔ ہمیں باتیں کرتا ہوا دیکھ کر تنویر نے سوال کیا۔ "کیوں بھئی...... کیا باتیں ہو رہی ہیں......؟"

"بس یار! یہ بیچارہ اپنی جگہ مجبور ہے اور ہماری اپنی مجبوریاں ہیں......" الیاس نے جواب دیا۔

"بھئی تم تو جانتے ہی ہو کہ اس طرح کی گول مول باتیں میری موٹی عقل میں نہیں آتیں۔ مجھے صاف صاف اور واضح الفاظ میں بتاؤ تاکہ میری سمجھ میں کچھ آ سکے۔" تنویر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ ہم تو اپنے اپنے دفتروں کو روانہ ہو جاتے ہیں اور شام کو تھکے ہارے گھر لوٹتے ہیں اور یہ شریف آدمی جمیل گھر میں بیکار پڑے سارا دن گزار دیتا ہے۔ اب ظاہر ہے ماہانہ اخراجات کی ادائیگی تو اس نے بھی کرنا ہے۔ لیکن دو ماہ گزر گئے اس نے اپنے حصے کی رقم ادا نہیں کی۔" الیاس نے تفصیل سے تنویر کو بتایا۔ الیاس کی بات سن کر تنویر میری طرف متوجہ ہوا اور پوچھا۔

"کیوں بھئی جمیل! کیا معاملہ ہے......؟"

"میں نے اپنے حصے میں آنے والی رقم کی ادائیگی سے کب انکار کیا ہے؟ میں کسی معقول ملازمت کی تلاش میں لگا ہوا ہوں۔ ہو سکے تو آپ لوگ بھی میرے لئے کوشش کریں۔ شاید کوئی بندوبست ہو جائے۔"

"ارے یار! ملازمت سے مجھے یاد آیا، میرا ایک دوست نیاز پراپرٹی کا کام کرتا ہے۔ اسے ایک فیلڈ اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ اگر تم کہو تو اس سے تمہارے لئے بات کروں؟"

"دیکھ لیں، اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"اچھا تم ایسا کرو اپنی میٹرک یا ایف اے کی سند فوٹو کاپی کروا کر مجھے دے دو تاکہ میں تمہارے لئے اس سے بات کر سکوں۔"

"لیکن...... میں نے تو...... میٹرک بھی نہیں کیا ہوا......" میں نے گردن جھکا کر کہا۔

"اچھا تو یہ بات ہے...... پھر کیا کیا جائے...... اسے تو کم از کم میٹرک پاس لڑکا درکار ہے۔" تنویر نے تشویش ظاہر کی۔

ہماری باتوں کے دوران جبار خاموش بیٹھا رہا تھا لیکن تنویر کی بات سن کر بول پڑا۔

"ارے یار! میٹرک کی سند چاہئے ناں...... یہ تو میرے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے...... بس جمیل! تم تیاری کرو۔ سمجھو تمہارا کام ہو گیا...... لیکن...... دیکھ لو، سند حاصل کرنے میں جو خرچ آئے گا فی الحال تو میں جیسے تیسے پکڑ دھکڑ کر ادا کر دوں گا لیکن تمہاری طرف میرا یہ ادھار رہے گا۔ ملازم ہونے کے بعد مجھے ادا کر دینا۔"

جبار کی بات سن تو مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے حامی بھر لی۔

ٹھیک تیسرے روز میٹرک کی سند میرے ہاتھ میں تھی۔ سند میرے سامنے تھی مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی امتحان بھی نہ دے اور کامیابی کی سند اس کے ہاتھ لگ جائے۔ لیکن یہ کوئی خواب نہ تھا ایک ایسی حقیقت تھی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے درخواست لکھ کر سند کی فوٹو کاپی کے ہمراہ تنویر کے حوالے کر دی۔ تنویر دفتر جاتے ہوئے درخواست اپنے ہمراہ لے گیا۔ وہ شام کو لوٹا تو اس نے مجھے ملازمت مل جانے کی نوید سنائی۔ ملازمت ملنے کی خبر سنتے ہی میں خوشی سے جھوم اٹھا۔

اگلی صبح تنویر مجھے اپنے ہمراہ پراپرٹی ڈیلر کے پاس لے گیا۔ نیاز صاحب نے ایک دو رسمی سوالات کے بعد مجھے بطور فیلڈ اسسٹنٹ ملازم رکھ لیا۔ پندرہ سو روپے ماہانہ تنخواہ اور دوپہر کے کھانے کے علاوہ کسی بھی پلاٹ، دُکان یا مکان وغیرہ کا سودا طے کروانے پر ایک ہزار روپے کمیشن مقرر ہوا۔ تنویر کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا، پھر مجھے ضروری ہدایات دے کر وہاں سے چلا گیا۔ کیونکہ وہ کافی لیٹ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دفتر پہنچنا تھا۔

میرے علاوہ وہاں ایک اور لڑکا گوہر بھی فیلڈ اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ پچھلے تین سال سے وہاں ملازم تھا۔ نیاز صاحب کی عمر لگ بھگ پچاس برس ہو گی۔ وہ

انتہائی خوش اخلاق اور ملنسار دکھائی دیتے تھے۔ دو کمروں پر مشتمل پراپرٹی ڈیلر کا دفتر نیاز صاحب کی ذاتی ملکیت تھی۔ دونوں کمرے آگے پیچھے تھے۔ آگے والے کمرے میں کرسیاں، میز اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ نیاز صاحب کا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ پچھلے کمرے میں بھی صوفے پڑے تھے۔ کبھی کسی پارٹی سے علیحدگی میں بات کرنا ہوتا تو وہ وہاں جا بیٹھتے۔ اسی کمرے میں باتھ روم تھا اور ایک طرف چھوٹا سا کچن بھی رکھا تھا۔

دوپہر ہوئی تو نیاز صاحب نے مجھے دس روپے دیئے تاکہ میں باہر جا کر کھانا کھا آؤں۔ میں نے دس روپے کا نوٹ لے کر جیب میں ڈال لیا اور اِدھر اُدھر گھوم پھر کر پندرہ بیس منٹ بعد بغیر کچھ کھائے واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت نیاز صاحب کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے اور گوہر میز سے برتن اٹھا رہا تھا۔

صبح سے شام ہو گئی۔ اس دوران کئی افراد خرید و فروخت کے سلسلے میں وہاں آئے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ ایک دو بار کسی پارٹی کو پلاٹ دکھانے کے سلسلے میں نیاز صاحب خود اٹھ کر گئے اور ایک دو بار انہوں نے گوہر کو پارٹی کے ساتھ روانہ کیا۔ رات آٹھ بجے دفتر بند ہو گیا اور میں نے گھر کی راہ لی۔ وہاں سے میری رہائش زیادہ دور نہیں تھی۔ مجھے اپنے فلیٹ تک پہنچنے میں بیس منٹ لگے۔

گھر پہنچا تو وہاں میرے چاروں ساتھی موجود تھے۔ میری ملازمت کا پہلا دن تھا اور میں صبح کا گیا رات کو لوٹا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چاروں کھل اٹھے اور میرا پُر جوش استقبال کیا۔

”وہ ہمارا شہزادہ آ گیا بھئی......“ الیاس نے آواز لگائی۔

”پیچھے پیچھے ہٹ جائیں بھئی۔ آج ہمارا یار تھکا ہارا ہو گا......“ جبار نے بات کی۔

وہ چاروں چٹائی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے میرے لئے جگہ بنا دی اور میں بھی جوتے ایک طرف اتار کر مسکراتا ہوا ان کے پاس ہی چٹائی پر جا بیٹھا۔

”کہو، کیسا دن گزرا...... کسی قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا......؟“ تنویر نے سوال کیا۔

”نہیں...... مسئلہ کیا ہونا تھا...... بس آج تو سارا دن فارغ ہی بیٹھا رہا ہوں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”اچھا باتیں تو بعد میں بھی ہو جائیں گی...... یقیناً تمہیں بھوک لگی ہوئی ہو گی...... ہم سب تو کھانا کھا چکے ہیں۔ تمہارے لئے کچن میں کھانا پڑا ہے۔ پہلے جا کر کھانا کھاؤ، پھر سکون سے دن بھر کی روداد سنانا۔“

بھوک سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ الیاس نے کھانا کھانے کی بات کی تو میری بھوک اور بھی چمک اٹھی۔ میں فوراً وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور کچن میں جا کر کھانا کھایا۔ میں نے دوپہر کو کھانا نہ کھا کر دس روپے بچا کر جیب میں تو ڈال لئے تھے لیکن رات تک کافی نڈھال ہو گیا تھا۔ کھانا کھانے سے میرے جسم میں جان پڑ گئی۔ کچھ دیر پہلے تک ان لوگوں کی باتیں مجھے ذرا اچھی نہیں لگ رہی تھیں مگر پیٹ کی آگ بجھی تو ان کی باتیں بھی پیاری لگنے لگیں۔

ملازمت ملنے پر میں اس قدر خوش تھا کہ خوشی میں کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں سوچنے کے بعد آنکھ لگ گئی۔ وہ چاروں ہی سرکاری ملازم تھے۔ انہیں ڈیوٹی پر جانے کے لئے صبح جلدی ہی گھر سے نکلنا پڑتا تھا۔ وہ اٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنے اپنے دفتروں کو روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے برتن وغیرہ دھوئے اور تیار ہو کر ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔

دفتر دس بجے کھلتا تھا۔ ابھی دس بجنے میں بیس منٹ باقی تھے کہ میں وہاں پہنچ گیا۔ دفتر بند پڑا تھا۔ ابھی تک وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ میں وہیں کھڑا ان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک دس بجے نیاز صاحب کی گاڑی دفتر کے دروازے پر آ کر رکی۔ انہوں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور دفتر کی چابیاں مجھے پکڑا دیں تاکہ میں تالے کھول سکوں۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو نیاز صاحب نے جھاڑو میرے ہاتھ میں تھما دی اور دفتر میں جھاڑو دینے کو کہا۔ وہ خود باہر جا کر کھڑے ہو گئے اور میں وہاں جھاڑو دینے لگا۔ میں ابھی جھاڑو دے رہا تھا کہ گوہر بھی آ پہنچا اور باہر ہی نیاز صاحب کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جھاڑو دے کر فارغ ہوا تو گوہر اندر آ گیا اور دراز میں سے ایک کپڑا نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اس کپڑے سے صوفے، میز اور کرسیوں پر پڑی ہوئی مٹی کو اچھی طرح صاف کر دوں۔ گو کہ یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ جھاڑو اور ڈسٹر نیاز صاحب کے ہاتھ میں پکڑاؤں اور وہاں سے بھاگ جاؤں۔ لیکن بعض

اوقات کچھ پانے کے لئے اپنے ضمیر کو بھی تھپکیاں دینی پڑ جاتی ہیں۔ میں نے بھی اپنے ضمیر کو سمجھا بجھا کر سلا دیا اور کام میں لگ گیا۔ مجھے اس کام میں تقریباً دس منٹ لگے۔ میرے فارغ ہوتے ہی نیاز صاحب اور گوہر اپنی اپنی سیٹوں پر آ بیٹھے۔ ان کے بیٹھتے ہی میں بھی ہاتھ منہ دھو کر ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد نیاز صاحب نے مجھے بلا کر اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھا لیا اور کام وغیرہ کے متعلق بتانے لگے۔ میں نے ان کی تمام باتیں بغور سنیں اور انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میں اس ماحول کا عادی ہوتا چلا گیا اور دفتر پہنچتے ہی کسی مشین کی طرح اپنے کاموں میں لگ جاتا۔ دن بھر وہاں آنے والے مہمانوں کی چائے پانی سے خاطر تواضع کرتا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر نیاز صاحب کے اگلے اشارے کا منتظر رہتا اور رات کو چھٹی سے قبل ان کی گاڑی کو صاف کر دیتا۔

مجھے فیلڈ میں کام کرنے کے لئے ملازم رکھا گیا تھا لیکن اب تک مجھ سے چپڑاسی کا کام لیا جا رہا تھا۔ یہ شاید میرے ساتھ ہی ایسا ہو رہا تھا یا پھر شاید پرائیویٹ دفاتر میں کام کرنے والے سبھی ملازمین کے ساتھ اسی قسم کا رویہ روا رکھا جاتا ہو۔ یوں بھی مجھے پراپرٹی کے کام کا ابھی تک کوئی تجربہ نہ تھا جبکہ گوہر تجربہ کار تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ گوہر کو فیلڈ کے کاموں کے علاوہ کسی دیگر کام کے لئے نہیں کہا جاتا تھا بلکہ وہ بھی جب کبھی دفتر میں موجود ہوتا، نیاز صاحب اسے بھی چھوٹے موٹے کاموں میں لگائے رکھتے۔ کبھی اسے جالے صاف کرنے پر لگا دیتے، کبھی اس سے دفتر کے شیشے صاف کرواتے اور کبھی کبھار زیادہ تھکے ہوئے ہوتے تو اس سے کرسی پر بیٹھے کندھے اور بازو بھی دبوا لیتے۔

مجھے نیاز صاحب کے ہاں ملازم ہوئے بیس دن ہو گئے تھے۔ میں نے جھاڑ پونچھ اور چائے پانی پلانے سے آگے کچھ نہیں کیا تھا۔ میں اور نیاز صاحب تنہا بیٹھے تھے۔ نیاز صاحب نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا۔

”جمیل! تمہیں سائیکل چلانی آتی ہے......؟“

میں نیاز صاحب کے اچانک سوال کرنے پر حیران ہو گیا۔ مگر سوال تو سیدھا سادہ تھا پریشان ہونے والی کیا بات تھی۔ ”جی نیاز صاحب...... سائیکل تو بڑی اچھی طرح چلا لیتا

ہوں۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ویری گڈ...... تو پھر ایسا کرو میں تمہیں اپنے گھر کا پتہ بتا دیتا ہوں اور گھر فون بھی کر دیتا ہوں...... وہاں گھر میں سائیکل پڑی ہے، وہ لے آؤ۔“ نیاز صاحب نے بات کی مگر کچھ سوچ کر خود ہی بولے۔ ”اچھا چلو ابھی رہنے دو...... تم کہاں پریشان ہوتے پھرو گے۔ رات کو دفتر بند کرنے کے بعد میرے ساتھ ہی چلنا۔ گھر بھی دیکھ لینا اور سائیکل بھی لے آنا...... وہ سائیکل تمہارے پاس ہی رہے گی۔“

”ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کا حکم۔“

”خوش تو ہو ناں......؟“

”کیوں نہیں سر...... بہت خوش ہوں میں۔“

رات کو دفتر بند ہوا تو میں نیاز صاحب کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ان کا گھر دفتر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ انہوں نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی۔ وہیں ایک کونے میں سائیکل کھڑی تھی جس پر مٹی اور گرد و غبار کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔

”لو بھئی جمیل...... یہ ہے تمہاری سائیکل...... کل سے تم اسی پر دفتر آیا جایا کرو گے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں کوئی پرانی سائیکل دے رہا ہوں۔ یہ بالکل نئی سائیکل ہے۔ چند دنوں سے یہیں کھڑی ہے اس لئے اس پر مٹی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں سے کوئی کپڑا وغیرہ لے کر اسے صاف کر لو اور راستے میں جاتے ہوئے ہوا بھروا لینا۔“

میں نے گاڑی میں سے ہی ڈسٹر نکالا اور سائیکل کو اچھی طرح صاف کر دیا۔ نیاز صاحب کی بات درست تھی۔ سائیکل واقعی نئی تھی۔ میں نے سائیکل لی اور نیاز صاحب کو خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔ سائیکل کے دونوں پہیوں میں ہوا کافی کم تھی اس لئے سائیکل چلانے میں بہت زور لگ رہا تھا۔ میں نے راستے میں سائیکل والے کی دکان پر رک کر ہوا بھروائی اور گھر کی طرف چل پڑا۔

میں بہت خوش تھا۔ ایک عرصے کے بعد سائیکل چلانے کو ملی تھی۔ گاؤں میں تھا تو سکول آنے جانے کے لئے سائیکل ہی استعمال کرتا تھا۔ جب سے گاؤں سے نکلا تھا تب سے مجھے اپنی سائیکل نصیب نہیں ہوئی تھی۔ شیخ جی کے دفتر کھانا دینے کے لئے بھی چوکیدار کی سائیکل مانگ کر لے جانا پڑتی تھی۔ نیاز صاحب نے مہربانی فرما کر مجھے ایک

بار پھر سائیکل والا بنا دیا تھا۔ میں تیز تیز پیڈل مارتا ہوا جھومتا لہراتا گھر جا پہنچا۔ ہمارا
عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ نیچے سائیکل کھڑی کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چوری کا
تھا۔ اِس لئے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ سیڑھیوں کے راستے اپنے ساتھ سائیکل بھی
کمرے میں لے چلوں۔ کم از کم سائیکل نظروں کے سامنے تو رہے گی۔

میں نے سائیکل کندھے پر اٹھالی اور جیسے تیسے ہانپتا کانپتا اور گرتا پڑتا اپنے فلیٹ
پہنچ گیا۔ دروازہ کھولا تو میرے چاروں ساتھی کمرے میں چٹائی پر بیٹھے لڈو کھیل ر
تھے۔ چونکہ وہ چاروں سرکاری ملازم تھے اس لئے جلد ہی گھر لوٹ آتے تھے اور کھا
وغیرہ سے فارغ ہوکر وقت گزاری کے لئے کسی روز کیرم بورڈ، کسی روز تاش اور کسی
لڈو کھیلنے لگتے۔ میں چونکہ پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھا اس لئے رات کو دیر سے ہی
لوٹتا تھا۔ فلیٹ میں داخل ہوا تو سائیکل میرے کندھوں پر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی
چھوٹ گئی۔ میں فوری طور پر یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ آیا وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے یا میر
کندھوں پر اٹھائی ہوئی سائیکل کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے سائیکل ایک طر
کھڑی کی اور اس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ چاروں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

''کیوں بھئی شہزادے...... سائیکل کہاں سے ماری ہے......؟'' تنویر نے سوال کیا۔

''نیاز صاحب نے دی ہے...... اور کہا ہے کہ اب یہ سائیکل تمہارے پاس ہی ر
گی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''واہ بھئی واہ...... تمہارے تو مزے ہوگئے۔'' الیاس نے بات کی۔

''بس نیاز صاحب کی مہربانی ہے...... اب یہ ہے کہ آنے جانے میں آسانی ر
ورنہ پیدل آنا جانا پڑتا تھا۔''

''لیکن شریف آدمی...... بھلا سائیکل اوپر فلیٹ میں لانے کی کیا ضرورت تھی......
طرح تو روزانہ سائیکل لانے لے جانے میں ہی تم خرچ ہو جاؤ گے...... نیچے دن را
ڈیوٹی پر چوکیدار موجود ہوتا ہے، تم اس کے حوالے کر آتے...... اس بلڈنگ میں رہا
پذیر تمام لوگوں کی سائیکلیں، موٹر سائیکلیں اور کاریں اسی کی نگرانی میں کھڑی
ہیں......'' الیاس نے سمجھایا۔

''مجھے اس بات کا علم نہیں تھا ورنہ میں بھی سائیکل وہیں کھڑی کر آتا۔'' میں نے

لاعلمی کا اظہار کیا۔

''خیر کوئی بات نہیں...... آج تو تم جیسے تیسے سائیکل اوپر لے ہی آئے ہو، کل سے
وہیں کھڑی کر دیا کرنا۔'' الیاس نے تاکید کی۔

میں اس معاملے میں خوش قسمت تھا کہ مجھے ہر جگہ اچھے لوگوں سے واسطہ پڑا اور میں
ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رہا۔ شیخ جی کے بعد یہ چاروں بھی میرے ساتھ ہمدردانہ رویہ
رکھتے تھے۔ میں دن بھر کا تھکا ہارا گھر لوٹتا تو وہ چاروں کھانا کھا چکے ہوتے اور میرے
لئے کھانا رکھا ہوتا تھا۔ وہ سب مل جل کر کام کرتے تھے اور میں اپنے حصے کا کام صبح روانگی
سے قبل ہی کر جاتا تاکہ ان کے دل میں کہیں یہ بات نہ آجائے کہ میں گھر کے کاموں
میں ان کا ہاتھ نہیں بٹاتا۔

نیاز صاحب نے گوہر کو موٹر سائیکل دے رکھی تھی جبکہ اب مجھے سائیکل دے دی تھی۔
دفتر آنے جانے کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے کاموں کے سلسلے میں مجھے کہیں جانا پڑتا تو
سائیکل پر ہی جاتا تھا۔ اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔ تین تاریخ کو نیاز صاحب نے تنخواہ
کے پندرہ سو روپے ادا کر دیئے۔ اس ماہ کے دوران میرے ذریعے کوئی سودا طے نہیں پایا
تھا اس لئے کمیشن کے طور پر میرے حصے میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی میں ابھی جائیداد
کی خرید و فروخت کے سلسلے میں بالکل اناڑی تھا۔ پھر بھی اپنی پہلی تنخواہ کے پندرہ سو
روپے پاکر بھی خوش تھا۔

چونکہ گھر کے تمام اخراجات کا حساب الیاس کے پاس ہی ہوتا تھا اس لئے میں نے
گھر پہنچتے ہی ساری کی ساری رقم اس کے حوالے کر دی تاکہ پچھلے تین ماہ سے فلیٹ کے
کرائے اور دیگر اخراجات کے لئے میرے حصے میں آنے والی رقم کا کچھ حصہ تو ادا ہو
سکے۔ مجھے معلوم تھا کہ جبار کو بھی اس بات کا انتظار ہوگا کہ میٹرک کی سند کے لئے اس
نے جو رقم ادا کی تھی، میں تنخواہ ملنے پر کچھ نہ کچھ اسے لوٹا دوں گا۔ لیکن الیاس کو پندرہ سو
روپے دینے کے بعد میرے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ میں نے جبار سے معذرت کر لی اور
وعدہ کیا کہ جلد ہی جیسے تیسے اس کی رقم بھی ادا کر دوں گا۔ اسے بھی میری مجبوری کا علم تھا
اس لئے خاموش ہوگیا۔ یوں بھی اب ہم پانچوں ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی
تھے اور ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے کی مجبوریوں کو بھی اچھی طرح جانتے اور سمجھتے

تھے۔

نیاز صاحب وقت کے سختی سے پابند تھے۔ میری بھرپور کوشش ہوتی کہ میں وقت سے چند منٹ پہلے ہی دفتر جا پہنچوں۔ اکثر مجھے نیاز صاحب کے انتظار میں کھڑے رہنا پڑتا۔ اور کبھی کبھار اگر میں چند منٹ لیٹ ہو جاتا تو نیاز صاحب دفتر کھول چکے ہوتے۔ روز کی طرح دفتر کھلا تو گوہر کسی زمین کی رجسٹری کے متعلق معلوم کرنے کے لئے کہیں چلا گیا اور میں صفائی اور جھاڑ پونچھ میں لگ گیا۔ ابھی فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک نئے ماڈل کی کار دفتر کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے تین شخص نکل کر اندر آ گئے۔ میں ایک طرف بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ نیاز صاحب سے سلام دعا لے کر ان کے سامنے ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی نیاز صاحب نے مجھے چائے لانے کو کہا۔ نیاز صاحب کا حکم سنتے ہی میں چائے بنانے کے لئے کچن میں چلا گیا اور وہ گپ شپ کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد میں نے چائے کے کپ ان تینوں کے سامنے رکھ دیئے اور ایک کپ نیاز صاحب کو دے دیا۔ انہیں چائے دینے کے بعد میں واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور ان کی باتیں سننے لگا۔ وہ لوگ مین بازار میں کوئی ایسی جگہ خریدنا چاہتے تھے جہاں فرنٹ پر دُکانیں بنی ہوئی ہوں اور ان کے پیچھے رہائش بھی ہو۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے گئے۔ نیاز صاحب نے ان کے فون نمبر وغیرہ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لئے اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ ایک دو روز میں ہی ان کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نیاز صاحب نے انہیں رخصت کیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ انہیں جس طرح کی جگہ درکار تھی ویسی ہی جگہ کا بورڈ میں نے راستے میں آتے ہوئے پڑھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں ایک دم اُچھل پڑا۔

"نیاز صاحب...... یہ جو لوگ ابھی آئے تھے انہیں ایسی جگہ ہی چاہئے ناں جہاں آگے دُکانیں ہوں اور پیچھے رہائش بھی رکھی جا سکتی ہو......؟"

"ہاں...... انہیں ایسی ہی جگہ چاہئے...... کوئی ایسی جگہ ہے تمہارے علم میں؟"

"مجھے کچھ زیادہ معلومات تو نہیں لیکن آج ہی آتے ہوئے ایک جگہ تین دُکانیں مکان برائے فوری فروخت کا بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا۔"

میری بات سن کر نیاز صاحب کو امید کی کرن نظر آئی اور فوراً بولے۔ "اچھا تم ایسا کرو...... ابھی وہاں جاؤ اور مکمل معلومات لے کر آؤ...... اگر کوئی بات بنتی نظر آئی تو پھر میں خود تمہارے ساتھ چل کر جگہ دیکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں ابھی جاتا ہوں۔"

بات کرتے ہی میں نے سائیکل اٹھائی اور اس طرف چل پڑا جہاں جائیداد برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا۔ وہاں پہنچنے میں مجھے بمشکل پانچ منٹ لگے۔ دُکانیں خالی تھیں اور ان کے شٹر اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی دروازہ تھا جس پر گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دو تین بار گھنٹی بجائی تو اندر سے ایک خاتون آئی اور مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "کس سے ملنا ہے......؟"

"جی دراصل میں یہ بورڈ پڑھ کر حاضر ہوا تھا......" میں نے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ خاتون پڑھی لکھی اور سمجھدار دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے پیار سے بولی۔

"بیٹا! اس وقت تو سب مرد اپنے اپنے کام پر نکلے ہوئے ہیں۔ گھر میں کوئی نہیں۔ تم ایسا کرو شام سات بجے کے بعد کسی بھی وقت آ جاؤ۔ وہ تمہیں گھر میں مل جائیں گے اور وہی تمہیں اس سلسلے میں اچھی طرح بتا سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے آنٹی! وہ آئیں تو انہیں بتا دیجئے گا۔ میں تقریباً آٹھ بجے رات کو پھر آؤں گا۔"

"اچھا بیٹا! بتا دوں گی۔" یہ کہتے ہی خاتون نے دروازہ بند کر لیا اور میں واپس دفتر چل پڑا۔ وہاں سے چلنے سے پہلے میں نے اپنے طور پر سرسری سا جائزہ لے لیا تا کہ نیاز صاحب پوچھیں تو انہیں بتا سکوں۔

دفتر پہنچا تو نیاز صاحب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں سائیکل کھڑی کر کے ابھی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا کہ وہ فوراً بول پڑے۔ "ہاں بھئی جمیل! سناؤ کیا رپورٹ لائے ہو؟"

"میں اپنے طور پر وہاں کا جائزہ تو لے آیا ہوں لیکن اس وقت گھر میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جو مکمل معلومات فراہم کر سکتا۔ اس لئے رات کو پھر جانا پڑے گا۔"

"تمہارے حساب سے کتنی جگہ ہو گی......؟"

"تین دکانیں ہیں جو خالی پڑی ہیں۔ ان کے ساتھ بڑا گیٹ لگا ہوا ہے جہاں رہائش کے لئے جگہ ہے...... میرے خیال میں تقریباً دس مرلے جگہ تو ہو گی۔"

میری بات سن کر نیاز صاحب اپنے طور پر جگہ کی مالیت کا اندازہ لگانے لگے اور میں پانی پینے کچن میں چلا گیا۔ رات کو چھٹی ہونے تک نیاز صاحب نے طوطے کی طرح مجھے وہ تمام سوالات یاد کروا دیئے تھے جو مجھے تمام معلومات حاصل کرنے کے لئے ان سے کرنے تھے۔

دفتر بند ہوا تو میں ایک بار پھر وہیں جا پہنچا جہاں تین دکانیں بمعہ رہائش برائے فوری فروخت کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ گھنٹی بجانے پر جس شخص نے دروازہ کھولا، وہ دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں فوراً بول پڑا۔

"میں آج صبح بھی آیا تھا۔ آپ گھر پر موجود نہیں تھے۔"

"ہاں بولو، کیا مسئلہ ہے؟" اس شخص نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"وہ جی...... میں اس جگہ کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں......"

میری بات سن کر اس شخص نے نیچے سے اوپر تک میرا جائزہ لیا اور بولا۔ "تم خریدو گے یہ جگہ......؟"

"دراصل پاس ہی ہمارا پراپرٹی ڈیلر کا دفتر ہے۔ شاید آپ نے سنا ہو، نیاز پراپرٹی ڈیلر۔ میں وہیں سے آیا ہوں۔ میں نے یہاں سے گزرتے ہوئے بورڈ دیکھا تھا۔ سوچا آپ سے پوچھ لوں۔"

"کوئی پارٹی ہے کیا نظر میں...... یا ایسے ہی پوچھنے آ گئے ہو؟"

"آپ پہلے مجھے اپنی ڈیمانڈ تو بتائیں، پارٹی بھی آ جائے گی۔"

"اچھا تم ایک منٹ یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ شخص یہ کہتا ہوا اندر چلا گیا اور میں وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو وہی شخص موجود تھا اور اس نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں اس کے ساتھ ہی گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے مجھے ڈرائنگ، ڈائننگ، کچن، سٹور، ٹی وی لاؤنج اور تمام بیڈ روم دکھائے۔ وہاں کا جائزہ لینے کے بعد ہم دونوں باہر نکل آئے۔

"ہم لوگوں نے بڑے شوق سے یہ جائیداد بنائی تھی لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے فروخت کرنا پڑ رہی ہے......" اس شخص نے دکھی لہجے میں بات کی۔

"ویسے آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے......؟" چلنے سے پہلے میں نے سوال کیا۔

"دیکھو برخوردار! مانگنے کو تو میں کچھ بھی مانگ لوں، مگر وہ تو مجھے نہیں مل سکتا۔ لیکن پھر بھی جگہ کی ویلیو کے لحاظ سے چالیس لاکھ سے کم کسی صورت میں بھی سودا طے نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے سر! آپ بے فکر رہیں۔ ہماری بھرپور کوشش ہو گی کہ سودا آپ کی مرضی کے مطابق طے پائے۔ اب مجھے اجازت دیں، کل پھر کسی وقت میں نیاز صاحب کو لے کر حاضر ہو جاؤں گا، تاکہ کسی کو دکھانے سے پہلے وہ بھی اپنی تسلی کر لیں۔"

"بہتر ہے آپ لوگ کل اسی وقت آ جائیں۔ کیونکہ دن کے وقت آپ آئیں گے تو میں گھر میں نہیں ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب! کل سات ساڑھے سات بجے ہم حاضر ہو جائیں گے۔"

اگلے روز میں وقت مقررہ سے پانچ منٹ پہلے ہی دفتر پہنچ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ نیاز صاحب دفتر میں موجود تھے۔

"سر خیریت؟ آج آپ وقت سے پہلے ہی دفتر آ بیٹھے؟" میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"ہاں یار! خیریت ہی ہے۔ بس رات کو ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ صبح بھی جلدی ہی آنکھ کھل گئی۔ اس لئے آٹھ بجے ہی دفتر آ گیا۔"

"خیر تو ہے ناں سر! کوئی پریشانی والی بات تو نہیں؟"

"نہیں نہیں...... ایسی پریشانی والی کوئی بات نہیں...... وہ دراصل میں رات بھر یہی سوچتا رہا کہ تم صبح کیا خبر لاتے ہو۔"

"ہاں سر! وہ میں گیا تھا۔ جگہ تو بہت مناسب ہے۔ لوگ ضرورت مند بھی ہیں۔ امید ہے بات بن جائے گی۔"

"کیا کہتے ہیں......؟"

"کیا کہنا ہے سر...... بس چالیس پینتالیس لاکھ کے درمیان سودا طے ہو جائے اور کیا......؟"

میری بات سن کر نیاز صاحب مجھ سے مختلف سوالات کرتے رہے اور میں ان کے جواب دیتا رہا۔ میری تمام بات سن کر انہوں نے ان لوگوں کا نمبر ملایا جو خریدنے کے لئے کہہ گئے تھے اور انہیں اگلے روز آنے کا کہہ دیا۔ رات کو میں اور نیاز صاحب دونوں وہاں گئے۔ نیاز صاحب نے جائیداد کے کاغذات چیک کئے اور اچھی طرح اپنی تسلی کی۔

اگلے روز خریدار آ گئے۔ انہوں نے جگہ دیکھی اور پسندیدگی کا اظہار کیا اور سودے بازی شروع ہو گئی۔ نیاز صاحب نے پچاس لاکھ ڈیمانڈ کی تھی۔ آخر کار تھکا دینے والی گفت وشنید کے بعد اُنتالیس لاکھ میں سودا طے پا گیا۔

نیاز صاحب نے طرفین سے طے کردہ کل رقم کا دو فیصد بطور کمیشن وصول کیا اور خوشی میں سب کو کڑاہی گوشت کھلایا اور بوتلیں پلائیں۔ جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو نیاز صاحب نے مجھے گلے لگا کر میرا ماتھا چوم لیا اور جیب سے دو ہزار روپے نکال کر میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولے۔ ”آج میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے میرے پاس آ کر پہلا ہی سودا طے کروایا ہے اور وہ بھی اتنا بڑا...... اسی لئے خوش ہو کر میں تمہیں ایک ہزار کی بجائے دو ہزار کمیشن دے رہا ہوں۔“

”یہ آپ کی حوصلہ افزائی ہے سر! ورنہ میں تو کسی قابل نہیں۔“

”نہیں نہیں...... یہ تمہارا حق ہے۔ یہ جیب میں ڈالو اور مزے کرو۔“ نیاز صاحب نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

نیاز صاحب کے کہنے پر میں نے رقم جیب میں ڈال لی۔ کمیشن کے طور پر ملنے والے دو ہزار روپے پا کر میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ میں نے کاغذ کے ان ٹکڑوں کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن وقت نے مجھے سکھا دیا تھا کہ کاغذ کے سرخ، سبز اور نیلے نوٹ زندگی گزارنے کے لئے کس قدر اہم ہیں۔ میں نے جان لیا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر یہ رنگ برنگے کاغذ جیب میں نہ ہوں تو انسان خود کو کس قدر بے بس و مجبور سمجھنے لگتا ہے۔ جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے میں نے کتنی ہی بار خود کو تسلیاں دی تھیں۔ راہ میں آتے جاتے کتنی ہی بار مختلف ہوٹلوں کے پاس سے گزرتے ہوئے انواع و اقسام کی خوشبو سونگھ کر ہی آگے گزر گیا تھا۔ میں نے فوراً پروگرام بنا لیا کہ آج اپنی پسند کی تمام چیزیں پیٹ بھر کر کھاؤں گا تا کہ اب تک جن چیزوں کی خوشبو سونگھی تھی، ان کا ذائقہ بھی

چکھ سکوں۔ ابھی میں دل میں یہ پروگرام طے کر رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ ابھی تو سر سے قرض کا بوجھ اتارنا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے تمام ارادے ملتوی کر دیئے اور ٹھنڈے پانی کا گلاس پی کر خاموشی سے بینچ پر بیٹھ گیا۔

مجھے جبار کے پانچ ہزار روپے ادا کرنا تھے۔ گھر پہنچتے ہی میں نے دو ہزار روپے اس کے حوالے کر دیئے اور باقی کے تین ہزار بھی جلد ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ جبار بھی میری مجبوریوں سے بخوبی آگاہ تھا اس لئے اس نے خاموشی سے دو ہزار روپے جیب میں ڈال لئے۔

کمیشن کے طور پر ملنے والے دو ہزار روپوں نے مجھ میں نئی روح پھونک دی تھی اور میرے جوش میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب میں آتے جاتے اپنی نظریں اور دماغ کھلا رکھتا تا کہ کہیں بھی برائے فروخت کا بورڈ دکھائی دے تو میں جلد از جلد تمام کوائف معلوم کر کے نیاز صاحب تک پہنچا دوں اور وہ کسی سے بات بڑھا سکیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی کو کسی بھی قسم کی جائیداد خریدنے میں دلچسپی ہوتی تو میں اسے فوراً نیاز صاحب کے پاس لے آتا۔ جائیداد کی خرید و فروخت کے معاملات بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ہونے میں آئیں تو دنوں میں کئی کئی سودے طے ہو جاتے ہیں اور نہ ہوں تو مہینہ دو مہینے کوئی سودا طے نہیں پاتا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مہینے کے باقی دن بھاگ دوڑ لگی رہی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ اس لئے صرف پندرہ سو روپے ہی ملے جو میں نے ایسے کے ایسے ہی الیاس کو دے دیئے تا کہ کچھ حساب بے باک ہو سکے۔

میں دو ماہ سے نیاز صاحب کے ہاں ملازمت کر رہا تھا مگر جیب خالی کی خالی تھی۔ دونوں ماہ کی تنخواہ پوری کی پوری الیاس کے حوالے کر دی تھی۔ یہ تو شکر ہے کہ مجھے سگریٹ نوشی کی عادت نہ تھی ورنہ میں ساری کی ساری تنخواہ کس طرح دے پاتا۔ اکثر اوقات نیاز صاحب کے گھر سے کھانا آتا تھا۔ ان کے کھانے کے بعد جو بچ جاتا، وہ میں اور گوہر کھا لیتے تھے۔ اگر کسی روز ان کے ہاں سے کھانا نہ آتا تو نیاز صاحب دس روپے مجھے اور پندرہ روپے گوہر کو دے دیتے تا کہ ہم دوپہر کا کھانا کھا لیں۔ اس روز میں بھوکا ہی رہتا اور کھانے کے پیسے بچا کر کسی مشکل وقت کے لئے رکھ لیتا۔ بچائے ہوئے وہ پیسے کبھی پنکچر کی نذر ہو جاتے اور کبھی کبھار کوئی چٹخاری چیز دیکھ کر مجھ سے رہا نہ جاتا اور

میں لے کر کھا لیتا۔

جن دنوں کوئی ڈیل ہو جاتی اور نیاز صاحب کا کمیشن بن جاتا، ان دنوں نیاز صاح
بہت مہربان ہو جاتے اور ان کے چہرے پر ہر دم مسکراہٹ بکھری نظر آتی۔ لیکن اگر
کچھ دن فراغت کے گزرتے تو ان کا لہجہ کرخت ہو جاتا اور بات بے بات ڈانٹ ڈپ
کرنے لگتے۔ ہر کام میں نقص نکالتے اور ہمیں انتہائی سست اور کاہل کہتے۔

ایک دو ماہ تک مایوسی چھائی رہی۔ پھر قدرت مہربان ہو گئی۔ میرے ذریعے اوپر
تین سودے طے ہوئے۔ نیاز صاحب نے تنخواہ کے علاوہ تین ہزار روپے بطور کمیش
کئے جو میں نے جبار کو دے کر اس کا قرض پورا کر دیا۔ اب میرے سر سے ہر طرح کا بو
اتر گیا تھا۔

میرے چاروں ساتھیوں کو ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا کر اپنے اہل خانہ کو بھجوانا ہوتا تھا جب
مجھ پر ایسی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ اس لئے ماہانہ اخراجات کی ادائیگی کے بعد میرے پا
کچھ نہ کچھ رقم بچ جاتی۔ اب میرا ذہن اس طرف سے مطمئن رہتا کہ اب میری جیب خا
نہیں۔ میں کسی روز دفتر سے واپسی پر کوئی نہ کوئی موسمی پھل لے آتا اور اپنے ساتھیوں ک
حوالے کر دیتا۔ میری اس عادت سے وہ بہت خوش ہوتے۔ کیونکہ گھر والوں کو رقم بھجوا
کے بعد ان کے پاس جو کچھ بچتا تھا اس سے بمشکل ہی ماہانہ اخراجات پورے ہو پا
موسمی پھل یا کوئی اور چیز انہیں کہاں نصیب ہوتی تھی۔

آہستہ آہستہ میرے حالات کچھ بہتر ہونے لگے۔ اب کبھی راستے میں آتے جا
مجھے اپنی پسند کی کوئی چیز دکھائی دے جاتی تو میں با آسانی خرید لیتا۔ رفتہ رفتہ میرے پ
اوڑھنے کا ڈھنگ بھی بدلنے لگا۔ گو کہ حالات بدل رہے تھے مگر اس کی رفتار بہت س
تھی۔ جبکہ میں بہت آگے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں نے جس قسم کے حالات دیکھ لئے
ان سے یہ جان چکا تھا کہ خالی جیب اور خالی پیٹ کوئی زندگی نہیں۔ میں نے اسی کی عز
ہوتے دیکھی تھی جس کے پاس دولت تھی۔

ایک وقت تھا کہ تنخواہ کے علاوہ کمیشن کے طور پر ملنے والی ہزار دو ہزار کی رقم پا کر م
ہواؤں میں اُڑنے لگتا تھا۔ مگر اب نہ جانے کیوں مجھے یہ رقم پا کر کوئی خاص خوشی نہ ہو
میری نظر میں کمیشن کے طور پر نیاز صاحب کو ملنے والی موٹی رقم کھٹکنے لگتی۔ میں سوچتا

محنت تو میں اور گوہر کرتے ہیں مگر اس کا سارے کا سارا پھل نیاز صاحب اکیلے ہی ہڑپ
کر جاتے ہیں جبکہ ہمارے حصے میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ پھر بھی یہ اپنے اپنے مقدر اور
نصیب کی بات تھی۔ میں اور زیادہ محنت کرنے لگتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر محنت کروں گا
تو مجھے کچھ رقم ہاتھ لگے گی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ملنے والی رقم میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ اضافہ ہو
جاتا۔

پراپرٹی کے لین دین کے سلسلے میں اکثر لوگوں سے میل ملاقات رہتی تھی۔ تھوڑے ہی
عرصے میں علاقے کے بہت سے لوگوں سے میری جان پہچان ہو گئی تھی۔ شاید یہ وجہ تھی یا
کوئی اور کہ اچانک مجھے سائیکل پر آنا جانا برا لگنے لگا۔ جانے کیوں راہ چلتے کسی واقف کار
سے سلام دعا ہو جاتی تو مجھے شرم محسوس ہوتی۔ اس لئے میں نے موٹر سائیکل خریدنے کا
پروگرام بنا لیا۔ میرے پاس کچھ رقم جمع تھی جس سے میں با آسانی کوئی سیکنڈ ہینڈ موٹر
سائیکل خرید سکتا تھا۔ میں نے ایک دو جاننے والوں سے بھی کہہ دیا کہ اگر کوئی اچھی
حالت میں موٹر سائیکل فروخت کر رہا ہو تو مجھے بتا دیں۔ مجھے سائیکل چلانا تو آتی ہی تھی،
گوہر سے کہہ کر چند دنوں میں موٹر سائیکل چلانا بھی سیکھ لی۔

میں دن بھر کا تھکا ہارا دفتر سے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں ایک دوست سے آمنا سامنا
ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بول پڑا۔ ''اچھا ہوا تم راستے میں ہی مل گئے۔ میں تمہاری طرف
ہی جا رہا تھا۔''

''خیر تو تھی......؟'' میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''ہاں یار! خیر ہی ہے۔ وہ تم نے موٹر سائیکل کے لئے ذکر کیا تھا ناں...... اس سلسلے
میں بات کرنے آیا تھا۔''

''کہو کیا کہتے ہو؟''

''میرے ایک دوست کو فوری طور پر کچھ رقم کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ وہ اپنی موٹر
سائیکل فروخت کر رہا ہے۔ اگر تمہارے پاس وقت ہے تو ابھی چلو، میں تمہیں دکھا دیتا
ہوں۔ اگر بات بن گئی تو خرید لینا ورنہ رہنے دینا۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں...... چلو ابھی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔''

جو شخص موٹر سائیکل فروخت کرنا چاہ رہا تھا ہم دونوں اس کے ہاں پہنچ گئے۔ موٹر

سائیکل دیکھتے ہی مجھے پسند آ گئی۔ وہ شخص واقعی ضرورت کے تحت اپنی موٹر سائیکل فروخت کر رہا تھا۔ چونکہ وہ ضرورت مند تھا اس لئے تھوڑی سی کوشش سے اٹھائیس ہزار روپے میں رضامند ہو گیا۔ گو کہ وہاں سے میرا گھر زیادہ دور نہیں تھا، میں با آسانی گھر سے فوری طور پر رقم لا سکتا تھا لیکن پھر بھی میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اگلے دن ادائیگی کروں تا کہ صبح دن کی روشنی میں ادائیگی سے پہلے ایک نظر موٹر سائیکل پر پھر مار لوں۔ یہ سوچ کر میں نے اسے اگلی صبح ادائیگی کا وعدہ کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر معمول کے مطابق اپنے ساتھیوں سے گپ شپ ہوتی رہی لیکن میں نے جان بوجھ کر موٹر سائیکل کے متعلق ذکر نہ کیا۔

رات بھر خواب میں خود کو موٹر سائیکل پر سوار ہوئے دیکھتا رہا۔ صبح ہوئی تو میں نے الماری میں سے اٹھائیس ہزار روپے نکال کر احتیاط سے جیب میں ڈال لئے اور وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے ہی گھر سے پیدل نکل پڑا۔ میں جان بوجھ کر سائیکل لے کر نہیں گیا تھا تا کہ کوئی پریشانی نہ ہو۔ میں اس شخص کے ہاں پہنچا تو وہ میرا منتظر تھا۔ میں نے ایک بار پھر موٹر سائیکل کا بغور جائزہ لے کر اپنی تسلی کر لی اور اٹھائیس ہزار کی رقم اس کے حوالے کر کے موٹر سائیکل کے کاغذات اور چابی لے لی۔ گو کہ میں نے موٹر سائیکل کے عوض اسے ادائیگی کی تھی لیکن چونکہ وہ ضرورت مند تھا اس لئے انتہائی شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

لین دین میں کچھ دیر لگ گئی۔ اس لئے دفتر پہنچا تو دفتر کھلا تھا اور نیاز صاحب اپنی سیٹ پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے موٹر سائیکل کھڑی کی تو ان کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے حیران کن نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ نیاز صاحب کوئی بات کرتے، میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام دعا کے بعد موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیسی ہے سر......؟“

”اچھی ہے...... کس کی ہے......؟“

”میری ہے سر...... آج ہی خریدی ہے۔“

”تمہاری......؟“

”جی سر...... اٹھائیس ہزار روپے کی لی ہے...... مہنگی تو نہیں لے لی......؟“

”اٹھائیس ہزار روپے کی......؟ تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آ گئے......؟“

”میری اپنی خون پسینے کی کمائی ہے سر۔“

”دیکھو جمیل...... کہیں تم...... بے ایمانی تو نہیں کرنے لگے......؟“

”سر! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں...... بے ایمانی اور میں......؟ آپ یقین کریں میں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ رقم جمع کی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور میری آواز بھرا گئی۔ نیاز صاحب نے میری حالت دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ سجا لی اور بولے۔

”یار...... تم تو سیریس ہی ہو گئے۔ میں تو یونہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ اچھا کیا تم نے موٹر سائیکل خرید لی۔ اب تمہیں آنے جانے میں آسانی رہے گی...... چلو اچھا اب اپنا موڈ ٹھیک کرو اور میرے لئے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“

میں نے جیب سے رومال نکال کر آنسو صاف کئے اور چائے بنانے کچن میں گھس گیا۔ وہ دن بہت مصروف گزرا۔ لوگوں کا آنا جانا لگا رہا اور دن بھر چائے پانی سے ہی فرصت نہ ملی۔ مصروفیت ہو تو وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس روز نہ نیاز صاحب نے کھانا کھایا اور نہ ہی ہمیں کھانا کھانے کی فرصت ملی۔ نیاز صاحب کے گھر سے جو کھانا آیا تھا وہ بھی ایسے کا ایسا ہی پڑا رہا۔

رات کو دفتر بند ہوا تو میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ لیکن موٹر سائیکل چلاتے ہوئے لگنے والی تازہ ہوا نے میری ساری تھکن دور کر دی اور میں خود کو فریش محسوس کرنے لگا۔ دفتر سے گھر کا تھوڑا ہی فاصلہ تھا اس لئے گھر پہنچنے میں چند منٹ لگے۔ میں گھر میں داخل ہوا تو بہت خوش تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی جو مجھ سے چھپائی نہیں جا رہی تھی۔

”آج بہت خوش دکھائی دے رہے ہو۔ لگتا ہے لمبا ہی کمیشن مارا ہے......“ غفور نے دریافت کیا۔

”ایسے ہمارے نصیب کہاں۔ ہزار نہیں تو دو ہزار...... اس سے زیادہ کمیشن کیا بنے گا۔“

”کوئی بات تو ہے...... یونہی تمہارا چہرہ نہیں کھلا ہوا۔“ تنویر نے کریدا۔

”وہ...... اصل میں...... میں نے موٹر سائیکل خریدی ہے...... اس لئے خوش دکھائی

دے رہا ہوں۔"

"موٹر سائیکل...... ڈم ڈما ڈم...... ڈم ڈما ڈم...... ڈم ڈما ڈم......" یہ کہتے ہوئے چاروں لڈی ڈالنے لگے۔

انہیں دیکھا تو یہ سوچ کر بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے کہ کوئی تو دنیا میں ہے جو میری خوشیوں میں خوش ہے۔ وہ چاروں لڈیاں اور بھنگڑا ڈال رہے اور میں رو رہا تھا۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ رک گئے۔ جبار اور تنویر نے آ بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ الیاس اور غفور مجھے تھپکیاں دینے لگے۔ پھر اچانک الیاس کو شرارت سوجھی اور مجھے ہنسانے کے لئے بولا۔

"کہیں تم اس لئے تو نہیں رو رہے کہ اب مٹھائی بھی کھلانا پڑے گی...... لیکن...... شک تم اور زیادہ رو لو۔ مٹھائی تو تمہیں کھلانا ہی پڑے گی۔"

"کیوں نہیں...... تم لوگوں سے مٹھائی اچھی ہے کیا......؟ ابھی چلیں، جہاں کہتے وہیں سے مٹھائی کھلا دیتا ہوں۔"

"مٹھائی بھی کھا لیتے ہیں۔ پہلے چل کر اپنے یار کی موٹر سائیکل تو دیکھ لیں۔" الیاس نے بات کی۔

"یہ ٹھیک ہے۔ نیچے چل کر موٹر سائیکل بھی دیکھ لیتے ہیں اور آتے ہوئے مٹھائی لیتے آئیں گے۔ پھر آرام سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر کھائیں گے۔" جبار نے پروگرام بنایا۔

جبار کی بات سن کر سب نے اس کی تائید کی اور ہم پانچوں فلیٹ کو تالا لگا کر نیچے گئے۔ موٹر سائیکل کا جائزہ لینے کے بعد الیاس، غفور اور جبار واپس فلیٹ میں چلے گئے میں اور تنویر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر مٹھائی لینے چل پڑے۔ قریب ہی مٹھائی کی دکان تھی نے ایک کلو گلاب جامن اور رس گلے خریدے اور واپس فلیٹ میں آ گئے۔ وہ تینوں ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ غفور نے ہمارے آنے تک چائے تیار کر لی تھی۔ ہم پانچوں نے مل کر مٹھائی کھائی اور چائے پی۔ وہ چاروں ہی میری چھوٹی سی خوشی میں میرے اس قدر خوش تھے کہ انہیں دیکھ کر بار بار میری آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور میں بمشکل خود قابو پاتا۔

رات کافی بیت گئی تھی۔ صبح ہمیں اپنے اپنے کام پر بھی جانا تھا اس لئے اپنے اپنے بستر پر جا لیٹے۔ نیند بھی عجیب چیز ہے۔ آنے کو آئے تو سولی پر بھی آ جاتی ہے اور نہ آئے تو پھولوں کی سیج پر بھی نہیں آتی۔ سونے سے قبل ذہن اگر کسی معاملے میں الجھ جائے تو جب تک وہ الجھن دماغ سے نکل نہیں جاتی یا اس الجھن کا کوئی حل نہیں نکل آتا، نیند قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں چارپائی پر لیٹا تو نہ جانے کیوں نیاز صاحب کی بات میرے ذہن میں کانٹا بن کر چبھ گئی۔ میں بار بار اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا لیکن کچھ ہی دیر بعد نیاز صاحب کی بات ہتھوڑا بن کر میرے دماغ پر برسنے لگتی۔ ہوسکتا ہے نیاز صاحب نے یوں ہی بات کر دی ہو...... یا ممکن ہے ان کے دل میں واقعی کہیں چور چھپا بیٹھا ہو۔ مگر میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے نیاز صاحب کے پاس کام کرتے ہوئے ایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ میں نے بھرپور کوشش کی تھی کہ نیاز صاحب کو کبھی میری کسی بات سے کوئی دکھ نہ پہنچے۔ میں نے ہمیشہ خلوصِ دل اور محنت سے کام کیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خدا تعالیٰ بھی مجھے میری حیثیت سے کہیں زیادہ دے رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان تو کبھی مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ بس اور...... اور...... اور ہی کہتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے کبھی انہیں دھوکہ دینے یا ان سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر ان کے یہ الفاظ میرے ذہن میں بار بار گھوم رہے تھے۔

"جمیل...... تمہارے پاس اٹھائیس ہزار کہاں سے آ گئے؟ کہیں تم...... بے ایمانی تو نہیں کرنے لگے؟"

میں عجیب تناؤ کا شکار تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے اپنے لئے ایک نئے راستے کا انتخاب کر لیا۔ ذہن میں کئے گئے اس فیصلے کے بعد دیر تک میرا ذہن گھومتا رہا مگر پھر آنکھ لگ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو میرے چاروں ساتھی اپنے اپنے دفتروں کو جا چکے تھے۔ میں نے اٹھ کر اپنے حصے کے کام نمٹائے اور تیار ہو کر دفتر کے لئے نکل پڑا۔ میں اس روز ایک نیا جوش دل میں لئے گھر سے نکلا تھا۔ راستے میں اِدھر اُدھر نگاہ مارتا ہوا وقت مقررہ پر دفتر جا پہنچا۔ میرے پہنچتے ہی نیاز صاحب اور گوہر بھی آ گئے۔ ان سے چابی لے کر دفتر کے تالے وغیرہ کھولے اور معمول کے کام سے فارغ ہو کر بیٹھ گیا۔

کچھ روز سے ایک کمرشل پلاٹ کا سودا ہو رہا تھا لیکن بات کسی کنارے نہیں لگ رہی تھی۔ نیاز صاحب کی کوشش تھی کہ کسی طرح بات بن جائے مگر ان کی لاکھ کوشش کے باوجود بات طے نہیں ہو رہی تھی۔ نیاز صاحب کو طرفین سے اچھی خاصی رقم ملنا تھی اس لئے وہ اپنی تمام تر توانائی صرف کر رہے تھے مگر ناکام تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح کھینچا تانی کر کے خریدار کو ساٹھ لاکھ تک لے آئے تھے جبکہ فروخت کنندہ باسٹھ لاکھ پر اڑا ہوا تھا۔ نہ خریدار اس سے آگے جانے کو تیار تھا اور نہ فروخت کنندہ ہی کسی طرح نیچے آنے پر راضی تھا۔

جب کافی لمبی چوڑی بحث کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ اس دوران میرا دماغ تیزی سے کام کرتا رہا۔ ان کے اٹھتے ہی میرا ذہن مزید جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا۔ میں بظاہر پُرسکون بیٹھا تھا مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ بات تو محض دو لاکھ روپے کی ہے۔ اگر بات طے نہ ہو تو یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں نے اندر ہی اندر سارا پلان بنا لیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چھٹی ہوئی تو نیاز صاحب نے اپنے گھر کی راہ لی اور میں نے اپنی موٹر سائیکل کا رخ اس طرف کر دیا جہاں وہ کمرشل پلاٹ خریدنے والوں کی رہائش تھی۔ میں اس سے قبل ایک دو بار نیاز صاحب کے کہنے پر وہاں جا چکا تھا لیکن اس بار میں اپنی مرضی سے جا رہا تھا۔ میں ان کے ہاں پہنچا تو وہ لوگ مجھے گھر پر ہی مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی ان میں سے ایک شخص نے سوال کیا۔

''آؤ بھئی جمیل...... خیر سے آئے ہو ناں......؟ لگتا ہے وہ لوگ مان گئے ہیں۔''

میں اپنے منصوبے کے مطابق بات سنتے ہی فوراً بول پڑا۔ ''وہ مانے تو نہیں مگر میں انہیں منا لوں گا......''

میری بات سنتے ہی دوسرے شخص نے فوراً پہلو بدلا اور بولا۔ ''مگر وہ تو کسی بھی صورت میں وہ پلاٹ ساٹھ لاکھ میں دینے کو تیار نہیں اور اس سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے۔''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں...... میں انہیں کسی بھی طرح راضی کروں، آپ کو تو وہ پلاٹ ساٹھ لاکھ میں ہی خریدنا ہے ناں...... تو سمجھیں ساٹھ لاکھ میں ہی مل جائے گا۔ مگر اس کے

لئے میری ایک شرط ہو گی۔''

''ہاں...... ہاں...... بولو...... تمہاری کیا شرط ہے؟'' پہلے شخص نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

''بات تو سیدھی سی ہے کہ میں آپ کو وہ پلاٹ ساٹھ لاکھ میں ہی دلا دوں گا۔ لیکن کمیشن کی رقم دو فیصد کے حساب سے آپ مجھے دیں گے اور نیاز صاحب کو اس بات کی خبر نہیں ہونے دیں گے۔''

''بھلا اس میں ہمیں کیا اعتراض ہے۔ ہم نے تو کمیشن دینا ہی ہے، وہ تم لو یا نیاز ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ اور پھر ہمارا کام ہو گیا تو بھلا ہمیں نیاز کو بتانے کی کیا ضرورت۔''

''تو پھر ٹھیک ہے...... آپ رقم کا بندوبست کریں۔ سمجھیں آپ کا کام ہو گیا۔ اب آپ کو ساٹھ لاکھ پلاٹ کے اور ایک لاکھ بیس ہزار بطور کمیشن مجھے ادا کرنا ہے۔ یعنی ٹوٹل رقم اکسٹھ لاکھ بیس ہزار بنے گی۔''

''تو پھر ہم اس بات کو طے سمجھیں......؟''

''انشاء اللہ...... کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں کل ہی ان لوگوں سے بات فائنل کر کے آپ کو بتا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... ہم رقم کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ تم کل تک ہمیں بتا دو۔''

بات سنتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ مجھے ابھی ان لوگوں کو بھی قائل کرنا تھا جن کا پلاٹ تھا۔ وہاں سے گھر جانے کی بجائے میں اس شخص کے ہاں جا پہنچا جس کا پلاٹ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کوئی پلاٹ کی ہی خبر لایا ہے۔

''کیوں بھئی جمیل...... خیر تو ہے؟ اس وقت رات کو کدھر گھوم رہے ہو؟''

''میں آپ کے پلاٹ کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا......''

''وہی لوگ مان گئے ہیں یا کسی اور پارٹی سے بات چلی ہے......؟''

''بس جی، ابھی تو انہی سے بات چل رہی ہے۔ مگر وہ کسی بھی طرح ساٹھ لاکھ سے زیادہ دینے کو تیار ہی نہیں ہو رہے۔''

میری بات سن کر وہ شخص غصے کی حالت میں چیخا۔ ''نہیں مانتے تو با...

میں نے بھی اپنا پلاٹ باسٹھ لاکھ سے کسی صورت میں بھی کم نہیں دینا۔ یہ بھی مجھے کچھ ضرورت کے تحت بیچنا پڑ رہا ہے اسی لئے نیاز صاحب مجھے باسٹھ لاکھ پر لے آئے ہیں ورنہ میں کچھ اور صبر کروں تو یہ ایک کروڑ کا پلاٹ ہے۔"

"آپ بجا فرما رہے ہیں۔ اچھا یہ بتائیں، آپ باسٹھ لاکھ میں تو وہ پلاٹ دینے کو تیار ہیں ناں......؟"

"ہاں...... وہ تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں......"

"ٹھیک ہے، میں آپ کو باسٹھ لاکھ ہی دلوا دیتا ہوں مگر اس میں نیاز صاحب کا کوئی حصہ نہیں ہوگا...... کمیشن کی رقم دو فیصد کے حساب سے آپ مجھے دیں گے اور اس سلسلے میں نیاز صاحب سے کوئی ذکر بھی نہیں کریں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تمہیں یہ تو پتہ ہے ناں کہ میں یہ سودا نقد کر رہا ہوں۔ ادائیگی کے لئے وقت نہیں دوں گا۔"

"میں جانتا ہوں سر...... آپ بالکل بے فکر اور مطمئن رہیں۔ تمام معاملات آپ کی خواہش کے مطابق ہی طے پائیں گے...... باسٹھ لاکھ میں سے دو فیصد کے حساب سے میری کمیشن ایک لاکھ چوبیس ہزار بنتی ہے۔ وہ کاٹ کر آپ کو بقایا ساٹھ لاکھ چھہتر ہزار روپے کی ادائیگی ایک دو روز میں کروا دوں گا۔"

بات طے ہو چکی تھی اس لئے مزید وہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یوں بھی کافی دیر ہو چکی تھی۔ مجھے گھر بھی پہنچنا تھا۔ میں نے اس شخص سے اجازت لی اور وہاں سے چل پڑا۔ میں نے پہلی بار نیاز صاحب سے ہٹ کر خود اپنے طور پر کوئی فیصلہ کیا تھا اور تمام معاملات میرے ذہن کے مطابق ہی طے پا گئے تھے۔ عام طور پر اس طرح کے لین دین میں بیعانہ کے طور پر کچھ رقم ادا کر دی جاتی ہے جبکہ باقی رقم کی ادائیگی کے لئے کچھ مہلت دے دی جاتی ہے۔ لیکن انہیں رقم کی اشد ضرورت تھی اس لئے نقد سودا طے پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باسٹھ لاکھ میں بات طے ہو گئی۔ ورنہ اتنے میں بات نہ بنتی۔

نیاز صاحب کاروباری آدمی تھے۔ ان کے ذریعے جب بھی کسی قسم کی جائیداد کی خرید و فروخت کی بات چلتی تو وہ اس وقت تک دونوں پارٹیوں کو سامنے نہ آنے دیتے جب تک بات کسی کنارے نہ جا لگتی۔ کیونکہ انہیں اس بات کا ڈر ہوتا تھا کہ کہیں وہ دونوں

پارٹیاں آمنے سامنے آ گئیں تو خود ہی آپس میں تمام معاملات طے نہ کر لیں اور اس صورت میں کہیں ان کا کمیشن ہی نہ مارا جائے۔ میں چونکہ دونوں ہی پارٹیوں سے واقف تھا اس لئے میں نے اس طرح کی چال چلی کہ دونوں پارٹیوں کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ وہ دونوں پارٹیاں ذہنی طور پر مطمئن ہو گئیں۔ ان دونوں کی ضرورت پوری ہو گئی اور میں نے ادائیگی کے بعد چوالیس ہزار روپے اپنی جیب میں ڈال لئے۔

کچھ روز بعد نیاز صاحب تک بھی یہ بات پہنچ گئی کہ وہ جس پلاٹ کا سودا کروا رہے تھے وہ کسی اور ذریعے سے طے ہو گیا ہے۔ انہیں جب کسی شخص کے ذریعے یہ بات معلوم ہوئی تو میں بھی وہیں موجود تھا۔ بات سنتے ہی انہیں چکر سا آ گیا کیونکہ ان کو ملنے والی کمیشن کی رقم کوئی اور لے اڑا تھا۔ نیاز صاحب کو پہلا دھچکا لگا تھا جسے وہ کسی نہ کسی طرح برداشت کر گئے۔ مگر انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ شاید دونوں پارٹیوں نے آپس میں بیٹھ کر بات طے کر لی ہے۔

آہستہ آہستہ میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہونے لگی۔ میں نے قریب ہی بینک میں اپنا اکاؤنٹ بھی کھلوا لیا تھا۔ جب بھی میں نیاز صاحب سے چوری کوئی خرید و فروخت کا سلسلہ طے کرواتا، مجھے جو رقم وصول ہوتی، بینک میں جمع کروا دیتا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا۔ جیسے جیسے میرا بینک بیلنس بڑھتا گیا، مجھ میں خود اعتمادی بھی بڑھتی گئی اور میں خود کو پہلے سے مضبوط سمجھنے لگا۔

الیاس، غفور، جبار اور تنویر مجھ سے بہت خوش تھے۔ میں ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پوری کر دیتا تھا۔ اور جب کبھی انہیں تھوڑے بہت پیسوں کی ضرورت ہوتی، میں بخوشی انہیں دے دیتا۔ وہ اسے بھی میرا احسان سمجھتے تھے اور اپنے طور پر میرے احسانوں کے نیچے دبے ہوئے تھے جبکہ میں انہیں اپنا سمجھ کر یہ سب کچھ کرتا تھا۔ یوں بھی ان چاروں کے سوا میرا تھا بھی کون۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میں اپنے چار بھائی گاؤں میں چھوڑ آیا تھا، خدا نے مجھے یہاں ان کے بدلے میں پیار کرنے والے چار بھائی دے دیئے تھے۔ ان میں سے جب کسی کو موٹر سائیکل کی ضرورت پڑتی، وہ بلا جھجک مجھ سے مانگ کر لے جاتا۔ میں نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ بدلے میں میرے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ صبح اٹھتا تو ناشتہ تیار ملتا اور رات کو گھر لوٹتا تو کھانا تیار پڑا ہوتا۔ نہ جانے کب وہ

میرے اس قدر قریب آ گئے تھے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ میں ان کی پریشانی دیکھ کر تڑپ اٹھتا اور وہ میری ذرا سی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو جاتے۔

گاؤں سے آنے کے بعد پہلی ایک دو عیدیں شیخ جی کے ہاں رہتے ہوئے آئی تھیں مگر شیخ جی کے پیار نے مجھے کوئی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ فلیٹ میں آ کر پہلی عید آئی تو میں فلیٹ میں تنہا تھا۔ یوں تو وقفوں وقفوں سے وہ چاروں ہی اپنے اپنے گھروں کا چکر لگا آتے تھے۔ کبھی الیاس چلا جاتا تھا، کبھی جبار، کبھی تنویر اپنے گھر ہو آتا اور کبھی غفور۔ لیکن عید آئی تو وہ چاروں ہی اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ عید منانے چلے گئے اور میں فلیٹ میں تنہا رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں دنیا میں کس قدر اکیلا ہوں۔ عید کی نماز ادا کرنے کے بعد میں نے خود کو فلیٹ میں قید کر لیا تھا۔ میں نے خود کو لاکھ سنبھالا مگر میرے آنسو نکل پڑے۔ بار بار میرا دل بھر آتا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ چار روز اسی کیفیت میں گزرے۔ عید کے چار روز بعد ایک ایک کر کے وہ چاروں واپس آ گئے۔ وہ اپنے والدین، بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کے ساتھ عید منا کر آئے تھے اور بہت خوش تھے۔ جبکہ میں نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ رونے کی وجہ سے میری آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ چاروں ہی پریشان ہو گئے تھے۔

اب پھر عید آ رہی تھی اور وہ اپنے اپنے گھر جانے کے پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ لیکن اب وہ میرے اس قدر قریب آ چکے تھے کہ اب کی بار وہ مجھے تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ ان چاروں میں سے کوئی ایک ساتھی میرے پاس ضرور رہے تا کہ مجھے عید کے موقع پر تنہائی کا احساس نہ ہو۔ مجھے ان کے جذبات کی قدر تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ان کی عید خراب ہو یا ان کے گھر والے ان کی راہ دیکھتے رہیں۔ میں نے انہیں ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی بھی طرح میری بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ آخر مجھے ہی خاموش ہونا پڑا اور فیصلہ ہوا کہ تنویر میرے پاس رہے گا جبکہ غفور، جبار اور الیاس عید منانے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔

عید سے ایک روز قبل ہی دفتر روانہ ہوتے ہوئے وہ اپنے اپنے بیگ ساتھ لے گئے

تا کہ وہاں سے سیدھے اپنے اپنے گھر نکل جائیں۔ اگلے دن عید تھی اس لئے نیاز صاحب نے وقت سے پہلے ہی دفتر بند کروا دیا۔ میں نے راستے میں سے عید کے لئے کچھ کھانے پینے کا سامان اور مٹھائی وغیرہ خریدی اور گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچا تو تنویر گھر پر موجود تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹا تھا مگر مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ میں بھی کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری خاطر رک تو گیا تھا لیکن گھر والوں کے ساتھ عید نہ منا پانے کی وجہ سے افسردہ ہے۔ وہ تو بات بے بات قہقہے لگایا کرتا تھا لیکن آج کسی بھی بات پر مسکرا نہیں رہا تھا۔

''لگتا ہے گھر والوں کی یاد آ رہی ہے......'' میں نے اسے اداس دیکھ کر سوال کیا۔

''نہیں...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی کچھ روز پہلے ہی تو گھر والوں سے مل کر آیا ہوں۔'' تنویر نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ ابھی تھوڑے دن ہوئے تم گھر سے ہو کر آئے تھے...... لیکن وہ جانا اپنی جگہ، عید پر گھر والوں کے ساتھ ہونا اپنی جگہ۔''

''تم ایسا کیوں سوچتے ہو...... یقین کرو میں بالکل پریشان نہیں ہوں۔ کل عید ہے۔ میں آج رات کسی وقت گھر فون کر دوں گا اور انہیں اپنے نہ آنے کا بھی کہہ دوں گا۔'' تنویر نے بڑے حوصلے سے بات کہہ دی تھی لیکن میں اس کی اندرونی حالت سمجھ رہا تھا۔ میں جو کچھ بھی تھا یقینی طور پر تنویر کا اس میں بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں اس کے احسانات تلے دبا ہوا تھا، بھلا اسے پریشان کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔

''تنویر! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم چلے جاؤ اور خوشی خوشی اپنوں کے ساتھ عید مناؤ۔''

''بس...... اب جانے بھی دو اس بات کو......''

''پلیز یار! میری خاطر ہی چلے جاؤ...... ورنہ میں خود کو ہی کوستا رہوں گا۔''

''اچھا پھر ایسا کرو، تم بھی میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ دونوں ایک ساتھ عید منا کر ایک دو روز میں واپس آ جائیں گے۔''

''تم نے ایک نئی بات چھیڑ دی...... بس جیسے میں کہتا ہوں ویسے کرو...... تمہیں میری قسم۔''

وہ بضد تھا کہ وہ میرے ساتھ عید منائے گا اور گھر پھر کبھی ہو آئے گا۔ لیکن میں نے

اس کی ایک نہ سنی اور عید کے لئے جو مٹھائی وغیرہ لایا تھا، اس کے حوالے کی اور زبرد
خود جا کر اسے ویگن میں بٹھا آیا تاکہ وہ بھی اپنوں کے ساتھ خوشیاں منا لے۔ وہ بمشکل
اس شرط پر راضی ہوا کہ وہ عید کی نماز پڑھتے ہی واپس چل پڑے گا تاکہ مجھے تنہائی کا
احساس نہ ہو۔

اسے ویگن میں سوار کرانے کے بعد میں دیر تک بلاوجہ موٹر سائیکل پر اِدھر اُدھر گھومتا
رہا۔ پھر گھر آ کر کھانا کھایا اور سو گیا۔ صبح نہا دھو کر کپڑے پہنے اور نمازِ عید کی ادائیگی کے
لئے گھر سے نکل گیا۔ میں عید کی نماز سے فارغ ہوتے ہی گھر واپس آ گیا اور آتے ہی
چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دوپہر کے دو بج چکے تھے۔
بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ میں نے جلدی سے کھانا وغیرہ تیار کیا اور فلیٹ کے دروازے کو
تالا لگا کر تندور سے روٹی لینے نکل گیا۔

روٹی لے کر واپس آیا تو دروازے پر تالا نہ پا کر میرا رنگ اُڑ گیا۔ تندور پر روٹی لینے
والوں کا رش تھا جس کی وجہ سے مجھے کچھ دیر لگ گئی تھی اور یقیناً میری غیر موجودگی میں
کوئی چور کام دکھا گیا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور دھڑکتے دل کے ساتھ
دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ میں یہ دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گیا کہ میرے کمرے کا بلب
روشن تھا جبکہ میں جاتے ہوئے تمام لائٹس بند کر گیا تھا۔ ایسی حالت میں بہت احتیاط کی
ضرورت تھی۔ ڈر اور خوف کی وجہ سے میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔ میں
نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور یہ دیکھ کر اچھل پڑا کہ کمرے میں تنویر بیٹھا تھا۔
اسے دیکھ کر میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا اور اسے اپنے گلے لگا لیا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو۔ اتنی جلدی آ گئے...... کم از کم شام تک تو گھر والوں کے
ساتھ رہتے......" میں نے عید مبارک دینے کے بعد شکوہ کیا۔

"بس یار! گھر والے تو آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے آیا ہوں۔"

"گھر والے بھی کیا کہتے ہوں گے کہ دوست کی خاطر انہیں چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

"میں نے تمہارے بارے میں گھر والوں کو تفصیل سے بتا دیا تھا...... بلکہ وہ تو مجھ
غصے ہو رہے تھے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں نہ لے کر گیا۔"

"بس یار! یہ تم لوگوں کا پیار ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا......"

"اچھا اچھا اب رہنے دو۔ زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ بہت سخت بھوک لگی ہے۔ آؤ کھانا
کھاتے ہیں۔"

گو کہ تنویر کے واپس آنے پر میں اسے ڈانٹ رہا تھا اور خفا ہو رہا تھا۔ لیکن سچ تو یہ
ہے کہ اس کے آنے سے مجھے حوصلہ مل گیا تھا اور واقعی عید مجھے عید لگنے لگی تھی۔ کھانا
کھانے کے بعد ہم دونوں گھومنے پھرنے نکل گئے اور خوب انجوائے کیا۔ دو تین روز بعد
الیاس، جبار اور غفور بھی آ گئے اور زندگی ایک بار پھر اسی طرح چلنے لگی۔

میں نے چھوٹی سی عمر میں ہی ٹھوکریں کھا کر زمانے کے رنگ ڈھنگ سیکھ لئے تھے۔
وقت نے مجھے وہ کچھ سکھا دیا تھا کہ کبھی کبھی میں اپنے داؤ پیچ دیکھ کر خود بھی حیران رہ
جاتا۔ نہ جانے کہاں سے میری زبان اس قدر شیریں ہو گئی تھی کہ جو بھی ایک بار مجھ سے
مل لیتا وہ میرا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔ میں نے لوگوں کے دلوں میں اترنے کا فن سیکھ لیا
تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیاز صاحب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے اور میں ہی ڈیل کرتا۔ ابھی
تک نہ صرف نیاز صاحب میری حرکتوں سے بے خبر تھے بلکہ گوہر بھی لاعلم تھا۔ اسی لئے
میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ وہ حقیقت جان جائیں یا انہیں مجھ پر کسی قسم کا شک
ہو میں انہیں خیر باد کہہ دوں۔ میں نے ذہن میں تمام پروگرام بنا لیا کہ نیاز صاحب سے
اس سلسلے میں کس طرح بات کرنی ہے۔

میں اور نیاز صاحب دونوں فارغ بیٹھے تھے۔ بات کرنے کا مناسب موقع تھا۔ میں
نے نیاز صاحب سے سوال کیا۔ "سر! آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔ لیکن ڈرتا ہوں
کہیں آپ مائنڈ نہ کر جائیں۔"

"نہیں نہیں...... پوچھو، کیا پوچھنا ہے......؟" نیاز صاحب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"سر...... میں کچھ عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ کچھ پریشان پریشان رہتے ہیں۔"

"ہاں یار...... اچھا بھلا کام چل رہا تھا...... لیکن پچھلے چند ماہ سے کاروباری حالات
خراب ہوتے جا رہے ہیں...... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔"

"میں سمجھتا ہوں سر...... آپ کی پریشانی دیکھ کر ہی تو میں نے بات کی ہے۔ دیکھیں
سر...... ان حالات میں آپ کو چھوڑ کر جانا اچھا تو نہیں لگتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک تو
آپ کے کاروباری حالات ٹھیک نہیں، اوپر سے ہماری تنخواہوں کے اخراجات...... سر! اگر

آپ اجازت دیں اور برا نہ منائیں تو میں کہیں اپنا چھوٹا موٹا کام کرلوں......؟''

میری بات سن کر نیاز صاحب خاموش ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ میری نوکری چھوڑنے کی بات خود ان کے اپنے دل کی بھی آواز ہے اسی لئے انہیں خاموش دیکھ کر میں نے ایک اور تیر پھینکا۔

''سر...... اگر آپ ناخوش ہیں تو میں نہیں جاتا۔''

نیاز صاحب ایک دم بول پڑے۔ ''نہیں نہیں...... مجھے تمہاری بات پر کوئی اعتراض نہیں۔ اچھا کیا جو یہاں سے جانے کی بات تم نے خود کر لی۔ میں جانتا ہوں آج کل پندرہ سو روپے میں کہاں گزارہ ہوتا ہے۔ کاروباری حالات کی وجہ سے کمیشن کی رقم تو کبھی کبھار ہی تمہارے حصے میں آتی ہے۔''

''پھر بھی سر...... میری تو خیر ہے...... مجھے اپنی پرواہ نہیں۔ میں نے تو محض آپ کا فائدہ سوچ کر بات کی ہے۔''

''ٹھیک ہے جمیل! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں...... جہاں رہو خوش رہو...... تم جب جانا چاہو مجھے بتا دینا۔''

نیاز صاحب کی بات سن کر میرے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے جبکہ بظاہر میں نظریں جھکائے اداس و پریشان بیٹھا تھا۔ دن بھر دفتر میں خاموشی چھائی رہی۔ رات ہوئی تو دفتر بند ہونے کے بعد میں گھر کی طرف چل پڑا۔ میں اپنی کامیابی پر اس قدر خوش تھا کہ موٹر سائیکل پر جھومتا لہراتا جا رہا تھا۔ میں نے راستے میں ہی فیصلہ کیا کہ گھر پہنچتے ہی اپنے چاروں ساتھیوں کو لے کر کہیں باہر نکل چلوں گا اور انہیں ان کی مرضی کے مطابق کھلاؤں پلاؤں گا۔

فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی میں تقریباً لڈی ڈالتا ہوا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے دروازہ کھولتے ہی وہ مجھے دیکھ کر روز کی طرح اچھل پڑیں گے۔ لیکن میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہاں گہری اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ چاروں گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ انہیں پریشان دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور فوراً دریافت کیا۔

''خیر تو ہے...... یہ تم اس طرح خاموش اور اُداس کیوں بیٹھے ہو......؟''

میری بات سن کر الیاس بول پڑا۔ ''ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔''

''خیریت......؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

الیاس میری بات کا جواب دینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے غفور بول پڑا۔ ''اصل میں ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے جبار کے گھر سے فون آیا تھا۔ اس کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ انہیں فوری طور پر ہسپتال لے گئے ہیں۔ ڈاکٹروں نے انجیو گرافی کروانے کو کہا ہے جس کے لئے اسے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ ہم چاروں کے حالات تو تم سے چھپے ہوئے نہیں۔ ہم سب تمہی پر آس لگائے بیٹھے ہیں۔''

غفور باتیں کر رہا تھا اور جبار کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

''فکر کیوں کرتے ہو...... سب ٹھیک ہو جائے گا......'' میں نے جبار کو تسلی دی اور ساتھ ہی جیب سے دس ہزار روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور بولا۔ ''یہ دس ہزار ہیں...... اپنے پاس رکھو۔ اگر اور ضرورت پڑی تو بلا جھجک فون کر دینا۔''

جبار نے شکر گزار نظروں سے میری طرف دیکھا اور دس ہزار روپے جیب میں ڈال لئے۔ اس کے کپڑوں کا بیگ تیار ہی پڑا تھا۔ اس نے بیگ اٹھایا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہم چاروں نے اسے تسلی دیتے ہوئے الوداع کیا۔

پانچویں روز جبار واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اب اس کے والد خطرے سے باہر ہیں۔ پھر بھی میں نے سوال کیا۔ ''اب والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے۔ تم سب کی دعاؤں سے اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹروں نے دو روز قبل انہیں ہسپتال سے فارغ کر دیا تھا...... ماشاء اللہ انہیں ہنستا مسکراتا چھوڑ کر آیا ہوں۔'' جبار نے خوشی خوشی بات کی۔

میں سوچنے لگا کہ یہ خونی رشتے بھی کس قدر پیارے ہوتے ہیں۔ انسان ان کی تکلیف کا سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں جبکہ انہیں خوش دیکھ کر مسکرانے لگتا ہے۔ ہماری خوشیاں اور غم ان کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے والد کی بیماری کا سن کر جبار رو پڑا تھا اور اب انہیں صحت یاب دیکھ کر آیا تھا تو بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

♦......♦

کچھ دن کی بھاگ دوڑ اور کوشش سے میں دفتر کے لئے انتہائی مناسب جگہ ڈھونڈنے
میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے نیاز صاحب کو خیر باد کہا اور اپنا دفتر بنانے میں لگ گیا۔
دفتر بنانے سنوارنے میں قریب قریب ایک ماہ لگا۔ میں نے نیاز صاحب کا دل رکھنے
کے لئے دفتر کا افتتاح انہی کے ہاتھوں سے کروایا اور افتتاح کے موقع پر علاقے کی
معزز اور جانی پہچانی شخصیات کے علاوہ خاص طور پر ان لوگوں کو مدعو کیا جو جائیداد کے
لین دین کا کام کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے نیاز صاحب اندر ہی اندر دفتر کی شان وشوکت
دیکھ کر جل اٹھے ہوں مگر انہوں نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا اور جب تک میرے دفتر میں
موجود رہے، دعائیں دیتے رہے۔

پراپرٹی کے کام میں اب میں نیا نہیں تھا۔ نیاز صاحب کے پاس رہتے ہوئے میں
نے پراپرٹی کے بارے میں کافی کچھ سیکھ لیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بہت سے لوگوں سے
ذاتی تعلقات بھی پیدا کر لئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دفتر بنتے ہی لوگوں کا آنا جانا لگ
گیا۔ جبکہ عام طور پر جو لوگ پراپرٹی ڈیلر کا دفتر بنا کر بیٹھتے ہیں وہ مہینوں مکھیاں مارتے
رہتے ہیں۔ جبکہ چوہدری پراپرٹی ڈیلر نے دفتر کے افتتاح کے ساتھ ہی لوگوں کو اپنی
طرف متوجہ کرلیا تھا۔

میں نے لوگوں کو راغب کرنے کے لئے اپنے برابر والی سیٹ پر اپنی اسسٹنٹ کے
طور پر ایک خوبصورت دوشیزہ بٹھا لی۔ اسسٹنٹ رکھنے کے لئے اخبار میں اشتہار دیا
انٹرویو کے روز امیدواروں کی بھیڑ لگ گئی۔ مجھے اس روز اس بات کا شدت سے
احساس ہوا کہ ہمارے ملک میں کس قدر بے روزگاری ہے۔ اخبار میں تین لائن کا چھوٹا
سا اشتہار دینے پر بہت سی لڑکیاں آ جمع ہوئی تھیں۔ میرے ذہن میں قابلیت کا معیار
صرف خوبصورتی تھا۔ میں آنے والی امیدوار لڑکیوں میں سے سب سے حسین و جمیل

لڑکی کا انتخاب کرنا چاہتا تھا۔ ان سب میں سے جس لڑکی کا انتخاب کیا، وہ عروج تھی۔
عروج تعلیمی قابلیت کے ساتھ ساتھ خوبصورتی میں بھی اپنی مثال آپ دکھائی دی۔ وہ
بغیر کسی میک اپ اور بناؤ سنگھار کے آئی تھی اور حسن و جمال کا پیکر دکھائی دے رہی
تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک عضو جاذب نظر تھا۔ وہ کسی مصور کا شاہکار معلوم ہوتی
تھی۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ضرورت مند بھی تھی۔ ورنہ ایسی لڑکیاں جو محض اپنے
شوق کی خاطر جاب کرتی ہیں وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں کسی
اور دفتر کا در جا کھٹکھٹاتی ہیں۔

شام کے وقت میرے چاروں ساتھیوں میں سے بھی کوئی نہ کوئی کچھ دیر کے لئے
دفتر آ بیٹھتا۔ دفتر بند ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ جبار آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں
ایک لفافہ پکڑ رکھا تھا۔ سلام دعا کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگا کہ چلو تھوڑی دیر کے لئے
اندر دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسے ساتھ
لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا جو میں نے خاص طور پر اپنے لئے خوبصورتی سے سجایا
ہوا تھا۔ وہاں بیٹھتے ہی اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ مجھے دے دیا۔ لفافہ میرے
سامنے میز پر پڑا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے جبار کی طرف دیکھا اور بولا۔

”اس لفافے میں کیا ہے.....؟“

”کھول کر دیکھ لو.....خود ہی معلوم ہو جائے گا.....“ جبار نے رازداری سے کہا۔

میں نے لفافہ اٹھا کر کھول لیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں میرے نام کی
انٹرمیڈیٹ کی سند تھی۔

”میرے نام کی سند.....؟“ میں نے جبار سے سوال کیا۔

”خوشی نہیں ہوئی دیکھ کر.....؟“

”وہ تو ٹھیک ہے.....مگر..... مجھے بھلا اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں جانتا ہوں تمہیں شاید اس کی ضرورت نہ ہو.....لیکن مجھے تھی..... کیونکہ میں
نے تمہارے دس ہزار روپے ادا کرنا تھے۔ میرے پاس رقم تو نہیں تھی، مجھے یہی ایک
ذریعہ نظر آیا۔ میں نے اپنے اسی دوست سے کہہ کر تمہارے لئے یہ سند نکلوا دی جس
سے تمہیں میٹرک کی سند لے کر دی تھی۔“

"میں نے تم سے وہ رقم مانگی تھی کیا؟"

"میں جانتا ہوں تم نے رقم نہیں مانگی لیکن مجھے تو لوٹانا تھی ناں...... اور یہ مت سمجھ کہ یہ کوئی دو نمبر کی سند ہے۔ کوئی جب چاہے بورڈ کے دفتر سے اپنی تسلی کر سکتا ہے" پھر میرے قریب ہو کر آہستگی سے بولا۔ "میں تو کہتا ہوں تم ساتھ ساتھ یہ کام بھی کر لو۔ میں تو ڈرپوک ہوں۔ انتہائی سوچ سمجھ کر ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتا ہوں۔ تم یہ کام بخوبی کر سکتے ہو۔ اس طرح تمہاری آمدن میں بھی معقول اضافہ ہو جائے گا۔"

جبار کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ جبار اس دوران خاموشی سے بیٹھا میرے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے دوست کو مجھ سے ملا دے، میں اس سے مل کر تمام معاملات طے کر لوں گا۔

کچھ روز بعد جبار نے مجھے اس شخص سے ملوایا جو جعلی سندوں اور ڈگریوں کا کام کرتا تھا۔ کافی لمبی چوڑی گفتگو کے بعد میں نے فیصلہ کرنے کے لئے اس سے چند دن کی مہلت مانگ لی۔ کیونکہ میں کوئی بھی کام عجلت میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اور جبار دونوں اس معاملے پر غور کرتے رہے لیکن نہ جانے کیوں میرا ذہن مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جبار سے کہا کہ مجھے سوچنے کا کچھ موقع دو۔ میں اس سلسلے میں کل تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔

میں رات بھر چارپائی پر لیٹا تمام پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ چند ہزار روپوں کی خاطر میں خود کو بدنام کر کے اپنی بنی بنائی ساکھ اور عزت کو داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ رات جیسے تیسے کٹی۔ صبح ہوتے ہی میں نے جبار کو اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا اور اس پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ میں کسی بھی صورت میں اس کام میں ملوث نہیں ہوں گا۔

چوہدری پراپرٹی ڈیلر کی مناسبت سے لوگ رفتہ رفتہ میرا نام بھولنے لگے اور مجھے جمیل احمد کی بجائے چوہدری صاحب کہنے لگے۔ لوگوں کی زبان پر چوہدری صاحب ایسا چڑھا کہ سبھی مجھے چوہدری صاحب کہہ کر پکارتے۔ اور تو اور الیاس، تنویر، غفور اور جبار بھی مجھے چوہدری صاحب کہنے لگے۔ میں نے انہیں لاکھ منع کیا کہ تمہارے لئے تو میں جمیل ہوں مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور وہ بھی چوہدری صاحب کہہ کر ہی بات کرتے۔

میں نے اپنی عادت بنا لی تھی کہ دفتر کی صفائی وغیرہ ہونے کے بعد میں اپنے اندر

والے دفتر میں جا بیٹھتا اور کچھ دیر تک اخبار پڑھتا کیونکہ پھر دن بھر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ سکون سے اخبار پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ ابھی میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ عروج آ گئی اور اس نے بتایا کہ کوئی گوہر صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ گوہر کا نام سن کر میں نے عروج سے کہا کہ وہ فوراً اسے میرے پاس بھیجے۔

گوہر نے آتے ہی سلام کیا۔ میں اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ میرا پرانا کولیگ تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے سامنے بیٹھا گھبرا رہا تھا۔ میں نے عروج کو بلا کر چائے لانے کا آرڈر دیا اور خود گوہر سے گپ شپ کرنے لگا۔ گوہر اور میں ایک عرصہ تک ایک ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ وہ ایک مدت بعد مجھے ملنے آیا تھا۔ مجھے اس کے آنے کی بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن بات کرنے کے لئے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔ عروج چائے رکھ کر چلی گئی تھی مگر گوہر نے ابھی تک ہوں ہاں سے آگے کچھ بات نہیں کی تھی۔ آخر میں نے ہی بات چھیڑی۔

"ایسا لگتا ہے تم کچھ کہنا چاہتے ہو مگر کہہ نہیں پا رہے...... اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ......"

میری بات سن کر بھی وہ نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ آخر مجبوراً مجھے پھر بولنا پڑا۔

"دیکھو گوہر! میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں جو بن کہے تمہارے دل کی ساری باتیں جان سکوں۔ جب تک تم خود مجھے نہیں بتاؤ گے، مجھے کچھ پتہ نہیں چلے گا۔"

میری بات اس پر اثر کر گئی اور وہ بول پڑا۔ "بات یہ ہے چوہدری صاحب!"

"رکو...... رکو...... تم مجھے چوہدری صاحب کس خوشی میں کہہ رہے ہو...... تم تو میرے پرانے ساتھی ہو۔ جمیل کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا......؟"

"اب جبکہ آپ سب کے لئے چوہدری صاحب ہیں تو میرے لئے بھی آپ چوہدری صاحب ہی ہیں......"

"خیر بات کرو۔"

"چوہدری صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں...... اب نیاز صاحب کا کام تقریباً ٹھپ

ہو کر رہ گیا ہے۔ کام تو پہلے ہی کافی کم ہو گیا تھا۔ مگر جب سے آپ نے اپنا دفتر بنایا
ہے، کوئی اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتا۔ میں اور نیاز صاحب اکیلے بیٹھے سارا دن مکھیاں
مارتے رہتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب خالی تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا......"

"لیکن میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں......؟"

"چوہدری صاحب! حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ اگر ایک دو ماہ اور میں نے
خود نیاز صاحب کے ہاں سے ملازمت نہ چھوڑی تو وہ خود مجھے نکال دیں گے...... اگر
آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے گھر والے بھی آپ کو دعائیں
دیں گے۔"

گوہر کی بات سن کر سارا معاملہ میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ یہ درست ہے کہ گوہر ایک
محنتی اور ایماندار لڑکا تھا لیکن میں نیاز صاحب سے پوچھے بغیر اسے اپنے ہاں رکھ کر نیاز
صاحب سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نیاز صاحب سے
اس سلسلے میں خود بات کروں گا اور ان سے بات چیت کے بعد ہی کچھ فیصلہ کر سکوں
گا۔ مجھے گوہر سے واقعی ہمدردی تھی اور یقینی طور پر وہ میرے کام کا آدمی تھا مگر اس سلسلے
میں نیاز صاحب سے بات کرنا بہت ضروری تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کچھ دن
انتظار کرنے کو کہہ کر رخصت کر دیا۔

میں نیاز صاحب سے ملنے جانا چاہتا تھا لیکن چند دن مصروفیت میں گزرے اس
لئے ان سے ملاقات کے لئے جانے کا وقت نہ نکال سکا۔ میں چاہتا تو فون پر بھی ان
سے بات کر سکتا تھا لیکن یہ کچھ نامناسب تھا اس لئے میں نے دل میں پروگرام بنالیا
کہ ایک دو روز میں ہی نیاز صاحب کے پاس ضرور جاؤں گا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں فارغ ہی تھا۔ میں نے اسی وقت نیاز صاحب
کے ہاں جانے کا پروگرام بنالیا۔ نیاز صاحب کے دفتر پہنچا تو وہ دفتر میں اکیلے ہی بیٹھے
تھے۔ گوہر شاید کسی کام سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ وہ مسلسل نظریں جھکائے کچھ سوچ
رہے تھے۔ کاروبار میں کمی آ جانے کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں وہ کس قدر کمزور
ہو گئے تھے۔ میں ان کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ انہوں نے نظریں اٹھائیں تو اچانک
مجھے سامنے پا کر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا اور کافی دیر

تک مجھے گلے سے لگائے تھپکیاں دیتے رہے پھر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں ان
کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیاز صاحب مجھے غور سے دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"بہت عرصے کے بعد اپنی شکل دکھائی ہے تم نے...... لگتا ہے بہت مصروف ہو۔"

"بس سر...... آپ ہی کی دعاؤں سے ہے سب کچھ۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، جس
مقام پر ہوں وہ سب آپ ہی کی وجہ سے ہے۔"

"اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ تمہارے اپنے نصیب اچھے تھے۔ میرا اس میں
کوئی عمل دخل نہیں......"

"یہ آپ کا بڑا پن ہے سر...... ورنہ میں کسی قابل کہاں تھا......؟"

میری بات سن کر نیاز صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "اچھا باقی باتیں آرام
سے بیٹھ کر کریں گے...... پہلے میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں سر! آپ کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ ویسے چائے کی کوئی خاص طلب تو
نہیں لیکن پھر بھی سر...... میرے ہوتے ہوئے آپ چائے کیوں بنائیں گے؟" یہ کہتے
ہی میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیاز صاحب سے کہا کہ وہ بیٹھ جائیں۔ لیکن
انہوں نے ایک نہ مانی اور بولے۔

"آج تم میرے مہمان بن کر آئے ہو...... ویسے بھی تمہارے ہاتھ کی چائے بہت
پی ہے۔ آج تم میرے ہاتھ کی پی کر دیکھو...... میں بہت اچھی چائے بناتا ہوں۔ یقیناً
تمہیں بہت مزا آئے گا۔"

نیاز صاحب بات کرتے ہوئے کچن کی طرف چل دیئے اور میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔
نیاز صاحب کچھ دیر پہلے کس قدر اُداس اور پریشان بیٹھے تھے۔ نہ جانے میرے آنے
سے انہیں کیا خوشی ملی تھی کہ وہ مسکراہٹیں بکھیر رہے تھے۔ میں نے ٹیبل پر پڑا میگزین
اٹھا لیا اور ورق گردانی کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں نیاز صاحب دونوں ہاتھوں میں چائے
کے کپ تھامے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک کپ میرے سامنے رکھ دیا
اور دوسرا کپ اپنے سامنے رکھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"اور سناؤ...... آج کیسے راستہ بھول کر آ گئے......؟"

"بہت دنوں سے آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن سارا دن اس قدر بھاگ دوڑ

لگی رہتی ہے کہ وقت ہی نہیں نکال پا رہا تھا...... بس آج چلا آیا۔"

"اچھا کیا...... تمہارے آنے سے یہاں بھی کچھ رونق لگ گئی۔ ورنہ تو اب یہاں
سارا دن الّو بولتے رہتے ہیں۔"

"کیوں سر...... ایسا کیوں ہے......؟ پہلے تو یہاں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ لوگوں
کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔"

"بس یار...... تم تو جانتے ہی ہو، اب کاروباری حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔"

"جی سر...... گوہر بھی بتا رہا تھا۔"

"گوہر گیا تھا تمہارے پاس......؟" نیاز صاحب نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"اصل میں سر...... وہ میرے پاس آیا تھا کہ میں اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لوں لیکن
میں بھلا آپ کی اجازت کے بغیر اسے اپنے پاس کیسے رکھ سکتا تھا......؟"

"یہ تو تمہاری برخورداری ہے۔ ورنہ آج کے زمانے میں کس کو کسی کی پرواہ ہے؟
کوئی اپنے فائدے کی سوچتا ہے۔ اس میں کسی کو نقصان ہوتا ہے تو ہو۔"

"آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں سر...... میں نے جو کچھ بھی سیکھا ہے آپ
سے سیکھا ہے۔ بھلا آپ سے پوچھے بغیر میں گوہر کو ملازمت دے کر آپ کی دل شکنی
کیسے کر سکتا تھا؟"

"گوہر اچھا لڑکا ہے۔ اگر وہ تمہارے پاس جانا چاہتا ہے تو مجھے کسی قسم کا کوئی
اعتراض نہیں۔ بلکہ اگر کہو تو میں بھی تمہارے پاس ہی چلوں......؟"

"سر! آپ مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔ وہ سارے کا سارا دفتر ہی آپ کا ہے۔ آپ
جب اور جس وقت چاہیں آ کر میری کرسی پر بیٹھ جائیں اور دفتر سنبھال لیں...... ہاں اگر
آپ نے گوہر کی بات کرنے کا مائنڈ کیا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"نہیں جمیل...... تم تو جانتے ہی ہو میں اس قسم کا آدمی نہیں۔ یقیناً گوہر کو تمہارے
پاس جانے کا فائدہ ہے۔ اسے ضرور جانا چاہئے.... اب یہاں میرے پاس رکھا ہی کیا
ہے؟"

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نیاز صاحب سے اجازت لے
کر اپنے دفتر کی جانب چل پڑا۔ نیاز صاحب سے مل کر آنے کے تیسرے روز گوہر

گیا اور میرے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔

گوہر کے آنے سے میرے لئے کافی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ یوں تو میں نے
فیلڈ کے لئے ایک دو لڑکے اور بھی رکھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود مجھے کئی کئی بار
مختلف نوعیت کے کاموں کے لئے خود اٹھ کر جانا پڑتا تھا۔ وہ سب کام گوہر نے سنبھال
لئے۔

پراپرٹی کے کام میں زیادہ تر وہ لوگ اپنی جائیداد جس میں مکان، دُکان، پلاٹ یا
گھر وغیرہ شامل ہیں فروخت کرنے آتے ہیں جنہیں فوری طور پر رقم کی ضرورت ہوتی
ہے۔ انہیں اپنی کوئی نہ کوئی غرض پوری کرنے کے لئے جائیداد فروخت کرنا پڑ جاتی
ہے۔ ایسے لوگوں کو کم سے کم قیمت پر راضی کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ ایسے مواقع جب
بھی مجھے ملتے میں ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انتہائی کم قیمت پر وہ جائیداد خرید
لیتا اور اپنے پاس سے نقد ادائیگی کر دیتا۔ ایسی صورت میں ضرورت مند کی ضرورت
فوری پوری ہو جاتی اور میں کچھ ہی عرصے بعد مناسب منافع لے کر کسی اور کے ہاتھ
فرخت کر دیتا۔

میں نے اس طرح بہت سی جائیداد بنا لی تھی۔ کئی مکان، دُکانیں اور پلاٹ میری
ملکیت تھے۔ جس جگہ میرا دفتر تھا، میں نے وہ جگہ بھی خرید لی تھی۔ میں نے اپنی موٹر
سائیکل اپنے فیلڈ اسسٹنٹ کو دے دی اور خود کار خرید لی۔ دفتر کے قریب ہی ایک
خوبصورت گھر بھی خرید لیا اور کرائے کا فلیٹ چھوڑ کر اپنے چاروں دوستوں کو ساتھ لئے
وہاں رہائش اختیار کر لی۔ یوں تو میرے تعلقات بہت سے لوگوں سے پیدا ہو گئے تھے
مگر اب بھی غفور، تنویر، الیاس اور جبار ہی میرے سب سے قریبی دوست تھے۔ کسی کسی
روز رات کے وقت میں انہیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر کہیں نہ کہیں لے جاتا اور
انہیں ان کی پسند کی چیزیں کھلاتا۔

میرا کاروبار خوب چل نکلا تھا۔ بہت سی جائیداد بنانے کے علاوہ میں نے کافی رقم
بھی جمع کر لی تھی۔ پراپرٹی کے زیادہ تر معاملات گوہر اور عروج نے سنبھال رکھے تھے
اس لئے مجھے کافی فرصت ہوتی۔ انسانی خواہشات کہاں کبھی کسی کی پوری ہوتی ہیں۔ ان
کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ ختم ہونے یا کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ میں بھی

پراپرٹی کے کام کے ساتھ ساتھ کوئی اور دوسرا کام کرنے کے متعلق سوچنے لگا۔ مگر میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے اور کون سا کام کرنا چاہیئے۔ بہت سے دوستوں اور والوں سے مشورے کے بعد میں نے ٹریول ایجنسی بنانے کا پروگرام بنا لیا۔ مجھے ایسے لوگ بھی مل گئے جنہوں نے کہا کہ وہ ویزے لا دیا کریں گے۔ کچھ ہی دن چوہدری پراپرٹی ڈیلر کے بورڈ کے ساتھ ہی چوہدری ٹریول ایجنسی کا بورڈ بھی لگا دیا گیا۔

میں نے چند سالوں میں نہ صرف علاقے کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا بلکہ میرا شمار علاقے کے معززین میں ہونے لگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے کسی فعل کی وجہ سے میری بدنامی ہو۔ لیکن ویزا تو کبھی کبھار ہی ہاتھ لگتا تھا۔ ایک دو ویزے دے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے سے تو کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ میں نے اس کا ایک درمیانی حل نکالا۔ پہلے پہل ایک دو بار جن لوگوں سے رقم لی تھی، انہیں پروگرام کے مطابق بیرون ملک بھجوا دیا تھا۔ اس طرح علاقے کے لوگوں میں میری مقبولیت اور عزت اور بھی بڑھ گئی۔ لوگ میرے پاس کھنچے چلے آنے لگے۔ یوں بھی میں نے پراپرٹی کا شعبہ گوہر کے حوالے کر دیا تھا اور ریکروٹنگ کا تمام کام عروج کو سونپ دیا تھا۔ ویزے کے حصول کے لئے جو بھی آتا، وہ عروج سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ میرے لاکھ انکار کے باوجود لوگ ایڈوانس جمع کروا جاتے۔ میں ان سے صاف الفاظ میں کہہ بھی دیتا کہ ابھی ویزے آنے میں وقت لگے گا۔ جب ویزے میرے پاس آئیں گے میں ان سے رقم بھی لے لوں گا۔ لیکن لوگوں کو بیرونِ ملک جانے کا اس قدر جنون تھا کہ وہ انتظار کہاں کرتے ہیں۔ میں لوگوں کا اندھا اعتماد دیکھ کر حیران ہو جاتا۔ لوگ کچھ دیکھے اور لکھے پڑھے بغیر ہزاروں روپے محض اس امید پر میرے حوالے کر جاتے کہ انہیں بیرون ملک بھجوا دیا جائے۔ اس طرح جتنی بھی رقم جمع ہوتی، میں کسی نہ کسی کام میں لگا دیتا یا پھر کہیں فکس ڈپازٹ کروا دیتا۔

یہ بات لوگوں کے علم میں تھی کہ میں نے کبھی کسی کو غلط ویزے پر بیرون ملک نہیں بھجوایا تھا۔ اس لئے وہ اس بات سے مطمئن تھے۔ جن لوگوں نے ایڈوانس کے طور پر رقم جمع کروائی ہوتی، ان میں سے اگر کوئی بار بار چکر کاٹ کر تنگ آ جاتا اور اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتا تو میں اسے اس کی رقم بلا تاخیر واپس کر دیتا تا کہ وہ پریشان نہ ہو۔

یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو اپنی رقم ڈوبنے کا بھی خوف نہیں تھا۔

گو کہ پراپرٹی کے ساتھ ساتھ ٹریول ایجنسی میں بھی معقول آمدنی ہو رہی تھی لیکن میں ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا کیونکہ ٹریول ایجنسی سے ہونے والی آمدن میری توقعات سے کہیں کم تھی۔

رات کا وقت تھا، میں دفتر سے اٹھنے کی تیاریوں میں تھا۔ دو شخص میرے کمرے میں داخل ہوئے اور سلام دعا کے بعد میرے سامنے ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک شخص پاکستانی تھا اور شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا جبکہ دوسرا شخص پینٹ کوٹ میں ملبوس تھا اور اپنی وضع قطع سے کسی اور ملک کا باشندہ دکھائی دیتا تھا۔

''جی فرمایئے...... کیسے آنا ہوا......؟'' میں نے بات کا آغاز کیا۔

میری بات سن کر شلوار قمیض میں ملبوس شخص بول پڑا۔ ''مجھے صادق کہتے ہیں اور یہ میرے ساتھ شیخ حمد بن عبدالعزیز ہیں جو میرے دوست ہیں اور متحدہ عرب امارات سے آئے ہیں۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے اسی لئے شیخ حمد کو لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔'' صادق نے جواب دیا اور پھر میرے قریب ہو کر انتہائی رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''آپ صرف بندے ہی باہر بھجواتے ہیں...... یا......؟''

میں فوری طور پر اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سوچ میں پڑ گیا کہ اس نے اپنی بات ادھوری کیوں چھوڑ دی اور اس سوال سے اس کی مراد کیا ہو سکتی ہے؟

''دیکھیں صادق صاحب! آپ بجھارتیں نہ بجھوائیں، میرے ساتھ کھل کر بات کریں۔''

میری بات سن کر صادق نے لمبی سانس چھوڑی اور بولا۔ ''بات یہ ہے جمیل صاحب! حمد بن عبدالعزیز کو اونٹوں کی ریس کے لئے کم عمر بچوں کی ضرورت ہوتی ہے...... اسی سلسلے میں انہیں لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔''

صادق کی بات سن کر میں کچھ دیر خاموش رہا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بول پڑا۔ ''دیکھیں جمیل صاحب...... کام ذرا سا مشکل ضرور ہے مگر آپ کو اس کا انتہائی معقول

معاوضہ ملے گا جو ڈالرز، یو اے ای درہم یا پھر پاکستانی روپوں کی شکل میں ادا ہوگا۔
گھر آئی دولت کو کون ٹھکراتا ہے مگر ایک تو میرے ذہن کے مطابق ایسی با
کرنے کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں تھی اور دوسرے مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت
درکار تھا۔ اس لئے میں نے ان سے اس ہوٹل میں ملاقات کا وقت طے کرلیا جہاں
ٹھہرے ہوئے تھے۔

میں اگلے روز وقت مقررہ پر ہوٹل کے کمرہ نمبر 204 میں پہنچ گیا۔ وہ دونوں میر
منتظر تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے بیٹھتے ہی بلاتمہید بات شروع کر دی۔

”دیکھیں بات یہ ہے کہ آپ جو بھی بات کرنا چاہتے ہیں، صاف اور واضح الف
میں بیان کر دیں تاکہ اس سلسلے میں بات کو آگے بڑھایا جا سکے۔“

میں نے بات مکمل کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صادق نے جس شخص کا تعارف
بن عبدالعزیز کے نام سے کروایا تھا اور کہا تھا کہ وہ عربی ہے اور پچھلے روز جب وہ
سے ملنے آیا تھا تو خاموش ہی رہا تھا، وہی حمد بن عبدالعزیز اچھی بھلی اُردو میں با
کرنے لگا اور بولا۔

”مسٹر جمیل...... تم سے کل جو بات ہوئی یقیناً تم نے اس کے بارے میں ا
طرح سوچ لیا ہوگا...... بات یہ ہے کہ تم ہمیں ہمارے اونٹ دوڑانے کے لئے بچے
کر دو، ہم تمہیں تمہاری منہ مانگی قیمت ادا کریں گے۔“

شیخ حمد بولتا رہا اور میں اس کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر تفصیلی بات چیت
بعد تمام معاملات طے پا گئے اور طے ہوا کہ میں ان کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر
پہنچا دوں اور فی بچہ چھ لاکھ روپے وصول کرلوں۔ میرا کام صرف بچہ ان کے حوالے
تھا۔ اس سے آگے ان کی سردردی تھی کہ وہ پاکستان سے بچے کو متحدہ عرب امارات
ذریعے سے لے کر جاتے ہیں۔

دولت میں اس قدر کشش ہے کہ انسان اس کے حصول کے لئے کوئی بھی کام کر
کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ جس قدر کسی کے پاس جمع ہوتی چلی جاتی ہے اسی قدر اسے
پانے کی خواہش بڑھتی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میں محض دول
کے حصول کی خاطر بغیر کچھ سوچے سمجھے ان کے لئے کام کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ پانچ سے سات آٹھ سال کے بچوں کا حصول کس طرح ممکن ہو
پائے گا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایسے بچوں کا حصول مشکل ضرور تھا، ناممکن
نہیں تھا۔ میں کبھی رات کے اندھیرے میں، کبھی دن کے اُجالے میں اپنے علاقے سے
بہت دور غریب بستیوں کی طرف نکل جاتا اور ایسے لوگوں کو ڈھونڈتا جو غربت کے
ہاتھوں تنگ آ چکے ہوتے اور بچے ان کے لئے مسئلہ بن گئے ہوتے۔ میں انہیں سمجھا بجھا
کر کسی نہ کسی طرح مختلف طرح کے لالچ دے کر چند ہزار روپے ان کی جھولی میں ڈالتا
اور قائل کر لیتا اور وہ بچہ میرے حوالے کرنے پر تیار ہو جاتے۔ یہ درست ہے کہ وقت
نے مجھے بے رحم بنا دیا تھا لیکن پھر بھی ایسے لوگوں کو دیکھ کر کبھی کبھار میری آنکھ بھر آتی۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غربت کے مارے لوگ اپنے بچوں کو فروخت کرنے
کے لئے ہر دم برائے فروخت کا بورڈ اپنے سینوں پر سجائے پھرتے ہیں۔ مجھے کئی کئی بار
بہت سے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا۔ کئی لوگ بھوک سے مرنے کو تیار تھے مگر کسی بھی
قیمت پر اپنا بچہ دینے پر راضی نہ تھے۔ یوں بھی میں نے کبھی کسی غریب سے اس کا بچہ
زبردستی نہیں چھینا تھا بلکہ ہمیشہ باہمی رضامندی سے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ میں
رقم کا لالچ دینے کے ساتھ ساتھ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر بچہ حاصل کر
لیتا۔ اس کے لئے مجھے ایک ہی در پر کئی کئی بار دستک دینا پڑتی مگر میں اس وقت تک
کوشش جاری رکھتا جب تک میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جاتا۔

میں نے اس کام میں مزید نکھار پیدا کرنے اور جان ڈالنے کے لئے سائرہ کو پارٹ
ٹائم بطور سیکرٹری رکھ لیا۔ مجھے جس روز اس کی ضرورت ہوتی، میں فون کر کے اسے بلا
لیتا۔ میں جب بھی کسی غریب بستی میں اسے اپنے ہمراہ لے کر جاتا تو لوگوں کو یہی ظاہر
کرتا کہ وہ میری بیوی ہے۔ میری شروع سے ہی عادت رہی ہے کہ میں نے اپنے کسی
بھی کام میں کسی دوسرے فرد کو کبھی رازدار نہیں بنایا تھا اور نہ ہی اپنا بھید کسی پر ظاہر کیا
تھا۔ سائرہ بھی دور گاڑی میں بیٹھی رہتی اور گاڑی کے شیشے چڑھے رہتے۔ سائرہ تعلیم
یافتہ اور فیشن ایبل ماڈرن لڑکی تھی۔ میں نے اس کے گھر کے قریب ہی مخصوص جگہ مقرر
کر رکھی تھی۔ وہ میرے فون کے بعد مقررہ وقت پر وہاں آ کھڑی ہوتی اور میں اسے
برابر والی سیٹ پر بٹھا کر منزل کی طرف نکل پڑتا۔

پہلے پہل میں نے سوچا تھا کہ بچوں کے حصول کے لئے مختلف یتیم خانوں اور فلا
اداروں سے رجوع کروں۔ ہو سکتا ہے تھوڑی بہت کوشش سے میں اپنے مقصد
کامیاب بھی ہو جاتا مگر اس میں کسی موقع پر مسائل کھڑے ہو سکتے تھے اس لئے
نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں نے ایک کہانی بھی گھڑ رکھی تھی جس کے مطابق
یہی ظاہر کرتا کہ ہم اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور کسی بچے کو گود لینا چاہتے ہیں۔
گاڑی میں بیٹھی سائرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا کہ وہ گاڑی میں میری بدنصیب
بیوی بیٹھی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اگر کچھ عرصہ اور اس کی گود خالی رہی تو وہ پا
ہو جائے گی۔ کئی بار ایک دو ماہ اسی طرح گزر جاتے اور کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل
ہوتی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ میں اپنے شکار کی تلاش میں بہت دور نکل آیا تھا اور مایوس
کر واپس لوٹ جانا چاہتا تھا۔ اچانک میری نظر اپنے بائیں طرف اٹھ گئی۔ وہاں
کچے پکے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے گاڑی کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔
گھر کے سامنے ادھیڑ عمر کا شخص اپنی گود میں چند ماہ کا بچہ لئے بیٹھا تھا۔ پاس
چھوٹے بڑے کئی میلے کچیلے بچے کپڑے سے بنی ہوئی گیند کے ساتھ کھیل رہے تھے
ان بچوں میں سے کئی بچے قدرتی لباس میں تھے اور کچھ نے نیکر یا پھٹی پرانی شلوار
رکھی تھی۔ میں نے ان کے بالکل قریب پہنچ کر گاڑی روک دی اور گاڑی میں بیٹھا
گاڑی دیکھ کر سب بچے دوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ ان بچوں کے پاس بیٹھا ہوا شخص
غالباً ان کا باپ تھا اور اپنی گود میں بچہ لئے بیٹھا تھا وہ بھی اٹھ کر میری طرف آ
اس شخص کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں فوراً گاڑی سے باہر نکل آیا اور سلام کے لئے
کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں اس وقت بہترین کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے
بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر پہلے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا اور پھر جلدی سے اپنا دایاں ہاتھ
دھوتی سے رگڑ کر صاف کیا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے دریافت کیا۔

"باؤ جی...... کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کسی بھی طرح کے سوال کے لئے خود کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ ا
سوال سنتے ہی بولا۔ "میں یہاں سے گزر رہا تھا، ان بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا تو

آ گیا۔"

"آ جاؤ باؤ جی! آ جاؤ......" وہ یہ کہتا ہوا اپنے کندھے پر رکھے ہوئے کپڑے سے پاس پڑی ہوئی چارپائی کو جھاڑ کر صاف کرنے لگا اور جب اسے تسلی ہو گئی کہ اس نے چارپائی کو اچھی طرح جھاڑ دیا ہے تو بولا۔ "آؤ باؤ جی! ادھر بیٹھو۔ میں نے چارپائی اچھی طرح صاف کر دی ہے۔ اب تم آرام سے بیٹھو۔ تمہارے کپڑے گندے نہیں ہوں گے۔ میں تمہارے لئے لسی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم بھی کیا کہو گے کہ مہر دین کے گھر گیا تھا اس نے چائے پانی بھی نہیں پوچھا۔"

"نہیں نہیں مہر دین! اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو بس ان بچوں کو دیکھنے آ گیا تھا۔"

"باؤ جی! لگتا ہے تمہیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"ہاں مہر دین...... مجھے واقعی ہنستے کھیلتے بچے بہت پیارے لگتے ہیں...... لیکن خدا کی قدرت دیکھو کہ میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں مگر میں ابھی تک بچوں کے لئے ترستا ہوں۔"

"بہت دُکھ ہوا باؤ جی......" مہر دین نے افسردگی سے کہا اور پھر آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن اُس کی وہی جانے...... باؤ جی! اوپر والے کے رنگ بھی نرالے ہیں۔ جن کے پاس کھانے کو پہلے ہی کچھ نہیں، انہیں ڈھیر سارے بچے دے ڈالتا ہے اور جنہیں اس نے سب کچھ دیا ہے اور کسی چیز کی کمی نہیں رہنے دی، انہیں نہ جانے کیوں خدا یہ نعمت نہیں دیتا۔"

مہر دین کی بات سن کر میں نے گردن جھکا لی اور سوچنے لگا کہ اب بات کو آگے کیسے بڑھایا جائے۔ مجھے گردن جھکائے افسردہ بیٹھے دیکھ کر مہر دین مجھے تسلی دینے لگا۔

"باؤ جی! دُکھی کیوں ہوتے ہو...... اوپر والے کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں...... تم بچوں سے اس قدر پیار کرتے ہو تو وہ بھلا تمہیں بچوں کا باپ کیوں نہیں بنائے گا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کیا اور ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ "مہر دین! خیر سے تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

میرا سوال سن کر مہر دین نے شرما کر گردن جھکا لی اور بولا۔ "بس باؤ جی! یہ سب اللہ کی دین ہے...... بچے بچیاں ملا کر کل گیارہ...... نہیں میرا خیال ہے بارہ......" اُسے

اپنے بچوں کی صحیح تعداد کا علم نہیں تھا اس لئے اپنی تسلی کے لئے بچوں کے نام لے کر انگلیوں پر گننے لگا۔ بگا، کالا، چھوٹو، موٹا، نکو، کمالا، مٹھو، جیدی، گڈی، رانی، شہزادی اور ہاں..... یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہیرا..... ماشاء اللہ پورے بارہ ہیں باؤ جی۔"

"ایک بات پوچھوں مہر دین..... برا تو نہیں مانو گے؟"

"پوچھو باؤ جی! کیا پوچھنا ہے؟"

"مہر دین! اتنے سارے بچوں کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کس طرح کر پاتے ہو.....؟"

"بس باؤ جی..... جس نے پیدا کیا ہے وہی پالنے والا ہے..... ہم کون ہوتے ہیں ان باتوں کی فکر کرنے والے۔"

"بڑے ہمت والے ہو مہر دین۔"

"بس جی ہم دیہاتی لوگ ہیں..... ہمیں اس طرح کی باتوں کی کب پرواہ ہے۔ ہم نے ساری ڈوریاں اللہ پر چھوڑی ہوئی ہیں۔"

"اچھا مہر دین..... یہ تو میں جانتا ہوں کہ کسی کے دو بچے ہوں یا دس، اسے سب پیارے ہوتے ہیں۔ تمہیں بھی یقیناً اپنے سبھی بچے جی جان سے پیارے ہوں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے کوئی بچہ اپنی مرضی سے میری جھولی میں ڈال دو تو تم کیا کرو گے.....؟ دیکھو مجھے غلط مت سمجھنا، میں تمہارے بچے کو اپنا بیٹا بنا کر رکھوں گا۔ اسے پڑھاؤں لکھاؤں گا، اس کی اچھی تربیت کروں گا۔ تم جب چاہو شہر آ کر اسے مل بھی لیا کرنا۔ کبھی کبھار میں بھی اسے تم سے ملوا جایا کروں گا۔"

میری بات سن کر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اسے خاموش پا کر میں نے پھر بات کی۔ "لگتا ہے تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی..... میں جانتا ہوں کون اپنے جگر کا ٹکڑا اپنی آنکھوں سے دور کرتا ہے۔ لیکن مہر دین! ذرا سوچو تو سہی، تمہاری اس مہربانی سے میری بیوی کی سونی گود بھر جائے گی۔ ورنہ وہ پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جائے گی..... دیکھو اگر تم مجھ پر یہ احسان کر دو گے تو میں تمہیں ایک لاکھ روپے بھی دے جاؤں گا۔ تم اپنے بچوں پر خرچ کر لینا۔"

"نہیں باؤ جی! ایسا نہ کہو۔ اپنے پیسے اپنے پاس رکھو۔ یہ بچے تو انمول ہیرے ہیں، ان کی قیمت کوئی کیا دے گا..... مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ تم یہیں ٹھہرو، میں اپنی بیوی سے بات کر کے آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے مہر دین اپنی بیوی سے بات کرنے کے لئے چل پڑا۔ وہ گھر جانے کے لئے اٹھا تو میں نے اسے روک لیا۔

"مہر دین..... اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چل کر بات کروں؟"

میری بات سن کر مہر دین کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔ "آ جاؤ باؤ جی! آ جاؤ، تم بھی آ جاؤ۔"

مہر دین مجھے لئے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنا سب سے چھوٹا بیٹا گود میں اٹھا رکھا تھا اور باقی بچے گاڑی کے اردگرد کھڑے شرارتیں کر رہے تھے۔ ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو وہاں پڑی ہوئی ہر چیز سے غربت چھلک رہی تھی۔ ٹوکرے میں پڑے ہوئے برتنوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جبکہ دھلنے والے برتنوں پر کوے بیٹھے ٹھونگیں مار رہے تھے۔ سامنے ہی مہر دین کی بیوی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ اس نے مہر دین کے ساتھ مجھے دیکھ کر فوراً گھونگھٹ نکال لیا۔ مگر اس کے گھونگھٹ نکالنے سے پہلے ہی میں اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کی بھدی سی شکل والی عورت تھی۔ اسے گھونگھٹ نکالتے ہوئے دیکھ کر مہر دین بول پڑا۔

"بگے کی ماں! یہ باؤ کوئی غیر نہیں، اپنا ہی عزیز ہے۔ اسے دیکھ کر اتنا بڑا گھونگھٹ کیوں نکال لیا.....؟"

اس نے مہر دین کے کہنے کے باوجود گھونگھٹ نکالے رکھا اور بولی۔ "تم لوگ بیٹھو، میں چائے بناتی ہوں۔"

"نہیں بھابی! کسی قسم کا تکلف نہ کریں۔ میں سب کچھ کھا پی کر نکلا تھا۔"

میں اور مہر دین اپنی جگہ کھڑے تھے اور مہر دین کی بیوی اپنی جگہ گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ مہر دین شاید اس انتظار میں تھا کہ میں بات کروں اور میں منتظر تھا کہ مہر دین بات کا آغاز کرے۔ وہ میرے ساتھ وعدہ کر کے اپنی بیوی

کے پاس چلا تو آیا تھا مگر شاید اس میں بات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی یا پھر اپنی بیوی سے ڈر رہا تھا۔ جب کچھ دیر اسی طرح خاموشی رہی تو میں نے ہی بات کرنے کا فیصلہ کیا اور بولا۔

"بھابی...... میں تم لوگوں کے پاس سوالی بن کر آیا ہوں۔"

میرا سوال سن کر مہر دین کی بیوی جسے وہ بگے کی ماں کہہ کر پکار رہا تھا، بول پڑی۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہو بھائی! ہم غریبوں کے پاس ہے ہی کیا جو تمہاری جھولی میں ڈال دیں......"

"ایسا نہ کہیں بھابی! خدا تعالیٰ نے تم لوگوں کو وہ نعمت دی ہے جو بڑی سے بڑی رقم خرچ کر کے بھی خریدی نہیں جا سکتی۔"

اس سے پہلے کہ مہر دین کی بیوی میری بات کا کوئی جواب دیتی، مہر دین خود بول پڑا۔ "باؤ جی! یہ اَن پڑھ اور جاہل عورت ہے، اسے آپ کی موٹی موٹی باتوں کی کچھ نہیں آئے گی۔ اسے میں اپنی زبان میں سمجھاتا ہوں، پھر دیکھنا ایک منٹ میں تمام بات سمجھ جائے گی۔" بات کرتے ہوئے مہر دین اپنی بیوی کے پاس جا پہنچا اور بولا۔

"دیکھ بگے کی ماں! یہ باؤ بے چارہ بہت دُکھی ہے۔ اوپر والے نے اسے سب کچھ دے رکھا ہے لیکن اولاد نہیں دی...... باؤ کا کہنا ہے کہ اگر ہم اسے...... میرا مطلب ہے ہم دونوں اگر اپنا ایک بچہ اس کو دے دیں تو اس کی بیوی کی گود بھی آباد ہو جائے گی۔ یہ ہمارے بچے کو اچھا کھلائیں پلائیں گے، اچھا پہنائیں گے اور اچھی تعلیم دلوائیں گے......"

ابھی مہر دین کی بات جاری تھی کہ اس کی بیوی بول پڑی۔ "دیکھ بگے کے ابا...... تو خود ہی باؤ جی سے کہہ دے کہ ہم بچے بانٹتے نہیں پھرتے جو ایک بچہ اٹھا کر اس کی جھولی میں بھی ڈال دیں...... اور پھر ہمارے پاس کون سے بہت زیادہ بچے ہیں جو ہم سے سنبھالے نہیں جاتے...... خدا خیر کرے دس بارہ ہی تو ہیں۔ اور اللہ کا شکر ہے سارے کے سارے کھانا کھا کر ہی سوتے ہیں۔ کوئی بھوکا نہیں سوتا۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، مہر دین بول پڑا۔ "بگے کی ماں! لگتا ہے تمہارا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے...... باؤ جی ہمارے بھلے کی ہی بات کر رہا ہے۔ اور دیکھ باؤ ہمیں پورے ایک لاکھ روپے بھی دے رہا ہے تا کہ ہم اپنے دوسرے بچوں کی اچھی

طرح دیکھ بھال کر سکیں۔"

مہر دین کی بات سنتے ہی اس کی بیوی نے ایک جھٹکے کے ساتھ گھونگھٹ اٹھایا اور تن کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ غصے کی وجہ سے اس کے بھدے اور سیاہ چہرے پر سرخی نظر آنے لگی اور آنکھوں سے انگارے برسنے لگے اور بولی۔

"دیکھ باؤ! بہت ہو گئی۔ اپنی دولت اپنے پاس رکھ اور شرافت سے یہاں سے باہر نکل جا۔ ایسا نہ ہو کہ میں برداشت سے باہر ہو کر کوئی اینٹ روڑہ تمہارے سر پر دے ماروں...... مہر دین کی آنکھوں میں تو لالچ بھرا ہوا ہے۔ اس کا بس چلے تو دولت کی خاطر بچہ تو ایک طرف یہ اپنی بیوی بھی تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہو جائے۔ لیکن یاد رکھو باؤ! ایک ماں کے ہوتے ہوئے اس سے اس کا بچہ کوئی نہیں چھین سکتا۔"

بات بگڑتی ہوئی دیکھی تو میں فوراً بول پڑا۔ "تم تو خوامخواہ ناراض ہو رہی ہو بھابی... میں تم سے تمہارا بچہ کوئی زبردستی تھوڑی چھین رہا ہوں...... مجھے تمہارے جذبات کی قدر ہے۔ میرا یقین کرو، میں تمہارا کوئی بچہ نہیں لے جا رہا بس نہ جانے کیوں بچوں کو دیکھ کر میری بیوی کا اُداس چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور میں تڑپ اٹھتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کی سونی گود ہری ہو جائے اور اسے بھی کچھ سکون نصیب ہو جائے۔"

میں نے باتوں کے دوران ہی جیب سے دس ہزار روپے گن کر نکال لئے اور مہر دین کی بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بھابی! تم لوگ مجھے غلط مت سمجھنا...... یہ کچھ پیسے ہیں۔ یہ رکھ لیں، بچوں کے کام آ جائیں گے۔"

مہر دین کی بیوی روپے لینے سے ہچکچا رہی تھی۔ مہر دین کو فکر لگ گئی کہ کہیں اس کی بیوی کے انکار کرنے پر میں وہ رقم واپس جیب میں نہ ڈال لوں اس لئے بولا۔ "اب رکھ بھی لو بگے کی ماں! یہ تو باؤ جی اپنی خوشی سے دے رہا ہے۔"

مہر دین کے اصرار پر اس کی بیوی نے رقم میرے ہاتھوں سے لے کر اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لی اور میں ان سے اجازت لے کر گھر سے نکل پڑا۔ مہر دین کی بیوی اور بچے بھی مجھے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ سب دروازے میں کھڑے ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہتے رہے۔

ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میں وہاں سے نکل کر جلد بڑی سڑک پر جا چڑھوں تا کہ کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ ایسے علاقوں میں رات کے وقت سڑکیں سنسان اور ویران پڑی ہوتی ہیں اور لٹیروں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ چونکہ سڑک ناہموار تھی اس لئے میرے لئے گاڑی تیز چلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ ہر جگہ سڑک پر گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ کوئی بھی نوک دار پتھر لگنے سے ٹائر پنکچر ہو سکتا تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے راستے میں کسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

میں نے راستے میں ہی مناسب جگہ دیکھ کر کھانا کھا لیا۔ میں دن بھر کے سفر سے تھکا ہوا تھا اور گھر پہنچ کر فوراً اپنے بیڈ پر لیٹ جانا چاہتا تھا۔ میں نے گاڑی گیراج میں پارک کی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے بمشکل کپڑے تبدیل کئے اور خود کو بیڈ پر گرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا خیال تھا کہ میں لیٹتے ہی سو جاؤں گا لیکن لیٹتے ہی دن بھر کے واقعات کسی فلم کی طرح میرے دماغ میں گھومنے لگے۔ میں کڑی سے کڑی ملاتا ہوا سوچنے لگا کہ اگر وقفوں وقفوں سے مہر دین کے ہاں چکر لگایا جائے تو یقینی طور پر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کی باتیں سوچتے ہوئے آخر کار میری آنکھ لگ گئی۔

ابھی آدھی رات کا وقت تھا۔ کسی بچے کے رونے کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی بچہ مسلسل رو رہا تھا لیکن شاید اسے کوئی چپ نہیں کرا رہا تھا اس لئے وہ روئے جا رہا تھا۔ بچے کے رونے کی آوازوں نے میری نیند خراب کر کے رکھ دی تھی۔ میں نے تکیہ اٹھا کر اپنے کان پر رکھ لیا۔ میرے اس عمل سے رونے کی آوازیں بند ہو گئیں اور کچھ دیر بعد پھر سے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح ہوئی تو بچے کے رونے کی آوازیں پھر سے میرے کانوں میں پڑیں۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ابھی تک تنویر اور جبار سو رہے تھے جبکہ الیاس اور غفور سیر کرنے نکل گئے تھے۔ میری ملازمہ اور ملازم دونوں میاں بیوی بھی ابھی تک سوئے پڑے تھے۔ میں نے سوچا کہ اٹھ تو گیا ہوں، چل کر خود ہی ناشتے کے لئے ڈبل روٹی اور انڈے وغیرہ لے آؤں۔ میں واپس اپنے کمرے میں گیا تا کہ جیب سے پرس نکال لاؤں۔ مگر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں پرس موجود نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ

میں نے جب رات کو آتے ہوئے راستے میں سے ہی کھانا کھایا تھا تو بٹوہ میرے ہاتھ میں تھا جو میں نے گاڑی میں ہی رکھ دیا تھا اور اٹھانا بھول گیا تھا۔ میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی تا کہ وہاں سے اپنا پرس نکال لوں۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اچانک میری نظر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑی اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ سیٹ پر ننگ دھڑنگ بچہ لیٹا ہوا تھا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے فوراً گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے بے ارادہ گاڑی ایک سڑک پر ڈال دی۔ ابھی تک سڑکوں پر ٹریفک کم ہی تھی۔ میں کار دوڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو میں اپنے علاقے سے دور نکل جاؤں تا کہ گاڑی میں میرے ساتھ کالا سیاہ ننگ دھڑنگ بچہ دیکھ کر مجھ پر کسی کو شک نہ ہو جائے۔

میں اپنے علاقے سے بہت دور نکل آیا تھا اور دل ہی دل میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ کسی کی نظر بچے پر نہیں پڑی۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ یہی وہ بچہ تھا جس کے رونے کی آوازیں رات بھر میرے کانوں کے پردے پھاڑتی رہیں۔ میں نے گاڑی کی سپیڈ کم کر لی اور بچے کے متعلق سوچنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی کہ یہ بچہ یقیناً مہر دین کا ہی ہے۔ جب میں گاؤں گیا تھا تو مہر دین کے سبھی بچے گاڑی کے اردگرد جمع ہو کر کھیل رہے تھے اور شرارتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ بچہ کسی وقت گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر چھپ گیا اور شاید کھیلتے کھیلتے تھک ہار کر سو گیا۔

میں زیادہ دیر تک بچے کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے فوری طور پر ٹیلی فون بوتھ سے حمد بن عبدالعزیز کے کارندوں کو فون کیا اور انہیں فوراً کسی مقام پر پہنچنے کو کہا۔ ان سے تمام معاملات طے پانے کے بعد میں نے گاڑی کا رُخ مقرر کردہ جگہ کی طرف موڑ دیا۔ وہاں پہنچا تو وہ لوگ میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں نے بچہ ان کے حوالے کیا اور رقم لے لی۔

واپسی پر میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے کسی بڑی پریشانی سے بچا لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر آج کسی کی نظر مجھ پر پڑ جاتی اور مجھ پر کسی کو شک ہو جاتا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا اور نہ جانے مجھے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں انہی

سوچوں میں گم بے مقصد مختلف سڑکوں پر چکر کاٹتا رہا۔ میرا دماغ مسلسل گھوم رہا تھا
میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ دیر تک دل و دماغ کی آپس میں لڑائی ہوتی رہی
دل کچھ کہہ رہا تھا اور دماغ کچھ مشورہ دے رہا تھا۔ جس طرح کسی بھی شخص کے لئے
راستے کا انتخاب مشکل مرحلہ ہے اسی طرح کسی راستے پر چلتے چلتے بہت آگے جا کر
واپس مڑنا اس سے کہیں دشوار ہے۔ میں بھی کچھ ایسی ہی پوزیشن سے گزر رہا تھا
میرے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری تھا۔ آخر کار دل و دماغ نے آپس میں سمجھوتہ کیا
اور فیصلہ ہوا کہ میں بچوں والے معاملے سے خود کو دور کر لوں۔ گو کہ مجھے اس کام سے
بھاری رقم وصول ہو جاتی تھی لیکن میں بے نقاب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اب تک تو جیسے
تیسے کام چل رہا تھا مگر اب بچوں کے عرب امارات سمگل ہونے کے واقعات آئے روز
اخباروں میں چھپنے لگے تھے شاید میرے علاوہ بھی کئی اور لوگ اس کام میں ملوث ہو گئے
تھے۔ پولیس بھی پوری طرح چوکس ہوگئی تھی اور جگہ جگہ چھاپے مارنے لگی تھی۔ اس سے
پہلے کہ معاملہ بگڑ جاتا میرا یہ کام چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔

میں نے خود کو پُر سکون کرنے کے لئے سڑک کے کنارے مناسب جگہ دیکھ کر
درخت کے سائے میں گاڑی کھڑی کر دی اور سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند
کر لیں۔ کچھ دیر تک میں اسی حالت میں بیٹھا رہا، پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی
طرف چل پڑا۔ صبح ناشتہ کئے بغیر ہی گھر سے نکل پڑا تھا۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی۔ میں
نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تھا۔ میرے پاس بھاری رقم موجود تھی، اسے بھی فوری طور پر
کسی ٹھکانے لگانا تھا۔

گھر پہنچا تو دونوں ملازم پریشان کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی
گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی وہ دونوں بھاگتے ہوئے میرے پاس آ گئے اور میرے
گاڑی سے باہر نکلنے سے پہلے ہی دینو چاچا نے سوال کر ڈالا۔

”چوہدری صاحب! خیر تو تھی...... صبح ہی صبح آپ کہاں چلے گئے تھے......؟“

”ہاں دینو چاچا! بس ایک ضروری کام تھا...... تم لوگ سو رہے تھے اس لئے میں
بتائے ہی نکل گیا۔“ میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

میری بات سنتے ہی دینو چاچا بول پڑا۔ ”سوئے کہاں چوہدری صاحب

بھر نہ جانے کس کا بچہ چاں چاں کرتا رہا۔ قسم لے لیں جو رات کو آنکھ لگا کر دیکھی ہو۔“

میں نے جان بوجھ کر دینو چاچا کے ساتھ کھڑی اس کی بیوی جسے ہم سب چاچی کہہ
کر پکارتے تھے، کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بولا۔

”چاچی! بہت زوروں کی بھوک لگی ہے...... تم جلدی سے کھانا تیار کر لو۔ میں اتنی
دیر میں نہا دھو کر تیار ہو جاتا ہوں...... پھر مجھے دفتر بھی جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے چوہدری صاحب! آپ چلیں، میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔“ چاچی
یہ کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل پڑی اور دینو چاچا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

کمرے میں جاتے ہی میں باتھ روم میں گھس گیا۔ نہانے سے فارغ ہو کر کمرے
میں آیا تو چاچی کھانا رکھ کر جا چکی تھی۔ زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ کھانا دیکھ کر اور
بھی چمک اٹھی۔ اس لئے مزید انتظار کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے کپڑے
وغیرہ تبدیل کرنے سے پہلے ہی کھانا کھانے کا ارادہ کر لیا۔ ویسے بھی ابھی بال گیلے
تھے۔ کھانا کھانے کے بعد مجھ میں جان پڑ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے کپڑے
تبدیل کئے اور دفتر روانہ ہو گیا۔

دفتر پہنچا تو عروج اپنی سیٹ پر موجود تھی جبکہ گوہر کی سیٹ خالی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی
وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا اور پوچھا۔ ”یہ
گوہر کہاں گیا ہے......؟“

”گوہر صاحب تو رجسٹری کے کاغذات لینے کچہری گئے ہیں...... میرے خیال میں
آتے ہی ہوں گے۔“

”چلیں ٹھیک ہے...... اور کوئی فون وغیرہ تو نہیں آیا؟“

عروج بدستور کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑے کھڑے پیڈ اٹھایا اور دیکھ کر بولی۔
”سر! ایک تو ارشاد صاحب کا فون آیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک امتیاز صاحب کا تین بار
فون آ چکا ہے...... انہوں نے اپنا فون نمبر بھی لکھوایا ہے...... وہ کہہ رہے تھے کہ جیسے ہی
آپ آئیں، فوراً فون ضرور کریں۔“

ارشاد صاحب کی تو سمجھ آ رہی تھی کہ انہوں نے اپنے پلاٹ کے متعلق پوچھنا ہوگا۔
لیکن ملک امتیاز صاحب کا نام پہلی بار سنا تھا۔ میں نے ملک امتیاز صاحب کا فون نمبر لیا

اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ بیٹھتے ہی میں نے نمبر ملایا اور ملک امتیاز صاحب سے بات
کی۔ انہوں نے فون سنتے ہی کہا کہ آپ فون رکھ دیں۔ میں تھوڑی ہی دیر میں آپ
کے دفتر پہنچ رہا ہوں، وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میری تشویش اب بھی اپنی جگہ تھی
کیونکہ میں کسی ملک امتیاز کو نہیں جانتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں کوئی نئی مصیبت
نازل ہو جائے۔ ابھی فون کئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا
اور ایک بارُعب شخص اندر داخل ہوا۔ اس شخص نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے سامنے
بیٹھ گیا۔

''مجھے ملک امتیاز کہتے ہیں...... ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے آپ سے فون پر بات ہوئی
تھی۔''

میں نے اس شخص کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا اس لئے بات بڑھانے کے لئے
پوچھا۔''فرمائیے...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں......؟''

''یوں لگتا ہے شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں......'' پھر اپنے سوال کا خود ہی جواب
دیتے ہوئے ملک صاحب بولے۔'' آپ نے کرسٹل پلازہ کا نام تو یقیناً سنا ہی ہوگا۔
میں اس کا مالک ہوں۔''

کرسٹل پلازہ کا نام سنا تو مجھے یاد آ گیا کہ میں نے آتے جاتے راستے میں کئی بار
کرسٹل پلازہ دیکھا تھا اور کئی لوگوں سے سنا تھا کہ اس کا مالک ملک امتیاز نامی شخص ہے۔

''بہت خوشی ہوئی ملک صاحب آپ سے مل کر۔ ویسے تو میری خوش نصیبی ہے کہ
آپ جیسی بڑی شخصیت میرے ہاں تشریف لائی۔ لیکن ملک صاحب! آپ مجھے حکم
دیتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔'' میں نے اخلاقاً ملک امتیاز صاحب سے بات کی تو وہ
بولے۔

''چوہدری صاحب! آپ سے کام مجھے تھا اس لئے یہاں آنا بھی میرا ہی حق بنتا
تھا۔''

''حکم کریں ملک صاحب......''

''حکم کیا کرنا ہے چوہدری صاحب! دراصل میں فوری طور پر کرسٹل پلازہ فروخت
کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی پارٹی ہو تو بتائیں۔''

ملک امتیاز صاحب کے منہ سے کرسٹل پلازہ کو فروخت کرنے کا سن کر مجھے
زبردست جھٹکا لگا۔''ملک صاحب! جہاں تک مجھے علم ہے، میں نے لوگوں سے یہی سنا
ہے کہ آپ نے خود کھڑے ہو کر بہت شوق سے کرسٹل پلازہ تعمیر کروایا تھا...... یہی وجہ
ہے کہ کرسٹل پلازہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن...... اب ایسی کیا وجہ بن گئی کہ آپ اسے
فروخت کرنا چاہتے ہیں؟''

میری بات سن کر ملک صاحب نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولے۔''اس میں کوئی شک
نہیں کہ کرسٹل پلازہ میرا خواب تھا جو پورا ہوا۔ لیکن بعض اوقات انسان اولاد کے
ہاتھوں اس قدر مجبور و بے بس ہو جاتا ہے کہ اسے وہ کچھ کرنا پڑ جاتا ہے جو وہ کسی بھی
صورت میں کرنے پر تیار نہیں ہوتا...... میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ کرسٹل
پلازہ کی ملکیت اور آمدن کے سلسلے میں آئے دن میرے بیٹوں کے درمیان لڑائی جھگڑا
ہوتا رہتا ہے۔ بیٹوں کی دیکھا دیکھی میرے داماد بھی اپنے حصے کے لئے مطالبہ کرنے
لگے ہیں۔ اب حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ کل رات میرے بیٹے اور داماد
آپس میں جھگڑ پڑے اور ایک دوسرے پر پستول تان کر کھڑے ہو گئے۔ اسی لئے میں
چاہتا ہوں کہ فساد کی اس جڑ کو سرے سے ہی ختم کر دوں۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے
گی بانسری...... میں نے آپ کی بہت شہرت سنی ہے۔ بس آپ جتنی جلدی ممکن ہو، اس
کا سودا طے کروا دیں۔ یوں سمجھ لیں کہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''ملک صاحب! آپ شرمندہ تو نہ کریں...... میں تو خیر کسی قابل بھی نہیں...... کوئی
شخص محبت اور لگن سے کوئی عمارت تعمیر کروائے تو اسے فروخت کرتے ہوئے یقیناً دُکھ
ہوتا ہے لیکن اگر حالات نے آپ کو کرسٹل پلازہ فروخت کرنے پر مجبور کر دیا ہے تو مجھ
سے جو ہو سکا میں ضرور کروں گا۔ بس آپ مجھے اپنی شرائط اور قیمت وغیرہ بتا جائیں۔''

''کوشش کریں کہ سودا نقد ہی طے ہو جائے۔ لیکن اگر مجبوری کی حالت میں کچھ
وقت دینا پڑا تو جیسے آپ مناسب سمجھیں کر لیجئے گا...... بس یہ خیال رکھئے گا کہ سودا کسی
بھی صورت میں سات کروڑ سے کم میں طے نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی حالات کی نزاکت
کو دیکھتے ہوئے کم قیمت پر فروخت کرنے پر تیار ہوں۔ ورنہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ
اس کی ملکیت آٹھ، ساڑھے آٹھ کروڑ سے کم نہیں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! اب آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آج ہی سے بلکہ سے کوشش شروع کر دیتا ہوں۔ جو خدا کو منظور ہوا، وہ ہو جائے گا......''

میری بات سنتے ہی ملک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی کھڑا ہوا اور ان کو باہر تک چھوڑنے آیا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

کرسٹل پلازہ جدید طرزِ تعمیر کا مکمل نمونہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راہ چلتے کی نظر اس پر پڑ جاتی وہ تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنی خوبصورتی کے ساتھ کرسٹل پلازہ ایک ایسے کمرشل ایریا میں تعمیر کیا گیا تھا جو کاروباری نقطۂ نگاہ سے جاذب نظر تھا۔ ملک صاحب کے جانے کے بعد میں نے ان لوگوں کی لسٹ اپنے سامنے لی جو جائیداد کے لین دین میں سرمایہ کاری کرتے تھے۔ میں ایک ایک کر کے باری سبھی کو فون کرنے لگا۔ میں جس کسی کو فون کرتا اور کرسٹل پلازہ فروخت ہونے کی بات کرتا تو وہ حیران ہو کر پہلا سوال یہی کرتا۔ ''کرسٹل پلازہ فروخت ہو رہا ہے'' مجھے اس پلازہ کے فروخت ہونے پر بھاری رقم ملنا تھی اس لئے میں نے اپنی بھرپور کوشش جاری رکھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات پورے علاقے میں پھیل گئی کہ کرسٹل پلازہ فروخت ہو رہا ہے۔

کرسٹل پلازہ خریدنے کے بہت سے امیدوار تھے۔ مگر کہیں نہ کہیں سے ہر کسی کے علم میں یہ بات آ گئی تھی کہ ملک امتیاز صاحب خاندانی جھگڑوں سے تنگ آ کر پلازہ جلد از جلد فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہر کسی کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح ملک صاحب کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کم سے کم قیمت میں کرسٹل پلازہ لے۔ ملک صاحب نے بھی دنیا دیکھی تھی، وہ بھی حالات کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ انہوں نے میرے ذریعے لوگوں کے کانوں میں یہ بات ڈلوا دی کہ اب ملک صاحب کو کرسٹل پلازہ فروخت کرنے کی کوئی جلدی نہیں۔ ہاں اگر کوئی خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہو تو نقد ادائیگی کی شکل میں آٹھ کروڑ سے کم قیمت میں سودا طے نہیں ہو گا۔ جو لوگ ملک صاحب کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی آس لگائے بیٹھے تھے، وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

مجھے کرسٹل پلازہ فروخت کرنے کے سلسلے میں مختلف پارٹیوں کے ساتھ کئی بار کرسٹل پلازہ جانا پڑا۔ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی جب میرے دل میں اس خیال نے انگڑائی لی کہ کسی طرح میں خود کرسٹل پلازہ خرید لوں۔ میں نے بار بار اپنے اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دل میں ایک ہی بات سما گئی کہ کسی بھی طرح کرسٹل پلازہ خریدنا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں اپنی تمام جائیداد فروخت کر دیتا اور تمام تر جمع پونجی بھی اکٹھی کر لیتا تو پھر بھی اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے اپنے دل کو لوریاں دے کر سلا دیا۔

چونکہ ملک صاحب مجبوری کے عالم میں پلازہ فروخت کرنا چاہ رہے تھے اس لئے کوئی بھی پارٹی ملک صاحب کی مطلوبہ رقم ادا کرنے کو تیار نہ تھی۔ جوں جوں پلازہ فروخت ہونے میں تاخیر ہو رہی تھی، ملک صاحب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دن میں کئی کئی بار فون پر پلازہ کی بابت پوچھتے۔ میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ ملک صاحب آ گئے اور آتے ہی بولے۔

''چوہدری صاحب! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تجارتی مرکز ہونے کے باوجود پلازہ فروخت کیوں نہیں ہو رہا......؟''

''میں آپ کی پریشانی کو سمجھتا ہوں ملک صاحب! مگر میری لاکھ کوشش کے باوجود کوئی مناسب قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں۔ پھر بھی آپ فکر نہ کریں، میں کئی پارٹیوں سے مسلسل رابطے میں ہوں۔ جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوئی، میں خود حاضر ہو کر بتا دوں گا۔''

''آخر کوئی تو وجہ ہو گی چوہدری صاحب! کوئی تو ایسا شخص ہو گا جو پلازہ خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔''

''ملک صاحب...... اگر...... میں کرسٹل پلازہ خریدنا چاہوں تو...... مجھے کتنے میں دیں گے......؟''

ملک صاحب کی بات سنتے ہی نہ جانے کیسے میری زبان سے بات پھسل گئی۔ حالانکہ اس سے قبل میں نے دل کی بات کبھی زبان پر نہیں آنے دی تھی۔ میری بات سن کر ملک صاحب نے بغور میری طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر بولے۔

''چوہدری صاحب! ایسی بات تھی تو آپ نے مجھے پہلے کہہ دیا ہوتا۔ اتنا وقت ضائع

کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ یقین کریں ملک صاحب! میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ کسی طرح
فروخت ہو جائے۔ مجھے آپ کی پریشانی کا تو یقیناً خیال ہے ہی لیکن ساتھ ساتھ
کمیشن کا بھی لالچ ہے۔ بھلا میں نے کوشش کیوں نہیں کی ہوگی۔ جہاں تک
خریدنے کے متعلق میری ذات کا تعلق ہے، اس سلسلے میں بھی میری کوئی خاص
نہیں تھی۔ یہ تو میں نے یونہی ضمنی سی بات کی تھی جبکہ میں جانتا ہوں کہ شاید میں
بڑی رقم کا بندوبست نہ کر پاؤں۔"

"چلیں چوہدری صاحب! ایسا کر لیتے ہیں۔ آپس میں بیٹھ کر ایک رقم طے کر
ہیں۔ وہ رقم ادا کرنے کے لئے میں آپ کو کچھ وقت بھی دے دیتا ہوں۔ اس عر
میں پلازہ کسی پارٹی کو دے کر اپنا منافع کھرا کر لیں یا پھر خود رقم کی ادائیگی کر دیں۔"

ملک صاحب کی بات سن کر میں تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا، پھر بڑ
اعتماد کے ساتھ ملک صاحب کو جواب دیا۔ "ٹھیک ہے ملک صاحب! مجھے منظور
آپ کو مقررہ وقت پر طے شدہ رقم مل جائے گی۔ اس دوران میں چاہے کتنی بھی
سودا طے کر لوں یا پھر خود کوئی بندوبست کروں لیکن اس کے لئے آپ مجھے کم از کم
ضرور دیں تاکہ میں وعدے کے مطابق آپ کو آپ کی رقم دے سکوں۔"

میری بات سنی تو ملک صاحب کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور فوراً بولے۔ "ٹھیک
منظور ہے...... آج سے ٹھیک چھ ماہ بعد آپ مجھے چھ کروڑ ستر لاکھ روپے نقد ادا کر
گا۔ میں سمجھوں گا کہ میں نے اوپر کی رقم آپ کو بطور کمیشن ادا کر دی۔"

"جیسے آپ کی خوشی ملک صاحب! میں آپ کے فیصلے کے آگے ایک لفظ بھی
کہوں گا۔ اور زندگی رہی تو حسب وعدہ ٹھیک چھ ماہ بعد پلازے کی رقم آپ
ہاتھوں میں ہوگی۔"

"تو اب میں بے فکر ہو جاؤں......؟"

"جی ملک صاحب...... پلازہ اب میری سر دردی ہے۔ آپ مطمئن ہو کر دوسر
کاموں پر توجہ دیں۔"

میری بات سن کر ملک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا چوہدری صاحب!

اجازت دیں۔"

"اللہ حافظ ملک صاحب۔"

ملک صاحب کے جانے کے بعد میں کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے آئندہ
پروگرام کے متعلق منصوبہ بندی کرنے لگا۔ میں کوشش کے باوجود بھی پلازہ خریدنے کی
خواہش کو دبا نہیں سکا تھا اور دل کی بات ہونٹوں پر آ گئی تھی۔ ملک صاحب سے اس
بات کا تذکرہ کرنے سے قبل میں نے اپنی تمام تر توانائیاں پلازہ فروخت کرنے پر
صرف کر دی تھیں لیکن ملک صاحب سے بات کرنے کے بعد میں نے پلازہ فروخت
کرنے کی کوششیں مکمل طور پر ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دل میں پروگرام بنا لیا کہ
اب جو بھی ہو، پلازہ خود خریدوں گا۔ دن بھر اپنے ذہن میں پروگرام ترتیب دیتا رہا۔ مگر
مجھے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں بہت سی مشکلات دکھائی دیں۔

رات کو بیڈ پر لیٹا تو انہی سوچوں نے مجھے آ گھیرا۔ میں نے ملک صاحب سے وعدہ
تو کر لیا تھا لیکن اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی
تھی۔ رات کروٹیں لیتے ہوئے گزر گئی۔ مسجدوں سے فجر کی اذان کی آوازیں آنے لگیں
مگر میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کب تھک ہار کر آنکھیں خود ہی بند ہو گئیں
اور میں سو گیا۔

آنکھ کھلی تو میری نظر دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ میں
نے فوراً بیڈ چھوڑ دیا اور چاچی کو ناشتے کا کہہ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ مجھے دفتر جلدی
پہنچنا تھا کیونکہ ایک پارٹی نے اپنے پلاٹ کے سلسلے میں بات چیت کرنے کے لئے مجھ
سے ٹائم طے کر رکھا تھا۔ اس لئے جتنی جلدی ممکن تھا، میں نے تیار ہو کر ناشتے کے بعد
دفتر کی راہ لی۔ دفتر پہنچا تو وہ لوگ پہلے سے میرے کمرے میں بیٹھے میرے منتظر تھے۔
میں نے ان سے تاخیر سے آنے کی معذرت کی اور چند رسمی باتوں کے بعد پلاٹ کے
سلسلے میں بات چیت شروع کر دی۔

وہ لوگ دو گھنٹے تک بلاوجہ میرا دماغ چاٹتے رہے جبکہ میرا ذہن مسلسل کرسٹل پلازہ
میں الجھا ہوا تھا۔ میں ان لوگوں سے کسی طرح جان چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن وہ وہاں سے
جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ میں جان بوجھ کر دوسری مختلف پارٹیوں سے فون

پر بات کرنے لگا اور انہیں توجہ نہ دی۔ وہ کچھ دیر بیٹھے رہے، آخر کار خود ہی اجازت لے کر چلے گئے۔ میں نے ان کے جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور کیلکولیٹر لے کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے میز پر ایک کاغذ پڑا تھا جس پر میری تمام جائیداد اور بینک بیلنس وغیرہ کی تفصیل درج تھی۔ لیکن بار بار کی جمع تفریق کے بعد بھی کسی طرح کرسٹل پلازہ خریدنے کے لئے معقول رقم نہیں بن رہی تھی۔

میں عجیب اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا جس کا بظاہر کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کسی اور کے ہاتھ پلازہ فروخت کرنے کو تیار نہ تھا اور خود خریدنے کے لئے وسائل نہیں تھے۔ تین چار روز اسی تناؤ میں گزر گئے۔ آخر میرے ذہن میں ایک نئے آئیڈیا نے انگڑائی لی اور میں اس آئیڈیا کے متعلق منصوبہ بندی کرنے لگا۔ میرے پاس چھ ماہ کا ٹائم تھا جس میں سے چند روز تو پہلے ہی سوچ بچار کی نذر ہو گئے تھے اس لئے میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گوہر کو تمام معاملات سمجھائے اور عروج کو ضروری ہدایات دے کر اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ میں عام طور پر کلین شیو رہتا تھا اور دوسرے روز شیو ضرور کروا لیتا تھا۔ لیکن روانہ ہونے سے قبل چند روز تک میں نے جان بوجھ کر شیو نہ کروائی جس کی وجہ سے میرے چہرے پر داڑھی اُگ آئی تھی۔

اپنی عادت کے مطابق میں نے کسی کو بھی اپنے پروگرام کے متعلق آگاہ نہیں کیا تھا بس اتنا ہی کہا تھا کہ میں کچھ ضروری کاروباری معاملات کے سلسلے میں شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ کچھ روز بعد ہی واپسی ہو گی۔ میں نے پٹرول کی ٹینکی فُل کروا لی اور ان دیکھی منزل کی طرف نکل پڑا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ میں محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوا شہر سے بہت دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ راستے میں کئی چھوٹے بڑے شہر آئے لیکن کہیں کچھ دیر کے لئے بھی نہ رکا۔ کیونکہ میری منزل کہیں آگے تھی۔ گاڑی بھی کافی گرم ہو گئی تھی اور مجھے بھوک بھی ستانے لگی تھی۔ میں نے سڑک کے کنارے ایک مناسب ریسٹورنٹ دیکھ کر گاڑی روک دی۔ گاڑی رکتے ہی ایک لڑکا ہاتھ میں میلا کچیلا کپڑا لئے آ گیا۔ وہ گاڑی صاف کرنے لگا اور میں ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد فریش ہو کر میں ایک کونے میں خالی میز دیکھ کر جا بیٹھا۔

مجھے دیکھتے ہی باوردی ویٹر ہاتھوں میں مینو کارڈ تھامے میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے مینو کارڈ میرے سامنے رکھ دیا اور آرڈر کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے مینو ایک طرف کر دیا اور اس سے پوچھا کہ آج کون کون سی چیز پکی ہے؟ میری بات سنتے ہی ویٹر نے کسی مشین کی طرح سپیڈ سے تمام اشیاء کے نام گنوا دیئے۔ تمام تفصیل سن کر میں نے اسے دال ماش اور روٹی لانے کو کہا۔ کیونکہ مجھے اس بات کی تسلی تھی کہ دال ماش میں تو کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کی گئی ہو گی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ لوگ سبزیاں اچھی قسم کی نہیں پکاتے اور گوشت بھی نہ جانے کس قسم کا ہو۔

کچھ دیر بعد ویٹر کھانا لے آیا اور میرے سامنے میز پر لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد میری تمام تر تھکن دور ہو گئی تھی اور میں پھر سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہونے کے لئے تیار تھا۔ میں نے جان بوجھ کر بل ادا کرنے کے بعد کھانے کے بل سے کہیں زیادہ پیسے ٹپ کے طور پر ویٹر کو دے دیئے۔ کیونکہ یہ سڑک کنارے بنا صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا اور میرا ارادہ تھا کہ واپسی پر بھی یہاں کچھ دیر ٹھہروں گا۔ مجھے علم تھا کہ ایسے میں ویٹر کو دی ہوئی ٹپ میرے بہت کام آئے گی۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر میں نے ایک بار پھر گاڑی اسی سڑک پر ڈال دی اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ دھوپ ڈھل گئی تھی اور سورج کی روشنی مدھم پڑنے لگی تھی۔ مین روڈ سے ایک چھوٹی سی سڑک نکل رہی تھی جو ویران دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔ کچھ فاصلے تک سڑک درست حالت میں تھی۔ اس کے بعد کچی پکی سڑک کا آغاز ہو گیا۔ سڑک کے دائیں بائیں کچھ کچھ فاصلے پر چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی آباد تھے لیکن ابھی مجھے اور آگے جانا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اب یقیناً میں اپنی ان دیکھی منزل کے قریب تھا۔ دور کہیں سے مغرب کی اذان کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگلا گاؤں اب زیادہ دور نہیں۔ ابھی تھوڑا سا آگے بڑھا تھا کہ مجھے گاؤں دکھائی دینے لگا۔ چونکہ اندھیرا پھیل رہا تھا اس لئے کہیں کہیں سے بلب کی روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے گاڑی گاؤں کی طرف موڑ دی۔ گاؤں میں داخل ہوا تو ایک دیہاتی اپنی

بھینوں کو باندھ رہا تھا۔ گاڑی کے انجن کی آواز سن کر اس کی نظر میری طرف اٹھ گئی۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر میں اس نے اس کے قریب ہی گاڑی روک دی۔ وہ پچاس پچپن برس کا دیہاتی شخص تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے تین چار روز سے اس نے شیو نہیں کروائی تھی۔ اس کے سر کے بال بھی زیادہ تر سفید ہو چکے تھے اور جو سیاہ تھے وہ بھی سر پر مٹی اور گرد و غبار پڑنے سے سفید دکھائی دے رہے تھے۔

وہ شخص اپنی جگہ کھڑا مجھے بغور دیکھنے لگا۔ میں گاڑی سے باہر نکل آیا اور اس سے بات کرنے کے لئے اس کے قریب چلا گیا۔ وہ اب بھی اپنی جگہ کھڑا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر سلام کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر اس نے بھی اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ اس شخص کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ شاید اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی نئے ماڈل کی کار دیکھ کر الجھ گیا تھا کہ گاڑی میں آنے والا مہمان اس کا تو نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کون ہے؟ مجھے اس کی پریشانی کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ میں نے راستے میں ایک دو جگہ رُک کر جیون پور گاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں اور جانتا تھا کہ جیون پور اس گاؤں سے کم از کم چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں نے بات بڑھانے کے لئے جان بوجھ کر سوال کیا۔

"مجھے جیون پور جانا ہے...... چاچا! کیا تم بتا سکتے ہو جیون پور یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"پتر! جیون پور تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

"چاچا! میں نے کون سا پیدل جانا ہے۔ بس تم مجھے سمجھا دو، میں کسی نہ کسی طرح خود ہی پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن پتر! اس وقت تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔"

"اصل میں چاچا! مجھے وہاں ایک شادی میں شریک ہونا تھا۔ میں راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں...... اب تک تو بارات بھی آ چکی ہو گی۔ وہاں کا چوہدری میرا دوست ہے۔ اس کی بہن کی شادی ہے۔ اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ ضرور آنا۔ اگر میں نہ پہنچا

تو مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے بہت شرمندگی ہو گی۔"

"دیکھو پتر! جس سڑک سے تم آئے ہو، واپس اسی سڑک پر جا کر بڑی سڑک پر چڑھو تو کچھ فاصلے پر آگے اسی ہاتھ میں ایسی ہی ایک سڑک مڑتی ہے۔ وہ سیدھی جیون پور ہی جاتی ہے۔"

"بس ٹھیک ہے چاچا...... میں پہنچ جاؤں گا۔"

"پتر! میری مانو تو رات یہیں رک جاؤ۔ آئے دن وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر رات کے وقت آنے جانے والوں کو راستے میں لوگ لوٹ لیتے ہیں۔ ویسے بھی اب تک تو بارات واپس بھی جا چکی ہو گی۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو چاچا... لیکن.... ایک انجان آدمی کو اپنے ہاں کون ٹھہرائے گا؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو پتر...... ہم دیہاتی لوگ ہیں، آنے والے مہمانوں کو اپنے گھر ٹھہرا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔"

چاچا کی بات سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنی صحیح منزل پر آ پہنچا ہوں۔ مجھے اپنی کامیابی پر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اب تک تو تمام کام میری منصوبہ بندی کے مطابق ہو رہے تھے۔ مجھے خاموش دیکھ کر چاچا پھر بول پڑا۔

"پتر! شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں رات کیسے گزرے گی۔ لیکن پتر! ہم غریب سہی، مگر ہمارا دل بہت بڑا ہے۔ فکر نہ کرو، تمہیں روکھی سوکھی جیسی بھی ہو گی، کھانے کو مل جائے گی اور سونے کو بستر بھی۔"

"نہیں چاچا نہیں...... تم شرمندہ نہ کرو۔ میں تو خود غریب سا بندہ ہوں اور ہر انسان کے پاس کچھ ہو نہ ہو، اس کا دل بڑا ہونا چاہئے۔ تمہارا یہ احسان کیا کم ہے کہ تم نہ صرف مجھے پریشانی سے بچا رہے ہو بلکہ اپنے ہاں رہنے کو بھی کہہ رہے ہو۔"

ابھی میں بات کر رہا تھا کہ ایک نوجوان جو میلے کچیلے لباس میں تھا اور اس کے پاؤں مٹی سے بھرے پڑے تھے، آ گیا۔ اسے دیکھ کر چاچا نے کہا۔

"مکھن! تو ایسا کر جلدی سے جا کر بیٹھک کا دروازہ کھول دے اور چوہدری صاحب کو بٹھا اور اپنی ماں سے کہہ کہ جلدی سے کھانا تیار کرے۔"

"ٹھیک ہے ابا......" یہ کہتے ہوئے وہ نوجوان چل پڑا اور میں اس کے پیچھے پیچھے

لیا۔ میں نے گاڑی کو لاک کر دیا تھا۔ گاڑی چاچا کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ گاؤں کا جو بھی شخص وہاں سے گزرتا، ان کے دروازے پر کھڑی گاڑی دیکھ کر آگے بڑھ جاتا اور چاچا کی گردن یہ سوچ کر اکڑ جاتی کہ گاڑی والا مہمان اس کے ہاں آیا ہے۔

مکھن مجھے دروازے سے باہر ہی رکنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد ہی اندر سے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں اندر داخل ہو گیا۔ مکھن مجھے وہاں بٹھا کر خود وہاں سے چلا گیا۔ بیٹھک میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف دو کرسیاں اور میز پڑا تھا۔ کرسیوں اور میز پر جمی ہوئی مٹی کی تہوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ کئی دنوں سے نہ ہی کرسیوں پر کوئی آ کر بیٹھا تھا اور نہ ہی ان کی صفائی کی گئی تھی۔ کمرے میں چھت والا پنکھا لگا ہوا تھا۔ چونکہ کمرے میں مچھر بہت تھے اس لئے ان سے بچنے کے لئے میں نے خود ہی اٹھ کر ہلکی سپیڈ میں پنکھا چلا دیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد مکھن آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سفید کھیس اور سرہانہ پکڑا ہوا تھا جس پر ہاتھ سے پھول کڑھے ہوئے تھے اور شعر بھی لکھے گئے تھے۔ اس نے کھیس میرے پاؤں کے نیچے رکھ دیا تاکہ مجھے چارپائی نہ چبھے اور سرہانہ میرے سر کے نیچے رکھ دیا اور خود وہاں سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر آ گیا۔ اب کی بار اس نے ہاتھ میں ایک کپڑا پکڑا ہوا تھا۔ اس نے اس کپڑے سے میز اور کرسیاں صاف کیں اور چلا گیا۔

چاچا بھینسوں سے فارغ ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر میرے پاس آ بیٹھا اور بولا۔ "پتر! ہم غریب سے دیہاتی لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہ ہو۔ لیکن پتر! ہم دیہاتیوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ جو بھی پیار سے ملتا ہے اسے اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں۔"

"چاچا! کوئی گاؤں میں رہتا ہو یا شہر میں۔ ہیں تو سبھی انسان ہی ناں۔ بلکہ شہر والے تو کسی انجان اور اجنبی شخص کو گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔ تم نے تو مجھے اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔"

"بس پتر! شہر کے لوگوں کا اپنا مزاج ہے اور گاؤں والوں کی اپنی دنیا ہے۔ اچھا خیر...... تم چھوڑو ان باتوں کو...... اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو، تھک گئے ہو گے۔ اگر نہانا

چاہو تو نہا لو۔ تمہاری چاچی روٹی پانی کا بندوبست کر رہی ہے۔ بس تھوڑی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا۔"

"نہیں چاچا! نہانے کی تو ضرورت نہیں البتہ بھوک بہت زوروں کی لگی ہوئی ہے۔"

"پتر! زیادہ بھوک لگی ہے تو جب تک کھانا تیار ہوتا ہے کچھ اور کھانے کو لے آؤں؟"

"رہنے دو چاچا! اس کی ضرورت نہیں۔ بس جب کھانا تیار ہو گا، کھا لیں گے۔ تب تک کوئی بات سناؤ۔ اپنی، اپنے گاؤں کی، گاؤں والوں کی، کھیتوں اور فصلوں کی، بیل بھینسوں کی......"

میری بات سن کر چاچا ہنس پڑا اور اس کے بڑے بڑے پیلے دانت باہر نکل آئے۔ اس نے اپنی ہنسی روکی اور بولا۔ "لگتا ہے تمہیں گاؤں اچھا لگتا ہے۔ کہیں تمہارا بھی تعلق کسی گاؤں سے تو نہیں......؟"

چاچا کے اس سوال پر میں کچھ پریشان سا ہو گیا لیکن خود کو فوراً سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا اور بولا۔ "نہیں چاچا! میرا گاؤں سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ میں تو لاہور شہر کا رہنے والا ہوں۔ بس مجھے گاؤں کا ماحول، گاؤں کے لوگ اور ان کی سادگی اچھی لگتی ہے۔ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ نہیں۔ بہت سادہ دل ہوتے ہیں۔"

"ہاں پتر! بات تو تمہاری صحیح ہے...... اب دیکھو ناں، یہ سادگی نہیں تو اور کیا ہے کہ باپ دادا کی زمینیں بٹوارہ ہوتے ہوتے تھوڑی تھوڑی رہ گئی ہیں لیکن پھر بھی وہی کھیتی باڑی ہو رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہمیں کھیتی باڑی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ نہ ہمارے باپ دادا نے ہمیں کچھ سکھایا اور نہ آگے ہم اپنی اولاد کو کوئی اور راہ دکھا رہے ہیں۔ مکھن میرا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ گاؤں میں آٹھویں جماعت تک سکول گیا تھا۔ میں نے اسے آٹھ جماعتیں پڑھا دیں، پھر اپنے ساتھ ہی کھیتی باڑی کے کاموں میں لگا لیا۔"

"اس کا مطلب ہے چاچا! سارے کے سارے گاؤں والے سوائے کھیتی باڑی کے اور کچھ نہیں کرتے۔"

"زیادہ تر تو کھیتی باڑی سے ہی گزارہ کرتے ہیں۔ کچھ گھر ہیں جن کے بچے پڑھ لکھ گئے اور شہروں میں جا کر نوکریاں کر لیں۔ گاؤں کے ایک دو لڑکے فوج میں بھی ہیں۔"

میں چاچا کی بات آگے بڑھانا چاہتا تھا لیکن مکھن کو بیٹھک میں داخل ہوتے دیکھ
خاموش ہو گیا۔ مکھن کے ایک ہاتھ میں چنگیر اور دوسرے میں سالن کی پیالی پکڑی ہو
تھی۔ وہ کھانا لئے سیدھا میرے پاس آ گیا اور میری چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہو
گیا۔ اسے کھڑا دیکھ کر میں تھوڑا سا سمٹ گیا تا کہ وہ کھانا رکھ دے۔ مکھن نے چارپا
پر ہی کھانا میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور لڑکا ہاتھ میں پانی کا ج
اور گلاس لئے داخل ہوا۔ اس نے پانی کا جگ اور گلاس میرے پاس ہی زمین پر رکھ
اور خود ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''اوئے کالو...... تمہاری پڑھائی لکھائی کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ گھر میں مہمان آ
ہے۔ نہ سلام نہ دعا، بس آرام سے آ کر کھڑا ہو گیا۔''

چاچا کی بات سنتے ہی کالو تیزی سے میری طرف آیا اور سلام کے لئے اپنا ہاتھ
میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور اسے اپنے پاس
بٹھا لیا۔

''یہ مکھن سے چھوٹا ہے، کالو...... ماشاء اللہ ساتویں کلاس میں ہے اور پڑھائی م
بڑا تیز ہے۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی پڑھاتا ہے۔'' چاچا نے کالو کی تعریف کی
تو میں نے کالو کا گال ہلکا سا تھپتھپایا اور بولا۔

''واہ۔ اس کا مطلب ہے کالو تو بہت لائق ہے۔ اسے تو کچھ انعام بھی ملنا چاہئے۔''
یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے بٹوہ نکال لیا اور ایک ہزار روپے کا نوٹ نکال کر اس
کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''شاباش بھئی کالو! اسی طرح دل لگا کر بڑھتے رہو۔''

''رہنے دو پتر! اس کی ضرورت نہیں...... تم کھانا کھاؤ، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''چاچا! تم بھی آ جاؤ ناں میرے ساتھ ہی۔''

''او پتر! ہم تو کب کے کھا پی کر فارغ ہوئے بیٹھے ہیں۔ تم بسم اللہ کرو......''

کالو نے ہزار کا نوٹ لیا اور اندر بھاگ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے مکھن بھی نکل گیا۔
میں کھانا کھانے لگا اور چاچا حقہ پینے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے گلاس میں
پانی لیا اور بیٹھک کے باہر جا کر ہاتھ دھوئے۔ پھر واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ چاچا
حقہ پی رہا تھا۔ حقہ پیتے پیتے کبھی کبھی کھانسنے لگتا۔ وہ کھانستے ہوئے حقے کی نے اپنی

طرف کر دیتا۔ ذرا سی کھانسی رکتے ہی حقے کی نے پھر سے منہ میں دبا لیتا اور حقے کے
کش لینے لگتا۔ میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات شروع کرنے کے
لئے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا اور بولا۔

''چاچا! ہماری چاچی نے کھانا بہت اچھا پکایا ہے۔ سچ پوچھو تو مزہ آ گیا۔''

''بس پتر! جیسی روکھی سوکھی ہم کھاتے ہیں ویسی لا کر تمہیں دے دی ہے۔ تمہارے
لئے کوئی خاص بندوبست تو نہیں کیا۔''

''چاچا! ایک بات کروں......؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ ایک چھوڑ ہزار باتیں کرو۔''

''چاچا...... یہ مکھن جوان ہے۔ آٹھ جماعت پاس ہے، ہیرا ہے ہیرا...... کھیتی باڑی
کے کاموں میں تو یہ ضائع ہو جائے گا۔''

''پھر اور کیا کریں پتر......؟''

''اگر تم کہو تو اسے دُبئی بھیج دوں......؟''

دُبئی کا نام سنتے ہی چاچا کی آنکھیں چمک اٹھیں مگر پھر کچھ سوچ کر اگلے ہی لمحے
چمک ماند پڑ گئی اور بولا۔ ''ہمارے ایسے نصیب کہاں۔ اور پھر دُبئی جانا کون سا آسان
کام ہے۔''

''چاچا! وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ بلکہ میں تمہیں بتانا بھول ہی
گیا کہ لاہور میں میرا اپنا دفتر ہے...... میرے پاس اکثر ویزے آتے رہتے ہیں اور میں
لوگوں کو باہر کے ملکوں میں بھجواتا ہوں۔ آپ نے مجھے اتنی عزت دی ہے۔ کیا میں آپ
کا یہ کام نہیں کر سکتا؟...... مکھن دُبئی چلا جائے تو مجھے خوشی ہو گی اور......'' ابھی میں بات
کر رہا تھا کہ ایک شخص ہاتھ میں لاٹھی لئے اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر خاموش ہو
گیا۔ اسے دیکھتے ہی چاچا بول اٹھا۔

''آ جا، آ جا...... آ، اِدھر میرے پاس بیٹھ جا......'' پھر میری طرف دیکھتے ہوئے
بولا۔ ''یہ فقیر محمد ہے۔ جسے ہم فقیرا کہتے ہیں۔ یہ میرے بچپن کا دوست ہے جسے ہم
لوگ لنگوٹیا یار کہتے ہیں۔''

فقیرا سلام دُعا کے بعد دوسری چارپائی پر چاچا کے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا۔ ''باہر کار

کھڑی دیکھی تو میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی مہمان آیا ہے۔ میں نے سوچا مل آؤں۔"

"اچھا کیا جو تم آ گئے۔ اگر تھوڑی دیر اور تم نہ آتے تو میں نے خود ہی پیغام بھجوا
تھا۔ بس ابھی ابھی مہمان کھانا کھا کر فارغ ہوا ہے۔ میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا
چاچا نے فقیرے سے بات کی تو وہ بولا۔

"یار! بتاؤ تو سہی، مہمان کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو، تمہاری زبان نہیں؟...... مہمان تمہارے سامنے بیٹھا ہے،
پوچھ لو۔" چاچا نے فقیرے کو چھیڑا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور بولا۔

"تم برا نہ منانا، اس کی نوک جھونک کی عادت ہے...... میرا بیلی جو ہوا...... تم
ہے یہاں پہلی بار آئے ہو ورنہ اس کے سبھی عزیز رشتے داروں کو تو میں اچھی طرح
ہوں۔"

"واقعی میں یہاں پہلی بار آیا ہوں اس لئے اپنا تعارف بھی کروا دیتا ہوں۔ میرا
چوہدری سلیم ہے۔ میں لاہور میں رہتا ہوں۔ وہاں میں بندے باہر بھجوانے کا کام
ہوں۔ بس تم جیسے اچھے لوگوں سے ملاقات ہونی تھی اس لئے کسی طرح یہاں آ نکلا
میں نے چوہدری سلیم کے نام سے وزیٹنگ کارڈ چھپوا کر اپنی جیب میں ڈال رکھے تھے
میں نے دو کارڈ جیب سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لئے اور ایک کارڈ فقیرے
طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ اگر کبھی میری ضرورت پڑی یا لاہور
ہوا تو مجھے ضرور ملنا......" ساتھ ہی دوسرا کارڈ میں نے چاچا کی طرف بڑھا دیا اور

"یہ لو چاچا! ایک کارڈ تم بھی اپنے پاس رکھ لو۔ کام آئے گا۔"

وہ دونوں میرا وزیٹنگ کارڈ لے کر اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، پھر اپنی اپنی جیب
میں ڈال لیا۔ میں گھر سے تمام انتظامات کرنے کے بعد تیاری کے ساتھ نکلا تھا۔
ظاہری حلیہ تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ نام بدلنا بھی میری تیاری کا ایک حصہ تھا۔
نے نہ صرف وزیٹنگ کارڈ سلیم کے نام سے چھپوا رکھے تھے بلکہ میرے پاس اسی نام
شناختی کارڈ بھی موجود تھا۔

"اب تو تسلی ہو گئی ناں...... یا ابھی کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟" چاچا نے فقیرے
چھیڑا۔

ابھی فقیرا بات کرنے کے لئے تیاری کر رہا تھا کہ اسی کا ہم عمر ایک اور شخص وہاں آ
گیا۔ اسے بیٹھک میں داخل ہوتے دیکھ کر فقیرے نے خاموشی اختیار کر لی۔ جو شخص آیا
تھا، اس نے آتے ہی اونچی آواز میں سلام کیا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس نے ہاتھ
ملانے کے بعد جوتی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور کرسی پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے
تسلی سے بیٹھنے تک ہم تینوں اسی کی طرف دیکھتے رہے۔ جب وہ تسلی سے کرسی پر بیٹھ گیا
تو چاچا نے اس کا تعارف کرایا۔

"پتر! یہ بھی میرے بچپن کا بیلی ہے۔ نام تو اس کا انور ہے لیکن ہم اسے انو کہہ کر
پکارتے ہیں۔ انو، فقیرا اور میں تینوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ اب خیر سے ہم تینوں کے
بچے بھی جوان ہو گئے ہیں، ہماری دوستی میں کبھی دراڑ نہیں آئی۔ ہم بچپن سے آج تک
ایک دوسرے کے ساتھ دُکھ سکھ بانٹتے آئے ہیں۔" چاچا نے بات کرتے کرتے منہ انو
کی طرف کر لیا اور بولا۔ "تو سنا، تجھے اب فرصت ملی ہے آنے کی......؟"

چاچا کی بات سن کر انو شرمندہ ہو گیا۔ پھر اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے بولا۔ "اصل
میں آج سارا دن کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے گزر گیا۔ مجھے تو مہمان کے آنے کا علم
ہی نہیں تھا۔ میں تو تھک ہار کر لیٹا ہوا تھا کہ تمہارے بھتیجے نے آ کر بتایا کہ چاچے کے
دروازے کے سامنے کار کھڑی ہے، لگتا ہے کوئی مہمان آئے ہیں۔ میں نے سوچا جا کر
مل آؤں۔ ورنہ تم میری عادت سے تو واقف ہی ہو۔ مجھے مہمان کے آنے کا پہلے سے
علم ہوتا تو میں کب کا یہاں آ کر بیٹھا ہوتا۔"

"اچھا اچھا...... اب زیادہ صفائیاں نہ پیش کر۔" چاچا نے انو سے کہا اور پھر مجھے
بتانے لگا۔ "پتر! اصل میں ہمارے گاؤں میں رواج ہے کہ اگر کسی کا مہمان آئے تو سبھی
وہاں جا پہنچتے ہیں اور مہمان کے ساتھ خوب گپ شپ کرتے ہیں تاکہ آنے والے
مہمان کا دل لگا رہے۔ تم تو آئے ہی اندھیرا پھیلنے کے بعد ہو اس لئے کسی کو تمہارے
بارے میں علم نہیں ہوا۔ ورنہ یہاں کھڑے ہونے کو جگہ نہ ملتی۔ اور اس وقت تک اچھی
بھلی رونق لگی ہوتی۔"

میں نے جو چاچا کی بات سنی تو بولا۔ "بس چاچا! یہ گاؤں والوں کا آپس میں پیار و
محبت ہے جو سب ایک جگہ آ جمع ہوتے ہیں اور دوسرے کے گھر آئے ہوئے مہمان کو

اپنا ہی مہمان سمجھتے ہیں...... ورنہ ایسا کہاں ہے۔ شہروں میں ہی دیکھ لو، وہاں ساتھ
والے ہمسائے کی خبر نہیں ہوتی، دور والوں کی تو بات ہی کیا کرنی۔"

میں نے طویل سفر طے کیا تھا اس لئے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ باتوں کے
دوران کئی بار میری آنکھیں خود بخود بند ہو جاتیں۔ مجھے بار بار جمائیاں بھی آ رہی تھیں۔
میرا دل چاہ رہا تھا کہ جلد سو جاؤں لیکن ان تینوں کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا اس
لئے خود پر قابو پائے بیٹھا رہا۔ میری کیفیت زیادہ دیر ان سے چھپی نہ رہ سکی اس لئے
فقیرا اور انو مجھے سونے کا کہہ کر وہاں سے چلے گئے۔ میں وہیں اپنی چارپائی پر لیٹ
گیا۔ دوسری چارپائی پر چاچا سو گیا۔ نیند سے میری آنکھیں پہلے ہی سے بوجھل ہو رہی
تھیں اس لئے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو آٹھ بج چکے تھے۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ چاچا اپنی چارپائی
موجود نہیں تھا۔ وہ شاید صبح سویرے ہی اٹھ کر اپنے کاموں میں لگ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد
مکھن ہاتھ میں صابن اور کندھے پر تولیہ ڈالے آ گیا اور بولا۔

"میں صبح سے دو تین بار چکر لگا گیا ہوں، مگر تم سوئے ہوئے تھے۔ ابا کہہ گیا تھا کہ
مہمان جیسے ہی اٹھے، اسے مسجد میں نہلانے لے جانا۔"

"یار مکھن! نہانے کے لئے مسجد جانا پڑے گا؟" میں نے حیرانگی سے دریافت کیا تو
وہ بولا۔

"ہاں تو اور کیا...... ہم سب بھی وہیں نہاتے ہیں۔ مسجد کے ساتھ ہی غسل خانے
بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے کنوئیں کا پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ تم نہاؤ گے تو بہت مزہ آئے
گا۔"

مکھن کی بات سن کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرے آگے آگے چل پڑا اور میں اس
کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑے سے فاصلے پر گاؤں کے درمیان میں مسجد تھی۔ مکھن نے
تولیہ غسل خانے کے دروازے پر لٹکا دیا اور صابن غسل خانے کی دیوار پر رکھ دیا۔
تیزی سے کنوئیں سے پانی نکال کر غسل خانے میں ڈالنے لگا اور مجھے غسل خانے میں
جانے کا اشارہ کر دیا۔ مکھن کی بات واقعی سچ تھی۔ پانی واقعی ٹھنڈا تھا۔ مکھن پانی نکال
ڈالتا رہا اور میں نہاتا رہا۔

نہانے سے فارغ ہو کر گھر واپس آئے تو مکھن مجھے بیٹھک میں چھوڑ کر خود اندر چلا
گیا۔ میں نے گاڑی میں سے بریف کیس لیا اور کپڑے نکال کر پہن لئے۔ تھوڑی ہی
دیر بعد مکھن ناشتہ لے آیا۔ ناشتے میں دیسی گھی سے چپڑی ہوئی روٹی، مکھن، اچار،
پودینے کی چٹنی اور لسی تھی۔ میں نے سبھی چیزیں شوق سے کھائیں اور لسی کے بھی دو تین
گلاس پی گیا۔ یہ نہ جانے لسی کا اثر تھا یا کچھ اور، مکھن جیسے ہی برتن اٹھا کر گیا، میری
آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور سو گیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں تقریباً ایک گھنٹہ سویا رہا۔ باتوں کے شور سے میری آنکھ کھل
گئی۔ جب آنکھ کھلی تو چاچا کے ساتھ پولیس کی وردی پہنے ایک حوالدار میرے سامنے
کھڑا تھا۔ چاچا کے ساتھ پولیس والے کو دیکھ کر میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ گیا۔
میرے دل میں عجیب عجیب سوال ابھرنے لگے۔ لیکن میں نے فوری طور پر خود کو سنبھال
لیا۔ میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ چاچا، حوالدار سے کہنے لگا۔

"میں نے کہا بھی تھا کہ ابھی مہمان سو رہا ہے لیکن تم لوگ کہاں کسی کی سنتے ہو۔
اپنی ہی منوا کر رہتے ہو۔ لو اب اٹھ گیا ہے، پوچھ لو جو پوچھنا ہے۔"

اس سے پہلے کہ حوالدار کچھ کہتا، میں بول پڑا۔ "کیا بات ہے حوالدار صاحب!
کہئے کیسے آنا ہوا......؟"

"معاف کیجئے گا چوہدری صاحب! آپ کو تنگ کیا...... اصل میں تھانیدار صاحب
نے آپ کو بلانے بھیجا ہے۔"

حوالدار کی بات سن کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ آخر
تھانیدار نے مجھے کس سلسلے میں بلایا ہے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی سلسلے میں پولیس میرا
پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچی ہو؟...... میں نے دل میں خیال کیا کہ پھنسے بھی تو
کہاں آ کر۔ اب چند منٹ میں میرا بنا بنایا کھیل بگڑنے والا تھا۔ گو کہ میں گھبرا رہا تھا
لیکن ایسے میں خود کو سنبھالنا بھی ضروری تھا۔ میں نے احتیاطاً حوالدار سے پوچھا۔

"حوالدار صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ تھانیدار نے مجھے کس لئے بلایا ہے......؟"

"چوہدری صاحب! پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ تھانیدار صاحب نمبردار کے ڈیرے
پر بیٹھے ہیں اور انہوں نے ایک کیس کے سلسلے میں آپ سے چند سوالات کرنے ہیں۔"

حوالدار کی بات سن کر میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات اُبھرنے لگے،
اس کے ساتھ کوئی بھی بات کرنا فضول تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ نمبردار کے ڈیرے
پر گاڑی میں بیٹھ کر جایا جائے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنے ساتھ ہی حوالدار
اور چاچا کو بھی بٹھا لیا۔ چلنے لگے تو مکھن بھی گاڑی کا دروازہ کھول کر ساتھ بیٹھ گیا
چاچا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا مجھے راستوں کی نشاندہی کرتا رہا۔ نمبردار کے ڈیرے
پہنچ کر وہ تینوں گاڑی سے نیچے اتر گئے۔ میں بھی درخت کی چھاؤں میں گاڑی کھڑی
کر کے باہر نکل آیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے
سارا گاؤں وہاں آ جمع ہوا تھا۔ وہاں کچھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر لوگ بیٹھے
تھے اور کچھ لوگ چارپائیوں کے اردگرد کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی لوگوں نے راستہ
دیا۔ ہم چاروں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تھانیدار کے سامنے جا پہنچے۔ تھانیدار کے سامنے
میز پر لسی کا جگ پڑا تھا اور وہ کرسی سے ٹیک لگائے لسی پی رہا تھا۔ تھانیدار کے قریب
والی چارپائی پر جو لوگ بیٹھے تھے وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمارے بیٹھنے
جگہ بنا دی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چاچا اور مکھن بھی میرے
پاس ہی بیٹھ گئے۔

میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں سے ہر طرح کے معاملات پر کھل کر بات
تھی لیکن یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں ذاتی نوعیت میں کسی پولیس والے
بات کرنے والا تھا۔ لوگوں میں طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ نہ جانے میرے
ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ تھانیدار نے سب کو خاموش کروا دیا اور پھر میری طرف دیکھتے
ہوئے بولا۔

"چوہدری صاحب! آپ کو تکلیف دی۔ امید ہے برا نہیں منائیں گے۔"

تھانیدار کا معذرت خواہانہ انداز دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر بھی میرے ذہن میں
یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ آخر مجھے کس وجہ سے بلایا گیا تھا؟ اس لئے میں نے فوراً دریافت
کیا۔ "خیر ایسی کوئی بات نہیں...... آپ فرمائیے، مجھے کیسے یاد کیا......؟"

"دراصل ہم ایک کیس کے سلسلے میں ادھر نکلے تھے۔ یہاں آ کر آپ کے بارے
میں معلوم ہوا۔ ہم نے آپ کو بلانے سے پہلے چاچا خیرو کو یہاں بلا کر آپ کے بارے

میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔"

تھانیدار ابھی تک پہیلیاں بجھوا رہا تھا جبکہ میں اصل بات جاننے کے لئے بے چین
ہو رہا تھا۔ اس لئے مجھ سے رہا نہ گیا اور بولا۔ "تھانیدار صاحب! میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔
مجھے کھل کر کچھ بتائیں تاکہ میں کوئی بات کر سکوں۔"

"بات یہ ہے کہ کل رات گاؤں سے کچھ فاصلے پر کوئی فیملی کار میں جا رہی تھی۔
راستے میں ڈاکوؤں نے انہیں روک لیا...... ان لوگوں نے شاید کچھ مزاحمت کی ہو گی
جس کی وجہ سے ڈاکوؤں نے ان سے سب کچھ چھین کر انہیں قتل کر دیا۔ ہمیں معلوم ہوا
تھا کہ رات کو آپ بھی اسی راستے سے آئے تھے۔ ہم نے آپ کو اسی لئے بلایا تھا کہ
شاید ان لوگوں سے راستے میں کہیں آپ کا بھی آمنا سامنا ہوا ہو اور آپ ڈاکوؤں کے
حلیے بتا کر اس کیس میں ہماری کچھ مدد کر سکیں۔"

تھانیدار کی بات سن کر تمام معاملہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ
راستے میں میرا کسی ایسے شخص سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یقیناً میں
انہیں ضرور بتا دیتا۔ پھر بھی تھانیدار کی تسلی کے لئے بات تو کرنا تھی۔

"بات یہ ہے تھانیدار صاحب! میں تو اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی گاؤں پہنچ گیا تھا
اور راستے میں کسی مشکوک آدمی کو بھی میں نے نہیں دیکھا۔"

میرا جواب سن کر تھانیدار نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے میرے
چہرے کا بغور جائزہ لیا اور بولا۔ "دیکھیں چوہدری صاحب! اگر آپ نے کچھ دیکھا ہے
تو چھپائیں نہیں۔ قانون آپ کو پورا تحفظ دے گا۔"

"تھانیدار صاحب! مجھے بھلا کیا ضرورت ہے کہ میں جان بوجھ کر کچھ چھپاؤں۔ اگر
میں نے مشکوک لوگوں کو دیکھا ہوتا یا ان سے میرا سامنا ہوا ہوتا تو میں بلا جھجک آپ کو
بتا دیتا۔"

میری بات سن کر تھانیدار کسی سوچ میں پڑ گیا۔ وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
کچھ لمحوں بعد تھانیدار نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ٹھیک ہے چوہدری صاحب!
آپ کو اپنا بیان دینے کے لئے میرے ساتھ تھانے جانا ہو گا۔"

تھانیدار کی بات سنتے ہی ایک شور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں تھانیدار کی

بات پر احتجاج کرتا، گاؤں والوں نے با آواز بلند کہا کہ ہم اپنے گاؤں میں آئے ہوئے مہمان کو کسی صورت بھی تھانے نہیں جانے دیں گے۔ تھانیدار اور نمبردار نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی بات کی۔ گاؤں کے لوگ چارپائیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے نمبردار کو بولنا پڑا۔

”آپ لوگ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ کچھ دیر کی تو بات ہے۔ بیان دے کر چوہدری صاحب تھانے سے واپس آ جائیں گے۔“

نمبردار کی بات سنتے ہی ایک ساتھ بہت سی آوازیں ابھریں۔ ”لیکن نمبردار جی! آپ اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ گاؤں والوں کا مہمان ہے اور ہم بلاوجہ اپنے مہمان کو تھانے نہیں جانے دیں گے۔“

میں گاؤں والوں کا جذبہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ وہی دیہاتی جو گاؤں میں پولیس کے آ جانے کی وجہ سے کچھ دیر پہلے تک سہمے بیٹھے تھے، وہ ایک انجان آدمی کے لئے احتجاج پر اتر آئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں نمبردار نے بھی گاؤں والوں کی ہاں میں ہاں ملا دی اور بولا۔ ”چلیں تھانیدار جی! آپ ہی مان جائیں۔ چوہدری صاحب کا بیان لے کر یہیں انگوٹھے لگوا لیں۔ تھانے جا کر بھی تو یہی کچھ کرنا ہے ناں......؟“

نمبردار کی بات سن کر تھانیدار نے مزید کوئی سوال نہ کیا اور خاموشی سے میرا بیان لے کر دستخط کروا لئے۔ میں نے مزید وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا اور ان سے اجازت لے کر تھانیدار، حوالدار اور نمبردار سے ہاتھ ملاتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔

بیٹھک میں واپس آ کر بیٹھے تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ چاچا نے مجھے رات واپس جانے سے روکا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میں واپس جانا بھی کہاں چاہتا تھا لیکن میرے دل کی بات کا چاچا کو تو علم نہیں تھا۔ اس لئے اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔

”چاچا! میں تو تمہارے احسانوں تلے دب گیا ہوں۔ رات کو اگر تم مجھے اپنے پاس نہ ٹھہراتے تو جو حادثہ ان لوگوں کے ساتھ پیش آیا، وہ میرے ساتھ بھی پیش آ سکتا تھا۔“

”نہیں پتر نہیں...... احسان کس بات کا۔ تم میرے گھر چل کر آئے تھے اور تم اجنبی بھی تھے۔ ایسے میں اگر میں تمہیں صحیح بات بتا کر نہ روکتا تو یہ بہت بڑی زیادتی ہوتی۔“

”دیکھو چاچا! اب تک تم نے جیسے کہا، جو کہا میں نے مان لیا۔ اب جو میں کہنے لگا ہوں وہ تمہیں بھی ماننا ہو گا۔“

چاچا میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکا اور بولا۔ ”تم کہہ کر تو دیکھو۔ چاچا اپنی جان بھی وار دے گا۔“

”نہیں چاچا! جان نہیں وارنی۔ بس تم مکھن کو دبئی بھجوانے کے لئے ہاں کہہ دو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے چوہدری پتر! لیکن...... میرے پاس اتنی رقم نہیں......“

”چاچا! وہی غیروں والی بات کی ناں...... تم سے پیسوں کے لئے کس نے کہا ہے۔ تم میرے اپنے ہو...... میرے عزیز ہو...... کیا میرا اتنا بھی حق نہیں بنتا......؟“

”اچھا بھئی، جیسے تمہاری مرضی۔“

چاچا نے مکھن کو دبئی بھجوانے کے لئے رضامندی کا اظہار کیا تو مکھن یہ خوشخبری اپنے گھر والوں کو سنانے کے لئے فوراً اندر بھاگ گیا۔ کچھ دیر بعد چاچا بھی وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

پروگرام یہ طے ہوا کہ مکھن میرے ساتھ ہی جائے گا۔ اس کی وجہ سے میں نے ایک رات اور وہاں رکنے کا پروگرام بنا لیا تاکہ اگلے روز صبح ناشتے کے بعد ہم دونوں گاؤں سے نکل پڑیں۔ شام تک یہ بات پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ مکھن دبئی جا رہا ہے۔ گاؤں کے سب لوگ جان چکے تھے کہ خیرو کے گھر جو مہمان آیا ہے وہ لوگوں کو باہر بھجوانے کا کام کرتا ہے۔ بس پھر کیا تھا، دبئی جانے والے امیدواروں کا رش لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خیرو بھی اہمیت کا حامل شخص بن گیا۔ وہ ابھی مجھ سے ایک شخص کا تعارف کروانے سے فارغ ہوتا تو دوسرا کوئی اور شخص وہاں آ پہنچتا۔ وہاں گاؤں کے چوہدری اور نمبردار سے لے کر نائی، مراثی، تیلی، ترکھان، لوہار اور موچی تک سبھی اپنے بیٹوں کو ساتھ لئے وہاں آ جمع ہوئے تھے۔ ہر کوئی مجھ سے زیادہ چاچا خیرو کی خوشامد میں لگا ہوا تھا۔ ایک ہی دن میں چاچا خیرو کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں دیر تک سبھی کی سنتا رہا، پھر بڑے پیار سے بولا۔ ”دیکھیں، آپ سبھی لوگ میرے لئے قابل احترام ہیں اور سب سے بڑھ کر مجھے چاچا خیرو عزیز ہے۔ میں اور کسی

کی بات تو شاید ٹال بھی دوں لیکن چاچا کی بات کبھی نہیں ٹال سکتا۔ آپ لوگوں
میری درخواست ہے کہ پہلے مجھے مکھن کو باہر بھجوانے دیں، پھر آپ لوگوں کو بھی
دوں گا۔ تب تک آپ لوگوں کو انتظار کرنا ہوگا۔"

کچھ لوگ تو میری بات سن کر وہاں سے چلے گئے مگر کچھ اس انتظار میں بیٹھے رہے
کہ شاید میں کسی لمحے اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی کر دوں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے
جو مسلسل چاچا خیرو کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے مگر وہ بھی انہیں انتظار کرنے کو کہہ رہا
تھا اور وعدہ کر رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح کہہ کر اس کے بیٹے کو ضرور بھجوا دے گا۔
مکھن کھانا لے کر آیا تو ایک ایک کر کے تقریباً سبھی لوگ وہاں سے نکل گئے۔ صرف
چاچا کے چند انتہائی قریبی وہاں رہ گئے تھے۔ انہیں بھی چاچا نے کسی نہ کسی طرح فارغ
کر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں اور چاچا دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر سو گئے۔

صبح روانہ ہونے لگے تو مکھن نے تازہ استری کئے ہوئے صاف ستھرے کپڑے
پہن رکھے تھے اور بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ مکھن کی ماں اور بہن بھائی رو رہے
تھے۔ چاچا بار بار انہیں جھڑک رہا تھا کہ خاموش ہو جائیں مگر وہ مسلسل روئے جا رہے
تھے۔ حالانکہ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ مکھن پاسپورٹ وغیرہ بنوا کر چند دن بعد واپس
آ جائے گا اور پھر جب تک ویزہ لگ کر آئے گا، وہ گاؤں میں ہی رہے گا۔ لیکن شاید
مکھن گھر والوں سے پہلی بار جدا ہو رہا تھا اس لئے سب رو رہے تھے۔ گاؤں کے
اور لوگ بھی وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں نے مکھن کو اپنی برابر والی سیٹ پر بٹھا لیا اور
خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے نکل پڑا۔

♦ ...... ♦
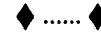
یوں لگتا تھا جیسے مکھن گاڑی میں پہلی بار سفر کر رہا تھا اور اپنے گاؤں سے پہلی بار ہی
نکلا تھا۔ وہ راستے میں اِدھر اُدھر کے ماحول کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ ہم کافی فاصلہ
طے کر آئے تھے۔ ایک بچے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جو راہ چلتے مسافروں سے
مسجد کی تعمیر کے لئے چندے کی اپیل کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی کی اسپیڈ آہستہ کر دی
تھی۔ لاؤڈ سپیکر کے ذریعے چندے کی اپیل کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی اور
میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آواز دور ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے
گاڑی کو بریک لگا دی اور ریورس گیئر لگا کر پیچھے کی طرف چل پڑا۔

میرے اس اچانک فیصلے پر مکھن بھی پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے ذہن میں
طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے لیکن اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ ہم جیسے
جیسے پیچھے جا رہے تھے، وہی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے وہاں جا کر گاڑی
روک دی جہاں لڑکا چندے کی اپیل کر رہا تھا۔ گاڑی کو رکتے دیکھ کر وہ لڑکا دوڑتا ہوا
ہمارے پاس آ گیا۔ وہ شاید اس امید پر بھاگتا ہوا آیا تھا کہ گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص چندہ
دینے کے لئے رکا ہے۔ میں گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے باہر نکل آیا۔ مجھے باہر نکلتے
دیکھ کر مکھن بھی باہر آ گیا۔ جہاں وہ لڑکا بیٹھا چندے کی اپیل کر رہا تھا، اس کے پیچھے
درخت کے سائے میں مولوی صاحب دھوتی اور بنیان پہنے چارپائی پر لیٹے تھے۔ ہمیں
دیکھ کر وہ بھی اٹھ بیٹھے اور جلدی سے قمیض پہن کر میری طرف لپکے۔

میں نے آگے بڑھ کر پُرجوش طریقے سے مولوی صاحب سے سلام لیا۔ مولوی
صاحب نے مجھے چارپائی پر بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ مکھن بھی ایک طرف ہو کر اسی
چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جو لڑکا چندے کی اپیل کر رہا تھا، مولوی صاحب نے اسے ہمارے
لئے نلکے کا ٹھنڈا پانی لانے کو کہا۔ مولوی صاحب کا حکم سنتے ہی وہ لڑکا بھاگتا ہوا گیا اور

قریب ہی لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے سلور کے جگ میں پانی بھر لایا۔ کیونکہ گلاس ایک
تھا اس لئے لڑکے نے ہمیں باری باری گلاس میں پانی ڈال کر دیا۔ اس دوران دونوں
طرف سے خاموشی رہی۔ نہ مولوی صاحب نے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے کوئی بات
چھیڑی۔ لڑکا بھی چندے کی اپیل چھوڑ کر ہمارے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"لگتا ہے مسجد کا کافی کام ہونے والا ہے۔" میں نے مولوی صاحب کو چھیڑا۔

میری بات سن کر تو مولوی صاحب نے لمبی سانس چھوڑی اور بولے۔ "بس جی اللہ کا
گھر تعمیر ہو رہا ہے۔ ہم تو دن رات خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ جس کا گھر بن رہا ہے
وہی کوئی اسباب پیدا کر دے گا۔"

"ویسے مولوی صاحب! دن بھر میں کتنی رقم اکٹھی ہو جاتی ہو گی......؟"

"کیا رقم اکٹھی ہونی ہے جی...... ہم سارا سارا دن دھوپ میں بیٹھے آنے جانے
والوں سے مسجد کی تعمیر کے لئے چندے کی اپیل کرتے رہتے ہیں۔ شام تک بمشکل ڈیڑھ
دو سو روپیہ اکٹھا ہو پاتا ہے۔ آپ خود ہی سوچیں اینٹیں، بجری، ریت اور سیمنٹ کس قدر
مہنگے ہو چکے ہیں۔ اتنے تھوڑے سے پیسوں سے کیا بنتا ہے۔ پھر بھی اللہ کی آس پر لگے
ہوئے ہیں۔"

"مولوی صاحب! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اوپر والا ہے ناں...... انشاء اللہ
سب کام سیدھے ہو جائیں گے۔"

بات کرتے کرتے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر مکھن بھی اٹھ گیا اور مولوی
صاحب نے بھی چارپائی چھوڑ دی۔ میں نے مولوی صاحب کو اٹھتے دیکھا تو بولا۔
"مولوی صاحب! آپ تشریف رکھیں، میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔" میرے کہنے پر
مولوی صاحب پھر سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

میں نے احتیاطاً کچھ رقم اپنے بریف کیس میں رکھی ہوئی تھی تا کہ بوقت ضرورت کام
آ سکے۔ میں نے بریف کیس میں سے دس ہزار روپے لے کر اپنی جیب میں ڈال لیے
اور ایک لاکھ روپے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ جب میں بریف کیس میں سے رقم
نکال رہا تھا تو مولوی صاحب، مکھن اور چھوٹے لڑکے کی نظریں مجھ پر ہی لگی ہوئی تھیں۔
میں رقم لے کر ان کی طرف آیا تو وہ مسلسل میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے آتے

ہی ایک لاکھ روپے مولوی صاحب کے ہاتھوں میں تھما دیئے اور بولا۔

"مولوی صاحب! فی الحال آپ ایک لاکھ روپیہ رکھیں اور مسجد کی تعمیر پر خرچ کریں۔
یہ خدا کا گھر ہے۔ اسے خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہ رہے۔ میں کچھ دن بعد دوبارہ
آؤں گا اور جس قدر رقم آپ کو درکار ہو گی، دے جاؤں گا۔"

ایک لاکھ روپیہ مولوی صاحب کے ہاتھوں میں تھا۔ مگر شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین
نہیں آ رہا تھا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتے اور کبھی ہاتھوں میں پکڑے ہوئے نوٹ دیکھنے
لگتے۔ کچھ دیر وہ اسی کیفیت میں رہے۔ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا اور بولے۔

"ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... سبحان اللہ...... سبحان اللہ...... دنیا آپ جیسے اللہ کے
نیک بندوں سے ہی تو چل رہی ہے۔ جنہیں اللہ نے توفیق دی ہو، وہ خدا کی راہ میں
خرچ کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے...... وہ دل کھول کر نیکی کے کاموں پر لگاتے ہیں......
سبحان اللہ جی سبحان اللہ۔ آپ جیسے نیک انسان سے مل کر میری روح خوش ہو گئی۔" پھر
رسید والی کاپی منگوا لی اور بولے۔ "آپ اپنا نام لکھوا دیں تا کہ میں رسید کاٹ دوں۔"

"ویسے اس کی ضرورت نہیں۔ لیکن مجھے چوہدری سلیم کہتے ہیں...... اگر آپ رسید بنانا
چاہتے ہیں تو جیسی آپ کی خوشی! آپ ایک لاکھ کی رسید بنا لیں مگر میرا نام ظاہر نہ کریں۔"

"ماشاء اللہ جی ماشاء اللہ...... چوہدری صاحب! آپ کی باتیں سن کر دل کو سرور آ
گیا...... آپ جیسے بھلے اور نیک دل انسان کہاں ملتے ہیں۔"

"مولوی صاحب! آپ شرمندہ نہ کریں۔ بس اللہ کا نام لے کر کام شروع کروائیں۔
جس قدر رقم چاہیے ہو گی، میں دوں گا۔" میں نے دس ہزار کی جو رقم جیب میں ڈالی تھی،
وہ بھی نکال کر مولوی صاحب کو دے دی اور بولا۔ "مولوی صاحب! وہ تو مسجد کے لئے
تھے۔ اور یہ دس ہزار روپے آپ کے لئے ہیں...... میں جانتا ہوں آپ کو ملنے والی تنخواہ
کسی بھی طرح آپ کے اخراجات کے لئے کافی نہیں ہوتی ہو گی۔ آپ کی بھی اسی طرح
کی ذمہ داریاں ہیں جیسی دوسرے لوگوں کی...... آپ کا بھی حق بنتا ہے۔"

"بس جی چوہدری صاحب...... یہ باتیں تو کوئی آپ جیسا دل والا ہی جان سکتا ہے۔
اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے۔"

"مولوی صاحب! میرے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ کا دیا ہوا ہے۔ میں تو اسی کے

دیئے ہوئے مال میں سے دے رہا ہوں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر...... ویسے چوہدری صاحب! آپ کاروبار کیا کرتے ہیں؟"

"کام کیا کرنا ہے جی......بس خدمت خلق کرتا ہوں...... ویسے لوگوں کو باہر کے ملکوں میں بھجواتا ہوں......اگر آپ نے بھی کسی کو بھجوانا ہو تو ضرور کہئے گا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں......"

"اب ہمیں اجازت دیں مولوی صاحب! انشاء اللہ چند روز بعد پھر ملاقات ہوگی۔"

رقم پا کر مولوی صاحب میرے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ میں وہاں کچھ دیر اور رکوں اور کھانا وغیرہ کھا کر جاؤں۔ مگر ان کے بار بار کہنے پر بھی میں نہ رکا اور مکھن کو ساتھ لئے وہاں سے چل پڑا۔

میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ دوپہر کا کھانا اسی ریسٹورنٹ میں کھاؤں گا جہاں سے جاتے ہوئے کھانا کھایا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا اور ریسٹورنٹ بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو مجھے دیکھتے ہی وہی ویٹر دوڑ کر میرے پاس آ کھڑا ہوا جسے میں نے دو روز قبل ٹپ دی تھی۔ میں نے بیٹھتے ہی جیب سے سو کا نوٹ نکالا اور ویٹر کو دیتے ہوئے بولا۔

"یہ تو رہی تمہاری ٹپ۔ اور اب ایسا کرو کہ تمہارے ریسٹورنٹ کی جو سب سے اچھی ڈش ہے، وہ لے آؤ۔"

ٹپ کے طور پر ملنے والا سو کا نوٹ پا کر ویٹر بہت خوش ہوا اور آرڈر کی تعمیل کے لئے وہاں سے چلا گیا۔ میں نے جان بوجھ کر کھانا کھانے سے قبل ہی ویٹر کو ٹپ دی تھی تاکہ وہ ہمیں اچھی طرح سرو کرے اور ہمیں کھانے کو اچھی چیز مل سکے۔ ٹپ نے اپنا کام دکھایا اور ویٹر ہمارے لئے اچھے اور صاف ستھرے برتنوں میں کھانا لایا۔ اس نے اپنی مرضی سے چکن کڑاہی تیار کروائی تھی جو واقعی بہت مزیدار تھی۔ ہم نے کھانے کے بعد چائے پی اور کچھ دیر بیٹھے رہے۔ جب تک ہم ہوٹل میں موجود رہے، ویٹر ہماری آؤ بھگت میں لگا رہا۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں سے نکل پڑے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

لاہور پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ میں مکھن کو ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اس کے لئے کمرہ

بک کروایا۔ اسی کمرے میں ہم دونوں نے رات کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ پھر اسے اگلے روز ملنے کا کہہ کر میں وہاں سے نکل آیا۔ میں نے اپنے لئے قریب ہی دوسرے ہوٹل میں کمرہ لیا اور جا کر سو گیا۔

میں اگلے روز مکھن کے پاس ہوٹل پہنچا تو وہ میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں دیر تک سوتا رہا تھا اس لئے اس کے پاس کچھ تاخیر سے پہنچا تھا۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا مگر مجھے دیکھ کر اس کی تمام پریشانی دور ہو گئی۔ میں اسے لئے فوٹو گرافر کے پاس گیا اور پاسپورٹ کے لئے اس کی ارجنٹ تصاویر بنوائیں۔ جیسے ہی تصاویر ملیں، میں اسے پاسپورٹ آفس لے گیا اور ایک ایجنٹ کے ساتھ ارجنٹ پاسپورٹ بنوانے کے لئے تمام معاملات طے کر لئے۔

پاسپورٹ آفس سے فارغ ہو کر میں اسے بازار لے گیا۔ وہاں مکھن کے لئے اس کی اپنی پسند کے بہت سے کپڑے خریدے۔ اس کے والدین کے لئے تحائف اور بہن بھائیوں کے لئے بہت سے کھلونے اور کپڑے خریدے۔ ہوٹل واپس پہنچے تو ہم دونوں نے ہاتھوں میں بہت سے شاپر اٹھا رکھے تھے۔ مکھن پریشان تھا کہ وہ اتنی ساری چیزیں کس طرح لے کر جائے گا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں اسے بڑا اٹیچی کیس لے دوں گا جس میں تمام اشیاء با آسانی آ جائیں گی۔

مکھن کی خوشی دیدنی تھی۔ اس سے خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میں نے سوال کیا۔ "ابھی تو پاسپورٹ بننا دیا ہے اور تم اس قدر خوش ہو۔ جب تمہارا ویزہ لگ جائے گا اور تم دبئی جا پہنچو گے پھر تو تمہاری خوشی دیکھنے والی ہوگی۔"

میری بات سن کر مکھن نے گردن جھکا لی اور بولا۔

"ہم تو غریب لوگ ہیں چوہدری صاحب! یہ سب تمہاری ہی مہربانی سے ہو رہا ہے۔"

"اچھا چلو چھوڑو...... ذرا یہ بتاؤ کہ جب تم دبئی پہنچ جاؤ گے تو گھر والوں کو اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کیسے دو گے؟"

"خط لکھوں گا جی۔"

"ارے ہاں یار، تم تو پڑھے لکھے ہو۔ خط لکھنا تمہارے لئے کون سا مشکل کام ہے۔ مگر...... پھر بھی ذرا لکھ کر بتاؤ تو سہی دبئی پہنچ کر کیا لکھو گے......؟" یہ کہتے ہوئے میں

نے کاغذ اور قلم اس کے سامنے رکھ دیا۔

کاغذ اور قلم اس کے ہاتھ میں تھا مگر وہ لکھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے اس کی کیفیت دیکھی تو بولا۔ "ہاں ہاں، لکھو...... بس تم یہ فرض کر لو کہ دبئی پہنچ گئے ہو اور اپنے پہنچنے کی اطلاع اپنے گھر والوں کو دے رہے ہو۔"

میری بات سن کر اس نے قلم اٹھایا اور لکھنے لگا۔ جب وہ خط لکھ چکا تو میں نے پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور بولا۔ "واہ بھئی واہ، یہ تو بہت زبردست خط لکھا ہے...... اچھا چلو یہ بتاؤ کہ جب تم وہاں کماؤ گے اور گھر والوں کو رقم بھجواؤ گے تو پھر کیا لکھو گے؟"

اس سے پہلے کہ وہ میری بات کا جواب دیتا، میں نے ایک اور سوال کر ڈالا۔ "ویسے وہاں جو کماؤ گے، گھر والوں کو بھجواؤ گے بھی کہ نہیں......؟"

میری بات سن کر مکھن نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ "میں اپنی ساری کی ساری کمائی اپنے گھر والوں کو بھجوا دیا کروں گا اور خود روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیا کروں گا۔"

"بہت اچھی بات ہے...... اچھی اور نیک اولاد ماں باپ کے لئے ایسا ہی سوچتی ہے۔"

مکھن نے میرے کہنے پر ایک اور خط لکھ دیا جس میں اس نے ذکر کیا کہ وہ کچھ رقم بجھوا رہا ہے۔ میں نے خط پڑھا اور مکھن کی تعریف کی۔

"تمہاری تحریر پڑھ کر تو لگتا ہی نہیں کہ تم صرف آٹھ جماعت پاس ہو...... یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خط کسی بارہ چودہ جماعت پڑھے ہوئے لڑکے نے لکھے ہوں۔ اگر تم کہو تو یہ دونوں خط میں اپنے پاس رکھ لوں؟"

اپنی تعریف سن کر مکھن بہت خوش ہوا اور فوراً بولا۔ "کیوں شرمندہ کرتے ہو...... یہ بھی کوئی ایسی چیز ہے؟ یہ تو میں نے تمہارے کہنے پر ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھ ڈالے۔ اگر تم نے رکھنے ہیں تو رکھ لو، ورنہ میں نے بھی پھاڑ کر پھینک ہی دینے ہیں۔"

میں نے وہ دونوں خط اپنی جیب میں ڈال لئے اور مکھن سے اجازت لے کر وہاں سے چل پڑا۔

مجھے مکھن کا پاسپورٹ لینے اس کے ہمراہ جانا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہم دونوں پاسپورٹ آفس گئے اور پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ پاسپورٹ پا کر خوشی سے مکھن جھومنے

لگا۔ اس کے لئے یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔ شاید اس نے زندگی میں کبھی ایک بار بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ وہ کبھی بیرون ملک جانے کے لئے پاسپورٹ بنوائے گا۔ میں اسے لاہور نہ لاتا تو شاید وہ بھی دوسرے گاؤں والوں کی طرح صرف گاؤں کا ہی ہو کر رہ جاتا اور اس کی دنیا صرف گاؤں تک ہی محدود ہوتی۔

پاسپورٹ مکھن کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ کبھی قمیض کی اوپر والی جیب میں ڈال لیتا اور کبھی جیب سے نکال کر پھر سے دیکھنے لگتا۔ وہ اسی کام میں لگا رہا اور ہوٹل آ گیا۔ میں نے گاڑی پارک کی اور مکھن کو اس کے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے مکھن سے دریافت کیا۔ "اب تمہارا پاسپورٹ بن گیا ہے...... خوش تو ہو ناں......؟"

"بہت خوش ہوں۔ سچ پوچھو تو مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میرا پاسپورٹ بن گیا ہے۔"

"خیر یقین تو تمہیں کر لینا چاہئے۔ کیونکہ پچھلے ایک گھنٹے کے دوران پاسپورٹ کئی بار تمہاری جیب سے ہاتھوں میں اور ہاتھوں سے جیب میں جا چکا ہے۔ کیا اب بھی تسلی نہیں ہوئی؟"

"نہیں نہیں...... تسلی کیوں نہیں ہوئی...... میں تو اس قدر خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔"

"خیر اب یہ پاسپورٹ تم مجھے دے دو اور واپس گاؤں جاؤ۔ جیسے ہی تمہارا ویزہ لگے گا، میں تمہیں لینے خود گاؤں آؤں گا۔ بس تم تیار رہنا۔"

میری بات سن کر مکھن نے جیب سے پاسپورٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا اور پوچھا۔ "ویسے ویزہ لگنے میں کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"تم فکر کیوں کرتے ہو...... میں نے کہا ناں جیسے ہی تمہارا ویزہ لگے گا، میں خود گاؤں آ جاؤں گا۔ میرے خیال میں دس بارہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ تمہارا ویزہ ایک ہفتے کے اندر اندر لگ کر آ جائے۔"

"ٹھیک ہے، تم جب بھی گاؤں آؤ گے میں تیار ملوں گا......" بات کرتے کرتے مکھن نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "میرا خیال ہے مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہئے

تا کہ شام سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ اگر مزید دیر کر دی تو گاؤں کے لئے کوئی بس
نہیں ملے گی۔"

"چلو ٹھیک ہے، تم اپنا سامان وغیرہ لے کر نیچے آ جاؤ۔ تب تک میں ہوٹل والوں
بل ادا کر دوں۔"

میں بات کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور مکھن اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ میں نے کاؤنٹر
کر ہوٹل والوں کے تمام واجبات ادا کر دیئے۔ اس دوران مکھن بھی ہاتھ میں اٹیچی لئے
گیا۔ میں اسے لئے سیدھا ویگن سٹینڈ پر جا پہنچا۔ جہاں اسے ٹکٹ خرید کر دی اور کچھ
اس کی جیب میں ڈال دی۔

گاڑی روانہ ہونے کے بعد میں واپس اپنے ہوٹل میں گیا اور کچھ دیر بعد کمرہ
دیا۔ ہوٹل سے نکل کر میں نے گاڑی ایک نائی کی دکان پر روک دی۔ کئی دنوں سے
نہ کروانے کی وجہ سے اچھی خاصی داڑھی بڑھ گئی تھی جبکہ میں کلین شیو میں رہتا تھا اور
دوسرے روز شیو ضرور کروا لیتا تھا۔ کئی روز بعد شیو کروانے سے میرے چہرے کا رنگ
بھی سفید ہو گیا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر مجھے اپنے دفتر پہنچنے کی جلدی لگ گئی۔ میں
روز سے دفتر سے غائب تھا۔ واپس پہنچ کر تمام معاملات دیکھنا تھے۔ یوں تو گوہر
عروج دونوں ہی سمجھدار اور قابل اعتماد تھے لیکن جس قدر احسن طریقے سے مالک اپنے
معاملات طے کر سکتا ہے ملازموں میں اس حد تک کاموں کو بروقت اور بخوبی نبھانے کی
زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے سر پر جس قدر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جاتا ہے، وہ
کو پورا کرتے ہیں۔ اس سے آگے تک سوچنا نہ وہ ضروری سمجھتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس
سے کوئی غرض ہوتی ہے۔

میں دفتر میں داخل ہوا تو گوہر کسی رجسٹری کے کاغذات لئے بیٹھا پڑھ رہا تھا
عروج کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں اپنی اپنی سیٹوں سے
کھڑے ہوئے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے سلام دعا کے بعد چند رسمی باتیں کیں
اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عروج بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔ اس نے
لوگوں کی لسٹ میرے سامنے رکھ دی جو میری غیر موجودگی میں مجھ سے ملنے آئے
کیا۔ میں نے سرسری سی نظر لسٹ پر ڈالی اور ایک طرف رکھ دی۔ وہ کچھ دیر

سامنے بیٹھی رہی اور میں اس سے کاروباری نوعیت کے مختلف ضروری سوالات کرتا رہا۔
کیونکہ میں جاننا چاہتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں کیا کیا کام ہوتا رہا ہے۔ عروج جانے
لگی تو میں نے اسے گوہر کو بھجوانے کا کہہ دیا۔ اس کے جاتے ہی گوہر بھی آ گیا۔ گوہر نے
مکمل گوشوارہ بنا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس نے میری غیر موجودگی میں انتہائی ذمے
داری کا مظاہرہ کیا تھا اور میری توقعات سے بڑھ کر چند بڑے بڑے سودے طے کروائے
تھے اور کمیشن کے طور پر ملنے والی تمام رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کروا دی تھی۔

میری غیر موجودگی میں تمام معاملات معمول کے مطابق چلتے رہے تھے۔ لیکن فون
کرنے والوں کی لسٹ دیکھ کر مجھے اس بات کی تشویش ہوئی کہ میری غیر موجودگی میں
ملک امتیاز صاحب ہر روز فون پر میرے متعلق دریافت کرتے رہے تھے۔ میں نے بہتر
یہی سمجھا کہ اور کاموں سے پہلے ملک صاحب سے رابطہ کیا جائے۔ میں نے ملک
صاحب کو فون ملایا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے دفتر میں نہیں اور کسی کام کے سلسلے میں کہیں
باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد ملک صاحب دفتر آ گئے اور بولے۔

"چوہدری صاحب! آپ نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا تھا...... نہ جانے آپ اچانک
کہاں غائب ہو گئے تھے...... آپ کے آفس والے بھی کچھ بتاتے نہیں تھے۔"

"لیکن ملک صاحب! خیر تو تھی؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی...... آپ سے کرسٹل پلازہ کی اتنی بڑی ڈیل ہوئی اور اس
کے بعد آپ نے کوئی خیر خبر ہی نہیں دی۔"

"لیکن ملک صاحب! اس ڈیل میں تو آپ نے مجھے چھ ماہ کا ٹائم دیا ہے جبکہ اس
بات کو طے ہوئے بمشکل ایک ماہ گزرا ہو گا۔"

"آپ کی بات درست ہے...... لیکن جب تک بات کسی کنارے نہ لگ جائے، بھلا
میں سکون سے کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ میں تو مسلسل عذاب کی حالت میں ہوں اور سولی پر
لٹکا ہوا ہوں۔"

"ملک صاحب! ویسے تو ہمارا آپس میں مل بیٹھ کر بات طے کر لینا ہی کافی تھا۔ پھر
بھی آپ کی تسلی کے لئے ٹوکن کے طور پر آپ کو کچھ رقم ادا کر دیتا ہوں تا کہ آپ پُرسکون
ہو کر بیٹھ جائیں...... ویسے ملک صاحب! آپ کو واضح کر دوں کہ کرسٹل پلازہ میں خود خرید

رہا ہوں۔ آپ مکمل طور پر مطمئن رہیں۔ جو بات میں نے کہہ دی ہے، ویسی ہی ہو گی۔ آپ یقین کریں ملک صاحب! میں اپنی بھرپور کوشش کروں گا کہ وقت مقررہ سے بھی چند روز قبل ہی آپ کو مکمل ادائیگی کر دوں۔"

میری بات سن کر تو ملک صاحب کی جان میں جان آ گئی اور بولے۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے چوہدری صاحب! کہ کرسٹل پلازہ آپ خرید رہے ہیں اور یقیناً یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ اس میں آپ کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ میں اپنے بچوں کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتا تو اپنی زندگی میں پلازہ کبھی فروخت نہ کرتا۔"

"خیر ملک صاحب! اگر آپ کو تکلیف نہ ہو اور مناسب سمجھیں تو کل کسی وقت یہاں تشریف لے آئیں۔ میں کچھ رقم آپ کو ادا کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! میں کل ٹھیک پانچ بجے شام آپ کے دفتر میں ہوں گا۔" بات کرتے ہی ملک صاحب اٹھ گئے اور خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔

میں گھر میں سبھی کو بتا گیا تھا کہ مجھے چند ضروری معاملات کے لئے شہر سے باہر جانا پڑ رہا ہے اور واپسی چند روز بعد ہو گی۔ مگر دفتر سے گھر پہنچا تو میرے چاروں ساتھی میرے لئے پریشان تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان چاروں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ وہ چاروں باری باری مجھے گلے لگا کر اس طرح ملے جیسے میں ایک مدت سے ان سے بچھڑا ہوا تھا۔ دینو چاچا اور چاچی بھی میری آواز سن کر دوڑے آئے۔ ان سب کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔ مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو میری جدائی میں پریشان ہو جاتے ہیں اور مجھ سے مل کر ان کے چہروں پر رونق آ جاتی ہے۔ انہیں مل کر میں ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ وہ چاروں ہی میرے کمرے میں آ گئے۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے اس قدر اپنائیت چھلک رہی تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چاروں میرے پاس ہی بیٹھے رہیں اور اٹھ کر نہ جائیں۔ دینو چاچا ہم سب کے لئے وہیں کھانا لے آیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمروں میں چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں تنہا رہ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ چاروں ہی کس قدر مخلص ہیں۔ یہ بات ان کے ذہنوں میں ہو نہ ہو لیکن مجھے اس بات کا احساس تھا کہ آج میں جس مقام پر بھی ہوں اس میں ان کا ہاتھ ہے۔ انہی لوگوں نے مجھے انگلی پکڑ کر

اس راہ پر ڈالا تھا۔ ورنہ شیخ جی کے گھر سے نکل کر نہ جانے میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوتا۔ میں نے انہیں رہنے کو جگہ دے رکھی تھی اور کھانے پینے کے اخراجات بھی میں ہی ادا کرتا تھا۔ وہ لوگ شاید اسے میرا احسان سمجھتے تھے اور اسی احسان تلے دبے ہوئے تھے۔ میری وجہ سے ان کی چند سو کی بچت ہو جاتی ہو گی لیکن میرے لئے وہ بہت بڑا سہارا تھے۔ ان کے علاوہ اکرام کا بھی مجھ پر احسان تھا کہ وہ مجھے ان لوگوں تک لایا تھا۔ میں کبھی کبھار اس کے ہاں بھی چکر لگا آتا تھا اور اس کے بچوں کے لئے مٹھائی اور کھلونے وغیرہ لے جاتا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کی وجہ سے میں نے خود کو کبھی تنہا نہیں سمجھا تھا۔ میں کئی دن بعد گھر لوٹا تھا اور بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں سوچتے ہوئے گزر گئی اور پھر میری آنکھیں بوجھل ہوتی گئیں اور میں سو گیا۔

کرسٹل پلازہ کا سودا چھ کروڑ ستر لاکھ میں طے ہوا تھا۔ ملک صاحب کو بیعانہ کے طور پر کچھ رقم ادا کرنی تھی تاکہ انہیں ذہنی طور پر اس بات کی تسلی ہو جائے کہ واقعی سودا طے پا گیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں زیادہ بڑی رقم موجود نہیں تھی۔ میں نے گوہر کے ذریعے پانچ لاکھ روپے نکلوا کر اپنے پاس رکھ لئے اور ملک صاحب کو فون کر دیا کہ وہ آ جائیں اور رقم وصول کر لیں۔

ملک صاحب کے ساتھ پانچ بجے کا وقت طے ہوا تھا۔ ابھی پانچ بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ ملک صاحب آ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی میں نے لاکھ لاکھ کی پانچ گڈیاں ان کے حوالے کر دیں۔ ملک صاحب نے نوٹ دیکھے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"چوہدری صاحب یہ کیا......؟"

میں ان کے سوال کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس لئے فوراً بول پڑا۔ "میں جانتا ہوں ملک صاحب! یہ رقم بہت تھوڑی ہے۔ لیکن یہ بھی محض آپ کی تسلی کے لئے دے رہا ہوں۔ فی الحال آپ یہ رکھیں، آپ سے میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کو دیئے ہوئے وقت سے پہلے ہی پوری رقم ادا کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے...... جیسے آپ کی خوشی۔" ملک صاحب نے یہ کہتے ہوئے رقم اٹھا کر بریف کیس میں ڈال لی۔ میں نے اسٹام پیپر پہلے سے تیار کروا رکھا تھا وہ اٹھنے لگے تو میں نے اسٹام پیپر نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"ملک صاحب! اگر آپ برا نہ منائیں تو اس پر دستخط کر دیجئے۔"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں...... شرع میں کیسی شرم۔ آپ مجھے پانچ لاکھ روپے دے رہے ہیں۔ دستخط کروانا آپ کا حق ہے۔" یہ کہتے ہوئے ملک صاحب نے ایک سرسری سی نظر اسٹام پیپر کی تحریر پر ڈالی اور دستخط کر دیے۔

♦ ...... ♦

مکھن کو واپس گاؤں گئے ہوئے دس روز ہو گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اور اس کے گھر والے بے چینی سے میرے منتظر ہوں گے۔ میں نے عمر گڑھ جانے کا پروگرام بنا لیا اور رات کو دفتر سے نکلنے سے پہلے ہی گوہر کو بتا دیا کہ میں ایک دو روز کے لئے شہر سے باہر کہیں کام جا رہا ہوں۔ گھر میں بھی رات کو ہی سب کو اطلاع کر دی کہ میں صبح سویرے ہی سفر پر نکل جاؤں گا اور ایک دو روز بعد واپس لوٹ آؤں گا۔

میں اپنے پروگرام کے مطابق صبح سویرے ہی گھر سے روانہ ہو گیا اور جن راستوں سے کچھ روز قبل گیا تھا انہی راستوں سے ہوتا ہوا عمر گڑھ پہنچ گیا۔ عمر گڑھ پہنچا تو شام ہونے والی تھی۔ میں چاہتا تو دوپہر کے وقت بھی با آسانی گاؤں پہنچا جا سکتا تھا لیکن اس طرح ممکن تھا کہ مجھے گاؤں میں رہنے کا کوئی مناسب بہانہ نہ ملتا اور مجھے اسی روز واپس آنا پڑتا۔ جبکہ گاؤں میں رات گزارنا میرے پروگرام کا حصہ تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں شام ڈھلے وقت گاؤں پہنچوں تا کہ واپسی ممکن نہ ہو اور گاؤں میں رات گزارنے کا کوئی نہ کوئی جواز بن جائے۔

چاچا خیرو بھینسوں کا دودھ نکال رہا تھا۔ میں نے گاڑی اس کے قریب جا کر روک دی۔ گاڑی کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور اس کی نظر مجھ پر پڑی تو خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے فوراً دودھ کی بالٹی ایک طرف رکھی اور میری طرف لپکا۔ اس دوران میں بھی گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ چاچا خیرو سے خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ گاڑی کی آواز سن کر اس کے گھر والے بھی دوڑے چلے آئے تھے۔ مکھن کی ماں اور بڑی بہنیں دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھیں جبکہ مکھن کے چھوٹے بھائی اور بہنیں میری ٹانگوں سے آ کر لپٹ گئے تھے۔ اسی لمحے مکھن بھی گھر کے دروازے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ قمیض کے بٹن بند کرتا ہوا

تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے آنے کا سن کر جلدی سے کپڑے تبدیل کرنے میں لگ گیا تھا۔ وہ میرے قریب آیا تو مجھ سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے کھینچ کر اپنے گلے لگا لیا۔

کالو دوڑتا ہوا گیا اور ہمارے بیٹھک کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے اس نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ میں بیٹھک میں داخل ہوا تو وہاں مجھے کچھ کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ دونوں چارپائیوں پر صاف ستھرے بستر بچھے ہوئے تھے۔ میز پر میز پوش بچھا تھا اور کرسیوں کی گدیوں پر کور چڑھا دیئے گئے تھے۔ بیٹھک کی چھت اور دیواروں سے لٹکتے ہوئے جالے بھی اتار دیئے گئے تھے اور چھت والا پنکھا بھی صاف کیا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ورنہ پچھلی بار آیا تھا تو پنکھے کے پروں پر مکھیوں کی گندگی اس قدر لگی ہوئی تھی کہ پنکھے کا اصل رنگ اس میں چھپ گیا تھا۔ انہیں شاید میرے آنے کا انتظار تھا اسی لئے بیٹھک کو صاف ستھرا کر دیا گیا تھا اور تمام تبدیلیاں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھیں۔

چاچا خیرو اور مکھن میرے پاس ہی بیٹھے تھے اور میرے صدقے واری جا رہے تھے۔ ابھی مجھے بیٹھک میں بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کالو کولڈ ڈرنکس لے آیا۔ اس نے بوتل میرے ہاتھ میں تھما دی اور خود ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ میں بوتل پینے لگا۔ چاچا خیرو نے کالو کو اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کوئی بات کی۔ باپ کی بات سنتے ہی کالو وہاں سے نکل گیا۔ چاچا اور مکھن میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"ہاں بھئی مکھن...... پھر کیا ارادے ہیں......؟" میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"اس نے کیا کہنا ہے چوہدری پترا!" چاچا خیرو کہنے لگا۔ "جس دن سے یہ تمہارے پاس سے آیا ہے بس ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو ہم سب اسی دن سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تمہاری راہ تکتے ہوئے ہماری تو آنکھیں ہی تھک گئی تھیں۔ اور اس کی ماں پتہ ہے کیا کرتی ہے۔ اسے ہی دیکھے جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اب میرے بچے نے دور سات سمندر پار چلے جانا ہے۔ پھر جانے کب لوٹے، میں اسے جی بھر کر دیکھ لوں۔ یہ سویا ہوا بھی ہو تو اس کے سرہانے بیٹھی اسے دیکھتی رہتی ہے اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتی ہے۔"

بات کرتے ہوئے چاچا کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ

وہ رو پڑتا، میں نے اسے تسلی دی۔ "چاچا! تم لوگ پریشان کیوں ہوتے ہو؟ دبئی کو
بہت دور ہے۔ بذریعہ ہوائی جہاز چند گھنٹوں میں انسان وہاں سے یہاں پہنچ جاتا
یہ بچہ ہے، اسے تمہارے حوصلوں کی ضرورت ہے۔ اگر تم لوگ ہی ہمت ہار بیٹھے تو یہ
بنے گا......؟"

چاچا نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا
بولا۔ "نہیں نہیں...... پتر! بھلا ہم نے کیوں پریشان ہونا ہے۔ لیکن یہ تو تم جانتے ہی
کہ ماں تو پھر ماں ہوتی ہے ناں۔"

مکھن نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اسے چھیڑا۔ "یار مکھن! تم کیوں
خاموش بیٹھے ہو؟ تم بھی تو کوئی بات کرو۔"

"ابا کے ہوتے ہوئے میں کیا بولوں۔ ابا بات کر ہی رہا ہے......" مکھن نے شرماتے
ہوئے جواب دیا۔

"اچھا بھئی، بات یہ ہے کہ تمہیں مبارک ہو۔ بلکہ چاچا! تمہیں بھی مبارک ہو۔ مکھن
کا ویزہ لگ گیا ہے...... مکھن! تم ایسا کرو، اپنی تیاری کر لو۔ ہم کل صبح ہی یہاں سے
پڑیں گے۔"

مکھن کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے چاچا بول پڑا۔ "غریبوں کی کیا تیاری ہ
دو جوڑے بیگ میں ڈالے اور چل پڑے۔ ویسے بھی جب سے یہ لاہور ہو آیا ہے
نے سب کام کاج چھوڑ دیئے ہیں اور دبئی جانے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ ہم بھی کہتے
ہیں کہ اس کے جانے کے بعد بھی تو سارے کا سارا کام کرنا ہی ہے تو چلو یہ چند دن
یہاں ہے۔ اگر نہ بھی کرے تو کیا حرج ہے......"

"کیوں بھئی مکھن! چاچا ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

مکھن نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے گردن جھکا دی اور خاموش بیٹھا رہا۔
پھر اٹھ کر جلدی سے اندر چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ چونکہ اسے دبئی جانے کی خبر مل چکی
اس لئے اس سے خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ وہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ خبر اپنی ماں
بہن بھائیوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرا تھا اور موقع
ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

مجھے وہاں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ گاؤں کے کچھ لوگ آ گئے۔ ابھی وہ
سلام دعا کے بعد بیٹھے ہی تھے کہ ان کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی بیٹھک میں داخل ہو
گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ وہاں آ جمع ہوئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے
میرے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ کچھ لوگ چارپائیوں اور کرسیوں
پر بیٹھے تھے جبکہ بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ ابھی اور بھی کئی لوگ وہاں آ رہے تھے۔
بیٹھک میں جگہ کم پڑ گئی تھی۔ مکھن اور کالو نے جلدی سے کچھ چارپائیوں کا انتظام کیا اور
بیٹھک کے باہر کھلی جگہ بچھا دیں تاکہ آنے والے لوگ ان پر بیٹھ جائیں۔

میں دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا اور ساتھ ہی اس بات پر حیران بھی
تھا کہ میرے آتے ہی لوگوں کو میرے آنے کی خبر کس طرح مل گئی۔ وہاں عجیب مچھلی
بازار بنا ہوا تھا۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر کوئی مجھ سے بات کرنے کا
خواہشمند تھا۔ سبھی کا ایک ہی سوال اور خواہش تھی کہ کسی طرح بھی اس کے لئے ویزہ لگوا
دوں۔ کچھ لوگ اپنے ساتھ رقم بھی لے کر آئے تھے۔ کچھ لوگ چاچا خیرو کی خوشامد میں
لگے ہوئے تھے۔ وہی خیرو جو چند دن قبل تک عام سا دیہاتی کسان تھا اور کوئی اس کے گھر
آتا تو ایک طرف اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا، اسی خیرو کے گھر گاؤں کے سبھی
چھوٹے بڑے سوالی بن کر آ کھڑے ہوئے تھے۔

میں چاہتا تو اسی وقت لاکھوں روپے جمع کر سکتا تھا لیکن میں کوئی بھی قدم جلد بازی
میں اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر لوگ ویزے کے حصول کے لئے بے صبرے ہو رہے تھے۔
ایک دو شخص جو چاچا خیرو کے زیادہ قریب تھے، وہ کسی نہ کسی طرح اسے راضی کر کے
میرے پاس کھینچ لائے تاکہ وہ مجھ سے ان کی سفارش کر دے۔ میں نے چاچا کی بات
سنی تو اسے سمجھایا۔

"دیکھو چاچا! تو مجھے ان سب سے بڑھ کر عزیز ہے اور میں تمہاری بات ٹال بھی نہیں
سکتا۔ لیکن میں خوامخواہ حامی بھر کر ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا جس کی وجہ سے تمہاری
بدنامی ہو۔ اس لئے تھوڑا سا صبر کر لو...... ابھی مکھن چلا جائے اور تمہیں اس کی خیر خبر
مل جائے، پھر ہی آگے کوئی کام کروں گا۔ ویسے بھی اگلے ماہ پچاس ساٹھ ویزے آنے
والے ہیں۔ تم سے میرا وعدہ ہے جیسے ہی ویزے آئیں گے، میں سیدھا تمہارے پاس چلا

آؤں گا۔ پھر جیسا تم کہو گے، ویسا ہی ہو گا۔ ویزے میرے ہاتھ میں ہوں گے
لوگوں سے پیسے لیتا ہوا اچھا لگوں گا......"

میری بات چاچا خیرو کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ میری باتوں کے دوران سر ہلاتا
جب میری بات ختم ہوئی تو بولا۔ "بات تو تمہاری سولہ آنے صحیح ہے۔ بس ان لوگوں
کہنے پر تم سے پوچھ بیٹھا۔ اب جیسا تم کہو گے، ویسا ہی ہو گا۔"

مجھ سے بات کرنے کے بعد چاچا اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میرے کان اسی جانب
ہوئے تھے۔ اب جو کوئی بھی اس سے ویزے کے لئے بات کرتا وہ میرے کہے ہو
الفاظ دہرا دیتا۔ رات کافی ہو گئی تھی مگر لوگ وہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لے ر
تھے۔ مجھے بہت سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ اتنے میں مکھن نے آ کر چاچا کے کان میں
بات کی۔ چاچا اس کی بات سن کر سر ہلاتا رہا۔ جب وہ کان میں کچھ کہہ کر چلا گیا تو
خیرو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"کافی وقت ہو گیا ہے، مہمان نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ اگر تم لوگ بر
مانو تو کچھ دیر کے لئے باہر بیٹھ جاؤ تاکہ مہمان سکون سے کھانا کھا لے۔"

چاچا کی بات سن کر ایک ایک کر کے لوگ بیٹھک سے نکل گئے۔ ان کے نکلتے
چاچا نے بیٹھک کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تاکہ کہیں لوگ پھر سے نہ آ گھسیں۔ بیٹھک
کے اندر سکون ہو گیا تھا مگر باہر وہی شور تھا۔ مکھن کھانا لے آیا۔ میں جانتا تھا کہ جب
سے میں آیا تھا، چاچا خیرو وہیں میرے پاس تھا اور ایک منٹ کے لئے بھی بیٹھک
باہر نہیں گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی تک اس نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں
زبردستی اسے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ کھانے میں کافی تکلف سے کام لیا گیا تھا۔ وہ
میرے ساتھ کھانا کھانے میں فخر محسوس کر رہا تھا۔ شاید میں اس کی نظر میں بہت بڑا آد
تھا اور کسی امیر آدمی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے جو حالت کسی غریب آدمی
ہوتی ہے، وہ اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

ہم کھانا کھا چکے تو مکھن برتن اٹھا کر لے گیا۔ چاچا نے بیٹھک کا دروازہ کھول دی
دروازہ کھلتے ہی گاؤں کے لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح پھر سے بیٹھک میں آ گھسے۔
حیران تھا کہ میرے واضح انکار کے باوجود لوگ وہاں سے جانے کو تیار نہ تھے۔ ہر ک

سوالی بنا کھڑا تھا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے مکھن سے کہا کہ جو لوگ باہر کھڑے
ہیں ان سے بھی کہو کہ وہ اندر آ جائیں تاکہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، وہ بھی با آسانی
سن سکیں۔ میرا پیغام سنتے ہی جو لوگ بیٹھک میں موجود تھے، متوجہ ہو کر بیٹھ گئے اور جو
باہر کھڑے تھے، وہ بھیڑ بکریوں کی طرح اندر آ گئے۔ تمام لوگ میری طرف متوجہ تھے اور
اس امید میں تھے کہ نہ جانے اگلے ہی لمحے میں کون سی اہم بات کہہ دوں۔ میں نے
بڑے احترام کے ساتھ بات کا آغاز کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ میں سے ہر شخص یہاں کچھ نہ کچھ امید لے کر آیا ہے۔ اور
یقین جانیں کہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ مگر میری مجبوری ہے کہ اس وقت میرے
ہاتھ میں کچھ نہیں۔ بس آپ لوگ تھوڑا سا صبر کیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ
لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں اگلی بار آؤں گا تو آپ لوگوں کو مایوی نہیں ہو
گی۔ تب تک آپ رقم کا بندوبست رکھئے گا جو کہ ایک لاکھ کے قریب بنے گی۔
چونکہ میرے پاس کچھ ویزے امریکہ اور برطانیہ کے بھی آنے ہیں۔ اگر کوئی وہاں جانا
چاہے تو تقریباً آٹھ لاکھ روپے کا انتظام کر کے رکھے۔ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھر جا
کر آرام کریں۔ امید ہے آپ لوگوں نے میری کسی بات کا برا نہیں منایا ہو گا۔"

میری بات سن کر تمام لوگ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ پھر کچھ دیر
بعد وہاں سے جانے لگے۔ ہر شخص وہاں سے جانے سے پہلے مجھ سے ہاتھ ملاتا اور مجھ
سے اس بات کی یقین دہانی حاصل کرتا کہ اسے ضرور چانس دیا جائے گا۔ میں ہر کسی سے
وعدہ کرتا اور اسے رخصت کر دیتا۔ ایک ایک کر کے تقریباً سبھی لوگ وہاں سے چلے
گئے۔ صرف چند لوگ وہ رہ گئے جنہیں خیرو کی دوستی کا دعویٰ تھا۔ مگر خیرو نے سمجھا بجھا کر
کسی نہ کسی طرح انہیں بھی وہاں سے رخصت کر دیا۔ نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہو
رہی تھیں۔ مزید جاگتے رہنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میری کیفیت چاچا خیرو سے چھپی نہ
رہ سکی۔ اس لئے وہ مجھے سونے کا کہہ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو مکھن نئے کپڑے پہنے کرسی پر تیار بیٹھا تھا۔ رونے سے اس کی
آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے مکھن...... تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں......؟" میں نے اس

کی حالت دیکھ کر دریافت کیا۔

میری بات سن کر وہ پھر بچوں کی طرح بلکنے لگا۔ میں نے اسے سمجھایا۔

"اچھا...... تو یہ بات ہے۔ لگتا ہے رات کو سوئے نہیں اور روتے رہے ہو۔ اوشریف آدمی! تم اس طرح روؤ گے تو تمہارے گھر والوں کا بھی دل دُکھے گا۔ وہ بھی روئیں گے اور تمہارے جانے کے بعد پریشان رہیں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان سے خوشی خوشی ہنستے مسکراتے رخصت ہو۔ تاکہ تمہارے جانے کے بعد بھی انہیں تسلی رہے۔"

میری بات سن کر مکھن کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ چاچا وہاں سے پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا اس لئے میں بیٹھک میں تنہا رہ گیا۔ میں کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا مگر چند لوگ آ کر بیٹھ گئے جس کی وجہ سے میں مزید سو نہ سکا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے سفر کے لئے تیاری کر لی۔ مکھن کے گھر والوں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ مکھن کی ماں بار بار اسے اپنے سینے سے چمٹا لیتی، وہ کبھی اس کا منہ چومتی، کبھی ماتھے پر پیار کرتی اور کبھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی۔ گاؤں بھر کے مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان اور بچے وہاں آ جمع ہوئے تھے۔ جدائی کا عجب منظر تھا۔ ہر آنکھ اشکبار دکھائی دے رہی تھی۔ ہر چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ مجھ میں یہ منظر مزید دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا اس لئے مکھن کو کار میں بٹھا کر سب کو روتے ہوئے چھوڑ کر ہم وہاں سے نکل پڑے۔ کچھ دیر تک مکھن کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے ستاروں کی طرح جھلملاتے رہے اور وہ اُداس و پریشان نگاہیں نیچی کئے بیٹھا سوچتا رہا۔ میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لئے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ کیسٹ پر چلنے والے گانے اپنے اندر اس قدر موسیقیت لئے ہوئے تھے کہ کچھ ہی دیر میں مکھن کا موڈ درست ہو گیا اور وہ گانوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

سفر آہستہ آہستہ طے ہو رہا تھا۔ وہ جگہ جہاں مسجد زیر تعمیر تھی، وہاں رُکنا بھی میرے پروگرام میں شامل تھا۔ وہاں پہنچ کر جیسے ہی میں نے گاڑی کھڑی کی، مولوی صاحب گاڑی کو دیکھتے ہی جوتی پہنتے ہوئے دوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ میں گاڑی سے باہر آیا۔ جو بچہ مسجد کی تعمیر کے لئے چندے کی اپیل کر رہا تھا، مجھے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ مولوی صاحب نے انتہائی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ مسجد کی تعمیر کا کام زور و شور سے

ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی میں نے جان بوجھ کر سوال کیا۔

"مولوی صاحب! آپ سنائیں، مسجد کی تعمیر کا کام کیسا ہو رہا ہے......؟"

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کے تعاون سے کافی کام ہو گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو باقی کام بھی ہو جائے گا۔"

"آپ بے فکر رہیں مولوی صاحب! مسجد کی تعمیر پر جس قدر رقم خرچ ہو گی، وہ میں ادا کروں گا۔ شاید پچھلی بار بھی میں نے آپ سے کہا تھا کہ چندے کی اپیل کرنا چھوڑ دیں۔ جب میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ مسجد کی تعمیر پر آنے والے تمام اخراجات میں ادا کروں گا تو پھر آپ اپیل کیوں کرتے ہیں......؟" میری بات کے جواب میں مولوی صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے بریف کیس میں سے دو لاکھ روپے نکال کر ان کے ہاتھ میں تھما دیئے اور بولا۔

"یہ آپ اپنے پاس رکھیں۔ امید ہے ان میں آپ کا کام ہو جائے گا بلکہ شاید کچھ رقم بچ جائے۔ وہ آپ رکھ لیجئے گا۔"

مولوی صاحب نے دو لاکھ روپے اپنے پاس سنبھال لئے اور بولے۔ "انشاء اللہ ان میں تمام کام ہو جائیں گے۔" پھر سرہانے کے نیچے سے ایک کاپی نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "پچھلی بار آپ جو ایک لاکھ روپیہ دے گئے تھے، اس کا ایک ایک روپے کا حساب اس میں درج ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے کاپی بند کر کے مولوی صاحب کو واپس کر دی اور بولا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں مولوی صاحب..... میں جانتا ہوں آپ جیسا پابند صوم وصلوٰۃ، نیک اور ایماندار شخص اپنی جیب سے تو مسجد کے لئے خرچ کر سکتا ہے مگر مسجد کا پیسہ جیب میں نہیں ڈال سکتا۔"

میری بات سن کر مولوی صاحب کی گردن اکڑ گئی اور دو تین بار اپنی داڑھی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ "چوہدری صاحب! سبھی لوگوں کی سوچ آپ جیسی نہیں ہوتی۔ اس لئے حساب کتاب سیدھا رکھنا پڑتا ہے..... آپ نیک دل انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیکی کا اجر عظیم عطا فرمائے۔"

"آمین۔"

مولوی صاحب یوں تو میرے قریب ہی کھڑے تھے لیکن کچھ اور نزدیک آ کر بڑی

رازداری سے بولے۔ ''چوہدری صاحب! آپ نے ذکر کیا تھا کہ آپ بندے
بھجواتے ہیں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میرے عزیزوں کے کچھ بچے فارغ پھر رہے ہیں
اگر کسی طرح آپ انہیں باہر بھجوا دیں......''

''فی الحال تو میرے پاس کوئی ویزہ نہیں۔ امید ہے اگلے ماہ ویزے آئیں گے
سعودی عرب میں فوج کے لئے تقریباً پانچ سو جوانوں کی ضرورت ہوگی۔ انہی میں
کے بندے بھی بھجوا دوں گا۔ بلکہ اگر اس علاقے کے اور لوگ بھی جانا چاہیں تو آ
بندوبست کر کے رکھیں۔ کیونکہ جب ویزے آئیں گے تو میرے پاس زیادہ وقت نہیں
گا۔''

''بڑی مہربانی چوہدری صاحب...... فوج کے لئے ہمارے علاقے سے اچھے
آپ کو کہاں ملیں گے؟ پانچ چھ سو جوان تو یہیں سے مل جائیں گے اور رقم کا بندوبست
کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے مولوی صاحب! اب مجھے اجازت دیں۔ ویزے آنے پر میں آ
اطلاع کر دوں گا۔''

میری موجودگی میں ہی مولوی صاحب نے بچے کو چندے کی اپیل کرنے سے
دیا اور لاؤڈ اسپیکر اٹھوا کر اندر بھجوا دیئے۔ میں نے مولوی صاحب سے اجازت ل
چلتے چلتے ہزار کا نوٹ مولوی صاحب کی جیب میں ڈال دیا۔ مولوی صاحب مجھے د
دینے لگے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے چل پڑا۔

لاہور پہنچ کر میں نے ایک بار پھر مکھن کو اسی ہوٹل میں ٹھہرایا جہاں چند روز قبل
ٹھہرایا تھا اور پہلے کی طرح اپنے لئے دوسرے ہوٹل میں کمرہ بک کروا لیا۔ اسے
چھوڑ کر میں نے اس سے اگلے روز ملنے کا وعدہ کیا اور اپنے ہوٹل میں آ گیا۔
کمرے میں پہنچ کر میں نے مکھن کے وہ خط بریف کیس سے نکال کر اپنے سامنے
لئے جو میں نے بہت احتیاط سے سنبھال رکھے تھے۔ میں نے پہلے سے نہ صرف
پر مکھن کے گاؤں کا ایڈریس ٹائپ کروا رکھا تھا بلکہ اس پر متحدہ عرب امارات کے ٹکٹ
لگا رکھے تھے۔ میں نے مکھن کا وہ خط جس میں اس نے اپنے دبئی پہنچنے کی اطلا
تھی، لفافے میں ڈال کر لفافہ بند کر دیا۔

میں نے لفافہ بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور کمرہ لاک کر کے گاڑی میں جا بیٹھا۔
میں نے تمام معلومات پہلے سے اکٹھی کر رکھی تھیں۔ دبئی جانے کے لئے فلائٹ کا وقت
ہونے والا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کا رخ ایئر پورٹ کی طرف کر دیا۔ ایئر پورٹ پہنچا تو
جہاز روانہ ہونے میں کچھ وقت تھا۔ لوگ بورڈنگ کے لئے اندر جا رہے تھے۔ میں نے
مسافروں پر ایک نگاہ دوڑائی تو میری نظر ایک شخص پر جا کر رک گئی۔ وہ میرے کام کا
آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں بریف کیس پکڑے بورڈنگ کے لئے جانے والا
تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ
کچھ پریشان ہو گیا اور گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''کیا بات ہے بھائی...... مجھے کیوں روکا ہے......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے چوہدری صاحب! بس آپ کو تھوڑی سی تکلیف دینی تھی۔''

میرے چوہدری کہنے پر وہ اکڑ گیا اور بولا۔ ''نہیں نہیں، تکلیف کیسی۔ آپ بتائیں،
میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں......؟''

میں نے بات بنتی دیکھ کر لفافہ جیب سے نکال لیا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے
بولا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو دبئی پہنچ کر یہ لفافہ کسی بھی پوسٹ بکس میں ڈال دیجئے گا۔
یہ آپ کا احسان ہوگا۔'' لفافہ میرے ہاتھ سے پکڑ کر اس نے الٹا سیدھا کر کے دیکھا اور
پھر جیب میں ڈال لیا اور بولا۔

''یہ بھی کوئی بات ہے بھلا...... آپ بالکل بے فکر رہیں، میں جاتے ہی ڈال
دوں گا۔''

''بہت شکریہ...... بڑی مہربانی......'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ اندر چلا گیا اور
میں واپس چل پڑا۔

یہ مرحلہ بخوبی طے ہو گیا تھا۔ میں نے راستے میں رک کر پی سی او سے اپنے دفتر فون
کر کے عروج سے تمام حالات معلوم کر لئے اور اسے بتا دیا کہ ابھی واپس آنے میں مجھے
کچھ دن اور لگ جائیں گے۔ تب تک میں فون پر ہی تمام رپورٹ لے لیا کروں گا۔ مجھے
اس بات کی خوشی تھی کہ عروج اور گوہر نے تمام کام بخوبی سنبھال رکھا تھا ورنہ میں اس
بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ مالک کی غیر موجودگی میں ملازمین دفتر کا کیا حشر کرتے ہیں۔

میں اگلے روز مکھن کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید میرا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ آج نہیں تو کل دُبئی روانگی ہو جائے گی۔ وہ اس اُمید میں بیٹھا دکھائی دے رہا تھا کہ میں ابھی اسے یہ خبر دوں گا کہ اس کی فلائٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ مگر میں نے اسے دن تک ٹالنے کے لئے پہلے ہی سے بہانہ تیار کر رکھا تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی اپنے چہرے پر پریشانی اور افسردگی کے آثار پیدا کر لئے اور بولا۔

"میں تو سوچ رہا تھا کہ ہم لاہور پہنچیں گے تو تمہارا ویزہ لگ کر آ چکا ہوگا اور ایک روز میں تمہیں جہاز پر بٹھا دوں گا۔ مگر لگتا ہے کچھ روز اور لگ جائیں گے۔"

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا۔ "کیا ہوا...... ویزہ لگ کر کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہا کہ ایسا کیوں ہوا...... ایسا ہونا تو نہیں چاہئے تھا۔"

میں نے جان بوجھ کر گول مول بات کی تھی جو مکھن کے سر سے گزر گئی تھی اور وہ بولا

"سلیم بھائی! میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا...... ذرا تفصیل سے بتاؤ تا کہ مجھے بھی معلوم ہو سکے......"

"ایسی پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں...... کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔ اصل میں تمہارا پاسپورٹ ویزہ لگنے کے لئے ایمبیسی گیا ہوا تھا اور دو روز قبل ویزہ سٹمپ ہو کر واپس آ جانا چاہئے تھا۔ لیکن ایمبیسی والوں سے تمہارا پاسپورٹ کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔ اسی لئے میں خود اسلام آباد جا رہا ہوں۔ امید ہے جلد لوٹ آؤں گا۔ تم پریشان نہ ہونا۔ ہوٹل میں ہی رہنا، میں فون پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔ تم یہاں مزے سے رہو۔ ہوٹل والوں کو میں نے ایڈوانس رقم جمع کروا رکھی ہے۔ دیکھو مجھے اس کام میں ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔ تم فکر مت کرنا۔ تمہارے کمرے میں ٹی وی موجود ہے۔ فلمیں اور اچھے اچھے پروگرام دیکھ کر مزے اڑاؤ۔"

میری بات سنی تو مکھن کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"میں نے تم سے کہا بھی ہے کہ پریشان نہیں ہونا۔ میں ہوں ناں...... سب درست ہو جائیں گے۔" میں نے اسے حوصلہ دیا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا اب

چلتا ہوں۔ تم کہیں اِدھر اُدھر نہ جانا۔ میں تمہیں ہوٹل کے نمبر پر فون کر لیا کروں گا۔"

کیونکہ پچھلے کئی روز سے میں دفتر سے غائب تھا اس لئے ہوٹل سے نکل کر میں نے اپنے دفتر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ گو کہ میں جانتا تھا کہ عروج اور گوہر انتہائی ذمہ دار ہیں لیکن تمام تر کام ملازموں پر بھی نہیں چھوڑے جا سکتے۔ کیونکہ وہ تو اس قدر ہی کام کرتے ہیں جتنا انہیں سمجھا دیا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ان میں اہلیت ہو بھی تو وہ نہیں کر پاتے کیونکہ انہیں اس کی اجازت یا حکم نہیں ہوتا۔ یوں بھی دفتر میں میری موجودگی اس لئے بھی ضروری تھی کہ کرسٹل پلازہ کی ادائیگی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اس کے لئے رقم کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے گوہر اور عروج کو اپنے پاس بلا لیا اور ان سے تمام معاملات کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ میرے خیال کے مطابق آہستہ آہستہ کاروبار کم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو اپنی اپنی سیٹوں پر بھجوا دیا اور خود فون اٹھا کر ان لوگوں سے رابطہ کرنے لگا جو جائیداد کے لین دین میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔

میں پہلے سے ہی یہ بات سوچ کر دفتر آیا تھا کہ اب کم از کم ایک ہفتہ دفتر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا اور اپنی تمام تر توجہ کام پر دینی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے مکھن کی بھی فکر تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر ہوٹل سے کہیں باہر نہیں جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا خوف بھی تھا کہ کہیں کسی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے۔ اس لئے ہر روز اسے فون ضرور کرتا۔ میں اس معاملے میں بھی انتہائی سنبھل کر قدم اٹھاتا تھا۔ میں نے اسے ایک بار بھی اپنے دفتر سے فون نہیں کیا تھا۔ میں جب بھی کسی کام کے سلسلے میں باہر نکلتا تو راستے میں کہیں کسی پی سی او سے فون کر لیتا تا کہ اسے تسلی رہے۔

مجھے مکھن سے ملے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ گو کہ میں اسے بذریعہ فون مسلسل تسلی دیتا رہتا مگر اب اس کی باتوں سے مایوسی اور نا اُمیدی جھلکنے لگی تھی۔ اس لئے بہتر یہی تھا کہ اسے ہوٹل جا کر مل لیا جائے تا کہ اسے کچھ سکون ہو جائے کہ میں کہیں بھاگا نہیں ہوں، اسی کے کام میں لگا ہوا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ مکمل طور پر مایوس ہو جاتا، اسے اس کا پاسپورٹ دکھانا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

رات آٹھ بجے دفتر سے چھٹی ہوتے ہی میں گھر جانے کی بجائے اس ہوٹل میں جا

پہنچا جہاں میں نے اپنے لئے کمرہ بک کروا رکھا تھا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد
نے بریف کیس پکڑا اور کاؤنٹر سے اپنے کمرے کی چابی لے کر اپنے کمرے میں آ
کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازے کو تالا لگا دیا اور چابی اسی میں رہنے
تاکہ وہاں سے کوئی دیکھ نہ سکے۔ اپنی مزید تسلی کے لئے میں نے دروازے اور کھڑکی
کے پردوں کو اچھی طرح درست کر دیا۔ جب مجھے اس بات کی پوری طرح تسلی ہو گئی
اب کہیں سے کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا تو میں نے احتیاط سے بریف کیس اٹھا کر
سامنے بیڈ پر رکھ لیا۔ میں نے راستے میں سبزی والے سے آلو خرید کر بریف کیس
رکھ لئے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر ضروری اشیاء بھی بریف کیس میں موجود تھیں۔

میں نے طویل سوچ بچار کے بعد پروگرام ترتیب دیا تھا اور مجھے اپنی نظر میں جو ہر
سے مناسب اور صحیح طریقہ لگا تھا، وہی کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے چھری کے ساتھ احتیاط
سے آلو کو دو حصوں میں کاٹ لیا اور پیپر پن کی مدد سے مختلف طریقوں سے مہریں بنا
کی غرض سے الفاظ کشیدہ کرنے لگا۔ یہ انتہائی مہارت کا کام تھا۔ میں نے تین عدد مہ
بنانے کے لئے بہت سے آلو کاٹ کاٹ کر ضائع کر دیئے۔ میرے پاس کٹے ہو
آلوؤں کی ڈھیری لگ گئی تھی۔ آخر کار کئی گھنٹوں کی تھکا دینے والی کوشش سے میں
مطلوبہ مہریں بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے پاسپورٹ پر آلو سے مہریں لگانے
پہلے سادہ کاغذ پر لگا کر چیک کر لیں۔ تمام کام میری مرضی کے عین مطابق ہوا تھا۔ ج
مجھے مکمل طور پر تسلی ہو گئی تو میں نے احتیاط سے پاسپورٹ پر اس انداز سے مہریں لگا
کہ جس سے یہ ظاہر ہو کہ ایمبیسی والوں نے پاسپورٹ پر ویزے کی مہریں لگا دی ہ
اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ تمام آلو ضائع کرنے
لئے ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کموڈ میں بہا دیئے۔

رات بہت گزر گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت یقینی طور پر مکھن سویا ہوا ہو گا۔
میں نے جان بوجھ کر اسے فون کر دیا۔ اس کی آواز سنتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ
تھا۔ میں نے جان بوجھ کر سوال کیا۔

"مکھن! میں چوہدری سلیم بول رہا ہوں...... لگتا ہے تم سو رہے تھے۔"

"سلیم بھائی! تم ہو......؟"

"ہاں ہاں، میں چوہدری سلیم بول رہا ہوں۔ دیکھ لو، تم سکون کی نیند سو رہے ہو اور میں تمہاری خاطر بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... یہ تمہارا احسان ہے۔ مگر تم نے اس وقت فون کیا ہے۔ خیر تو ہے ناں......؟"

"ہاں یار! سب خیر ہے...... مجھے معلوم تھا کہ تم اس وقت سو رہے ہو گے۔ لیکن میرے پاس خوشی کی ایسی خبر تھی کہ مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اس لئے فوراً تمہیں فون کر دیا۔ ویسے تم سمجھ گئے ہو گے۔ پھر بھی بتا دیتا ہوں کہ تمہارا پاسپورٹ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور ویزہ بھی لگ گیا ہے...... تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔"

"واقعی...... میرا ویزہ لگ گیا ہے......؟" مکھن کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اسی لئے تو اس وقت فون کیا ہے...... اچھا فی الحال تم آرام کرو۔ میں کل کسی وقت آ کر تم سے ملوں گا۔ اوکے...... خدا حافظ۔"

میں اس کام سے فارغ ہونے کے بعد سکون سے سو جانا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں نیند کہیں دور بھاگ گئی تھی۔ میں بار بار کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند کو منا نہ سکا اور وہ مجھ سے روٹھی ہی رہی۔ چونکہ میرا ذہن منصوبہ بندی میں مصروف تھا اس لئے نیند کہاں سے آتی۔ رات بھر میرا ذہن نہ جانے کیسے کیسے پلان تیار کرتا رہا۔ صبح ہو چکی تھی۔ مزید لیٹے رہنا فضول تھا اس لئے بستر چھوڑ کر باتھ روم میں گھس گیا اور دیر تک شاور کے نیچے کھڑا اپنے سر پر پانی بہاتا رہا تاکہ کچھ فریش ہو سکوں۔

نہانے سے فارغ ہو کر میں نے ناشتہ کیا اور مکھن کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے چینی سے میرے انتظار میں کھڑا کمرے میں ٹہل رہا ہو گا۔ لیکن جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ مکھن لمبی تان کر سویا ہوا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور سکون سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر اسی پوزیشن میں گزر گئی۔ وہ سویا رہا اور میں انتظار میں بیٹھا رہا۔ وہ جس حالت میں سو رہا تھا اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ ابھی مزید کافی دیر تک نہیں اٹھے گا جبکہ میں

فارغ ہو کر اپنے دفتر جانا چاہتا تھا۔ مناسب یہی تھا کہ اسے کسی طرح جگایا جائے۔ میز
پانی کا جگ اور گلاس پڑا تھا۔ میں نے جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈالا اور قدرے زو
سے جگ میز پر رکھا۔ جگ کی آواز سن کر اس کے خراٹے بند ہو گئے اور اس نے آنکھ
کھول کر میری طرف دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ جلدی سے اٹھ گیا اور بولا۔ "سیٹھ
بھائی......تم کب آئے......؟"

"بھئی میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تم بے صبری سے میرے انتظار میں بیٹھے ہو گے
لیکن یہاں آ کر دیکھا تو تم گہری نیند سوئے پڑے تھے۔"

میری بات سن کر مکھن شرمندہ ہو گیا اور بولا۔ "دراصل رات کو جب تمہارا فون آیا
میں سو رہا تھا۔ تمہارا فون سن کر خوشی سے میں دیر تک سو نہ سکا۔ پھر نہ جانے کب آنکھ لگ
گئی۔ اس لئے تمہارے آنے کا پتہ بھی نہ چل سکا۔"

"اچھا خیر...... پہلے تم گرما گرم چائے منگواؤ اور جب تک ویٹر چائے لے کر آتا
تم منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر میں تمہیں تمہارا پاسپورٹ دکھاتا ہوں۔"

مکھن چاہتا تھا کہ میں فوری طور پر اس کا پاسپورٹ دکھا دوں لیکن میرے کہنے
وہ خاموش ہو گیا اور انٹر کام پر چائے کا آرڈر دے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر
چائے آ گئی اور مکھن بھی منہ ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکل آیا۔ وہ میرے قریب
دوسری کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے بریف کیس میں سے پاسپورٹ نکال کر اس
سامنے لہراتے ہوئے کہا کہ یہ ہے تمہارا پاسپورٹ۔

اس نے جلدی سے پاسپورٹ مجھ سے لے لیا اور اس کے اوراق پلٹنے لگا۔ میں
اس سے پاسپورٹ پکڑ لیا اور بولا۔ "لاؤ مجھے دو۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں ویزہ کہاں لگا
ہے۔"

میرے کہنے پر مکھن نے پاسپورٹ مجھے پکڑا دیا اور میرے ہاتھوں کی طرف دیکھ
لگا۔ میں نے چند اوراق پلٹ کر وہ صفحہ نکال کر پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جہا
ویزے کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ کاش وہ لمحے کسی کیمرے میں قید کئے جا سکتے جنہیں د
کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ جب کسی غریب کو کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ کس قدر جذباتی
جاتا ہے۔ مکھن بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ج

خوشی کو کوئی اور راہ دکھائی نہ دی تو اس کی آنکھوں کے رستے آنسو بن کر اچھل پڑی اور
فرطِ جذبات سے مکھن نے اپنا پاسپورٹ چوم لیا۔

مکھن کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ میں فوری طور پر اپنی
آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ مکھن کی آنکھوں سے تو خوشی
کے آنسو نکل پڑے تھے، میری آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ نکلے تھے؟ جبکہ میں تو حقیقت
سے آشنا تھا۔ پھر میرا ضمیر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے لعنت ملامت کرنے لگا۔ مجھے خیال آیا
کہ چاچا خیرو تو مجھے میرا محسن بن کر ملا تھا اور میں اسی محسن کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ اگر اس
روز وہ مجھے گاؤں میں نہ روکتا تو جہاں راستے میں ایک ہی خاندان کے کئی افراد قتل
ہوئے، وہاں میں بھی ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بن سکتا تھا۔ نہ جانے میرا ضمیر کہاں
سے جاگ اٹھا تھا۔ مگر ضمیر کو مارنے یا سلانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ مکھن ابھی تک
پاسپورٹ کے اوراق اُلٹ پلٹ کر دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ضمیر کو تھپکیاں دیں اور
آنے والے دنوں کے سہانے خواب دکھا کر چند لمحوں میں ہی گہری نیند سلا دیا۔ کچھ ہی
دیر بعد میرے چہرے پر پھر سے مسکراہٹ بکھر گئی اور میں نے مکھن کو بھی اپنی مسکراہٹوں
میں شامل کر لیا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک بیٹھے مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے رہے۔ پھر میں نے
مکھن سے پاسپورٹ لے کر اپنے بریف کیس میں رکھ لیا اور اس سے اس وعدے کے
ساتھ جدا ہوا کہ اب دو چار روز میں ٹکٹ لے کر پھر آؤں گا۔

میں نے ہوائی جہاز کی ٹکٹ کا پہلے سے ہی انتظام کر رکھا تھا اور وہ ٹکٹ میرے
بریف کیس میں موجود تھا۔ لیکن میں ابھی کچھ دن اور گزارنا چاہتا تھا اس لئے اس سے
یہی کہا کہ دو چار روز میں ٹکٹ کا انتظام ہو جائے گا۔

میں نے دو چار روز کا کہا تھا مگر جان بوجھ کر دو ہفتے لگا دیئے۔ اس دوران میں ہر
دوسرے تیسرے روز فون کر کے اسے تسلی دیتا رہا۔ میں ہر بار اسے ایک نئی کہانی سنا دیتا
کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا حصول کس قدر مشکل ہو رہا ہے۔ میں اس انداز میں کہانی بیان
کرتا کہ وہ مطمئن ہو جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ قریب قریب پچھلے ایک ماہ سے وہ ہوٹل کے
کمرے میں قیدی کی طرح رہ رہا تھا۔ گو کہ اسے وہ تمام سہولیات موجود تھیں جو اس نے
کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی لیکن آزادی کی اپنی اہمیت اور مزا ہے۔ جہاں

چاروں طرف دیواروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا ہو، وہ جگہ قید بن کر رہ جاتی ہے۔
گاؤں کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے والا مکھن آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب سجائے کمرے کی گھٹن کو بھی بخوشی برداشت کئے جا رہا تھا۔

جیب میں جہاز کی ٹکٹ ڈالے جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ نجانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"السلام علیکم......" میں نے زوردار آواز میں سلام کیا تو وہ چونک گیا اور اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

"بھائی تم......"

"جناب مکھن صاحب...... میں ہی ہوں...... یار! کہیں تم مایوس تو نہیں ہو گئے تھے؟ ویسے تو مایوسی گناہ ہے۔ لیکن پھر بھی مایوس ہونے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ......اب جہاز کا ٹکٹ......میرے ہاتھوں میں ہے......اور......اگلے ہفتے تمہاری روانگی ہے۔"

"اگلے ہفتے......؟"

"ہاں یار مکھن...... بہت مشکل سے تمہاری ٹکٹ کا انتظام کیا ہے......تمام جہاز بھرے ہوئے جا رہے ہیں اور اگلے بیس دن تک کسی بھی جہاز میں کوئی سیٹ خالی نہیں۔ لیکن میں نے مل ملا کر تمہاری سیٹ کنفرم کروائی ہے۔ بہرحال اب فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ چند دن تو چٹکیوں میں گزر جائیں گے۔ اب تم چاہو تو اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ اپنے پاس رکھ لو یا میرے پاس رہنے دو۔"

اس کا پاسپورٹ تو پہلے سے ہی میرے پاس تھا جبکہ ٹکٹ اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس نے میری بات سن کر ٹکٹ میری طرف بڑھا دی اور بولا۔ "بھلا میں یہ ٹکٹ اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا...... پاسپورٹ بھی تمہارے پاس ہے، ٹکٹ بھی تم اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھو۔ روانگی کے روز تم ساتھ ہی ہو گے، اس وقت مجھے دے دینا۔"

میں نے اس سے ٹکٹ لے کر واپس جیب میں ڈال لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اٹھتے ہوئے دیکھ کر وہ فوراً بول پڑا۔ "کچھ دیر بیٹھو تو سہی۔ ابھی آئے اور ابھی چل دیئے۔"

"میں ضرور بیٹھتا۔ لیکن مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ تم فکر نہیں کرنا، میں تم سے رابطہ رکھوں گا اور تمہاری فلائٹ سے پہلے تمہارے ساتھ تمام پروگرام طے کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری خوشی۔"

میرے آنے سے پہلے مایوسی کے آثار اس کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہے تھے لیکن اب وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تھا اور بات بات پر مسکرا رہا تھا۔

کئی روز قبل میں نے مکھن کا وہ خط جس میں اس نے گھر والوں کو رقم بھجوانے کے بارے میں ذکر کیا تھا، اپنے ایک جاننے والے کو بھجوا دیا تھا اور اس سے درخواست کی تھی کہ اس خط کے ہمراہ پانچ ہزار روپے کا ڈرافٹ لگا کر لفافے پر لکھے ہوئے ایڈریس پر پوسٹ کر دے۔ اپنے اس جاننے والے سے میں نے یہی کہا تھا کہ میں اس طرح کسی غریب کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے پانچ ہزار روپے اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا کر رسید بھجوا دی تھی تاکہ وہ اپنی رقم کے لئے پریشان نہ ہو۔ میرے حساب کے مطابق وہ خط جس میں ڈرافٹ تھا، چاچا کو مل جانا چاہئے تھا۔ اس لئے اب مکھن کے گاؤں جانے کا بہترین موقع تھا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں جتنی بار بھی مکھن سے ملا تھا، میں نے اپنے گیٹ اپ کا خاص خیال رکھا تھا۔ اب گاؤں جاتے ہوئے بھی میں اسی گیٹ اپ میں تھا جس میں پہلی اور دوسری بار گاؤں گیا تھا۔

عمر گڑھ جاتے ہوئے راستے میں مولوی صاحب سے ملنا بھی ضروری تھا۔ میں وہاں پہنچا تو مسجد کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا تھا اور ایک خوبصورت مسجد میرے سامنے تھی۔ مسجد کے باہر کچھ بچے کھیل رہے تھے مگر مولوی صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے ایک بچے کو اپنے پاس بلا کر مولوی صاحب کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اور وہ ان کے ساتھ اپنے حجرے میں ہیں۔ میں نے گاڑی درخت کے سائے میں کھڑی کر دی اور اس بچے سے کہا کہ مجھے مولوی صاحب کے پاس لے چلو۔ بچہ میرے آگے آگے چل پڑا اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ مسجد کے حجرے سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ میں حجرے کے باہر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور بچہ حجرے میں داخل ہو گیا۔ بچے کے اندر جاتے ہی آوازیں آنا بند ہو گئیں اور ساتھ ہی مولوی صاحب حجرے سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے گلے لگا لیا اور بولے۔

"چوہدری صاحب! بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔ ابھی ابھی میں آپ ہی کا ذکر کر رہا

تھا۔ ہماری خوش قسمتی دیکھئے کہ آپ خود تشریف لے آئے۔"

"یہ تو آپ کا احسان اور میری خوش بختی ہے کہ آپ جیسے نیک انسان مجھ جیسے گناہگار کو اپنی باتوں میں یاد رکھتے ہیں۔ ورنہ میں کہاں کسی قابل ہوں......؟"

"چوہدری صاحب! یہ تو آپ کا بڑا پن ہے۔ ورنہ آپ جیسے فرشتہ سیرت انسان اس زمانے میں اب کہاں ملتے ہیں......؟" بات کرتے کرتے اچانک انہیں خیال آیا کہ مجھے دھوپ میں لئے کھڑے باتیں کئے جا رہے ہیں۔ شرمندہ سے ہو کر بولے۔ "معاف کرنا چوہدری صاحب! میں باتوں میں لگ گیا اور آپ کو اندر چلنے کو بھی نہیں کہا۔"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں...... ویسے تو ہم یہیں کھڑے ہو کر بات کر لیتے ہیں لیکن اگر آپ اندر چلنے کو کہتے ہیں تو اندر چلے چلتے ہیں۔"

مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ لئے حجرے میں داخل ہوئے تو وہاں کچھ لوگ دری پر بیٹھے تھے۔ شاید میرے پاس آنے سے پہلے مولوی صاحب انہیں میرے بارے میں بتا آئے تھے اس لئے مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا اور دری پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ لوگ بھی اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی میں نے بات کا آغاز کر دیا۔

"مولوی صاحب! سب سے پہلے تو آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ ماشاء اللہ بہت ہی خوبصورت مسجد تعمیر ہوئی ہے۔"

"آپ کو بھی مبارک ہو۔ یہ سب آپ ہی کی کوششوں سے ممکن ہوا ہے۔ ورنہ ابھی تک ہم چندے کی اپیلیں کر رہے ہوتے اور مسجد وہیں کی وہیں ہوتی...... آپ نے مسجد کی تعمیر کے لئے دل کھول کر رقم دی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ مسجد کا افتتاح بھی آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے کروایا جائے۔"

"مولوی صاحب! آپ مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ مسجد کا افتتاح کروں۔ آپ مسجد کے امام بھی ہیں اور باکردار بھی۔ میری نظر میں تو مسجد کا افتتاح بھی آپ ہی کے ہاتھوں سے ہونا چاہئے۔"

"چوہدری صاحب! یہ آپ ہیں جو ایسا سوچ رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ نہ صرف میری بلکہ مسجد انتظامیہ کی بھی خواہش ہے کہ یہ کام آپ ہی کے ہاتھوں انجام پائے۔

لوگ آپ ہی کے انتظار میں تھے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو اس آنے والے جمعہ کو یہ نیک کام ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے مولوی صاحب! اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو میں حاضر ہوں...... میں آپ کو ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں کہ اس روز میں نے جن پانچ سو ویزوں کا ذکر کیا تھا، ان کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ جو لوگ جانا چاہتے ہوں وہ ایک ایک لاکھ روپے کے حساب سے رقم لے آئیں۔ اور ہاں...... آپ نے اپنے جن عزیزوں کا ذکر کیا تھا، ان سے صرف پچاسی ہزار روپے کے حساب سے رقم وصول کروں گا۔"

"اچھا کیا چوہدری صاحب آپ نے یاد کروا دیا......" پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "یہی ہیں میرے وہ عزیز جن کے بارے میں آپ سے میں نے ذکر کیا تھا۔ ان کے پاس رقم کا بندوبست بھی ہے۔ اگر آپ کہیں تو یہ ابھی اپنے گھر سے لا کر دے دیں۔"

"نہیں مولوی صاحب! اس کی ضرورت نہیں۔ جب میں جمعہ کے روز مسجد کے افتتاح کے لئے آؤں گا تو اس روز ویزے میرے ہاتھ میں ہوں گے۔ اسی روز رقم وصول کروں گا۔ بس آپ اتنی مہربانی کیجئے گا کہ جو لوگ جانا چاہتے ہوں ان کی لسٹ بنا کر پاسپورٹ لے لیجئے گا۔"

"آپ بے فکر رہیں چوہدری صاحب! جب سے آپ مجھے کہہ کر گئے ہیں، میں نے کئی لوگوں سے اس بات کا ذکر کر دیا تھا۔ تب سے لوگ ٹولیوں کی شکل میں میرے پاس چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ تو ایڈوانس رقم بھی دینا چاہ رہے تھے لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا......"

"آپ نے بہت اچھا کیا مولوی صاحب! کسی سے ایڈوانس رقم لینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔" بات کرتے ہوئے میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "معاف کیجئے گا مولوی صاحب! اب مجھے چلنا چاہئے۔ کیونکہ مجھے کہیں پہنچنا ہے۔ ورنہ اندھیرا ہو جائے گا۔"

میں جانے کے لئے اٹھا تو مولوی صاحب کے ساتھ وہ چاروں افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے ساتھ ساتھ باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ جب تک میں وہاں سے

چل نہ پڑا، وہ لوگ وہیں کھڑے رہے۔

عمر گڑھ جاتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ انہیں میری طرف سے بھجوائے ہو
مکھن کے دونوں خط مل گئے ہوں۔ میں ڈرتے ڈرتے عمر گڑھ پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی چا
خیرو نے اپنے گلے لگا لیا۔ اسے خوش دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ ا
دونوں خط مل چکے ہیں۔ پھر بھی میں نے اپنی تسلی کے لئے پوچھا۔

"سناؤ چاچا! مکھن کی کوئی خیر خبر آئی......؟"

میری بات سن کر وہ ہنس پڑا اور اس کے میل سے بھرے گندے دانت باہر
آئے۔ "ہاں پتر...... خیر سے مکھن کے دو خط آ گئے ہیں اور ساتھ ہی پانچ ہزار روپے
بھجوائے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے چاچا! اسی لئے تم اتنے خوش دکھائی دے رہے ہو۔"

"اچھا پتر! تم یہاں بیٹھو، میں ابھی آیا۔" چاچا یہ کہتا ہوا مجھے بیٹھک میں بٹھا کر
والوں کو میرے آنے کی اطلاع کرنے چلا گیا۔ چاچا کے گھر میں جانے کے بعد کچھ
جو غالباً مکھن کے چھوٹے بہن بھائی تھے، دوڑتے ہوئے آئے اور بیٹھک کے درواز
میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ وہیں کھڑے وقفے وقفے سے مسکرا رہے تھے اور میرے
بار بلانے پر بھی میرے پاس نہیں آ رہے تھے۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے۔ شا
کچھ دیر اور اسی طرح کھڑے رہتے لیکن چاچا خیرو آ گیا اور اس نے آتے ہی سب
کو وہاں سے بھگا دیا۔

چاچا خیرو آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کپڑے کی بنی ہوئی گٹھلی تھی۔ وہ میرے قر
آ کر کھڑا ہو گیا اور گٹھلی کھولنے لگا۔ میری تمام توجہ چاچا خیرو کے ہاتھوں پر لگی ہوئی
میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ چاچا خیرو کی گٹھلی میں سے کیا نکلے گا۔ چاچا خیرو نے
کھول کر ایک نظر اس میں ڈالی اور پھر احتیاط سے کچھ نکالا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ر
کہ اس نے گٹھلی میں سے پانچ پانچ سو کے نوٹ نکالے تھے۔ اس نے نوٹ نکا
گنے اور اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑ لئے۔ میں چاچا کی حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔
نے ایک بار پھر گٹھلی میں ہاتھ ڈالا اور پانچ پانچ سو کے کچھ اور نوٹ نکالے جو
والے نوٹوں سے کچھ زیادہ تھے۔ نوٹ نکالنے کے بعد چاچا نے گٹھلی ایک طرف رکھ

اور نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"پتر! یہ تو وہ پانچ ہزار ہیں جو مکھن نے بھجوائے تھے۔ یہ اس کی پہلی کمائی کے پیسے
ہیں۔ ان پر تمہارا ہی حق بنتا ہے۔ اور یہ دس ہزار روپے میں اپنی طرف سے تمہیں دے
رہا ہوں۔ دیکھو انکار نہ کرنا، انہیں میری خوشی سمجھ کر رکھ لو......"

"کمال کرتے ہو چاچا...... یہ بات کر کے تم نے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔ چاچا! تم تو
میرے اپنے ہو۔ اور بھلا تم سے پیسے لیتے ہوئے میں اچھا لگوں گا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے چوہدری پتر! مگر تمہارا یہ احسان کیا کم ہے کہ تم نے مکھن کو بغیر کسی
لالچ کے دبئی بھجوا دیا۔ ہمارے لئے تو جیسے خدا نے تمہیں فرشتہ بنا کر بھیجا تھا۔"

"بس چاچا! اب اور شرمندہ نہ کرو۔ یہ پیسے اپنے پاس رکھو...... تمہارے کام آئیں
گے۔"

میری بات سن کر چاچا خیرو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے روتے ہوئے رقم
واپس گٹھلی میں ڈال لی اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔ "واہ مولا واہ...... تو نے
دنیا میں کیسے کیسے نیک لوگ پیدا کر دیئے ہیں......" پھر نظریں میری طرف کر لیں اور
بولا۔ "اچھا چوہدری پتر! خدا تمہیں خوش رکھے۔"

میں نے گاؤں آنے کے لئے ہمیشہ شام کا وقت منتخب کیا تھا۔ شام کے وقت آنے کا
ایک فائدہ تو یہ تھا کہ بغیر کسی بہانے کے با آسانی رات گاؤں میں گزاری جا سکتی تھی۔
دوسری وجہ یہ تھی کہ دن کے وقت گاؤں کے لوگ اپنے اپنے کھیتوں میں کام کاج میں
مصروف ہوتے ہیں جبکہ رات کے وقت تمام کاموں سے فارغ ہو کر انہیں فرصت ہوتی
ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں جب بھی گاؤں آیا، میرے آنے کی خبر فوراً ہی گاؤں والوں تک
پہنچ گئی۔

چاچا خیرو اور کالو میرے کھانے پینے کے انتظامات کے لئے دوڑے بھاگے پھر رہے
تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ دنیا جہان کی نعمتیں میرے لئے اکٹھی کر لاتے۔
میں نے چاچا خیرو کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ آواز سنتے ہی وہ میرے سامنے آ کھڑا
ہوا۔ میں نے آتے ہوئے احتیاط سے وہ دونوں کاغذ بریف کیس میں رکھ لئے تھے جن
پر ویزوں کا اجازت نامہ تھا۔ ایک کاغذ پر پچاس ویزے متحدہ عرب امارات کے تھے جبکہ

دوسرے پر چار ویزے امریکہ کے لئے تھے۔ چاچا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اُ
سے بات کئے بغیر بریف کیس اٹھا کر کھولا اور اس میں سے وہ دونوں کاغذ نکال کر اپ
پاس رکھ لئے اور بریف کیس بند کر کے چارپائی کے ساتھ ایک طرف کھڑا کر دیا۔ چاچ
کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسی لئے وہ حیران و پریشان کھڑا تھا۔ میں نے
اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے ویزوں والے دونوں کاغذات دکھاتے ہوئے بولا۔

"دیکھ چاچا! یہ ہے وہ کاغذ جس پر پچاس ویزے دُبئی کے لئے آئے ہیں۔ اور
ہے وہ کاغذ جس پر چار ویزے امریکہ کے لئے آئے ہیں...... دیکھ لو چاچا! مجھے جیسے
ویزے ملے میں سیدھا تمہارے پاس چلا آیا کیونکہ میرا تم سے اور گاؤں والوں سے وع
تھا کہ جیسے ہی ویزے آئے میں یہاں آ جاؤں گا۔ میں چاہتا تو لاہور میں ہی لوگوں
ویزے لگوا دیتا۔ مگر میں وعدہ خلافی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاچا! اب ویزے تمہارے ہا
میں ہیں۔ جسے تم کہو گے، اسی کو ویزہ ملے گا۔"

ویزوں والے دونوں کاغذ چاچا کے ہاتھ میں تھے۔ وہ انہیں پڑھنے کی کوشش کرتا ر
مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے دونوں کاغذ مجھے واپس پکڑا دیئے اور بولا۔

"میں نے کس کو بھجوانا ہے پتر...... میرا تو پتر مکھن ہی تھا۔ اسے تم نے بھجوا دیا۔ ا
تم جسے چاہو بھیجو۔ ویسے جب سے تم مکھن کو اپنے ساتھ لے کر جاتے ہوئے گاؤ
والوں سے پھر آنے کا وعدہ کر گئے ہو، سارے کا سارا گاؤں ہی دُبئی جانے کے لئے ت
بیٹھا ہے۔ مجھ سے بھی کئی لوگوں نے کہا ضرور ہے مگر میں تمہیں کسی کے لئے نہیں کہ
گا۔ بس تم اس بات کا خیال رکھو کہ جو تمہیں ویزے کی رقم ادا کر دے اس سے حامی
لو۔ باقیوں کو رہنے دو۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو چاچا! لیکن پھر بھی اگر تم کسی کو بھجوانا چاہو یا کسی کو بھجوانے
ارادہ نہ ہو، بس مجھے ذرا سا اشارہ کر دینا...... آج پیر کا دن ہے۔ میں یہاں منگل
بدھ دو دن کے لئے ہوں۔ جمعرات کو صبح یہاں سے ہماری روانگی ہو گی۔"

میرے دو دن گاؤں میں قیام کرنے کا سن کر چاچا خوش ہو گیا کیونکہ اس سے پہلے
مجھے روکتا رہتا تھا مگر میں مصروفیت کا بہانہ بنا کر چل پڑتا تھا اور بمشکل ایک دن ہی گاؤ
میں گزارتا تھا۔ میری بات سنتے ہی وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا اور میں وہاں تنہا رہ گیا۔

مجھے آئے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک بوڑھی عورت جس کی کمر جھکی ہوئی
تھی، اس نے سہارے کے لئے ایک ہاتھ میں لاٹھی سنبھال رکھی تھی جبکہ دوسرا ہاتھ ایک
نوجوان لڑکے کے کندھے پر تھا وہاں آ گئی۔ نوجوان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بوڑھی
عورت کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ بوڑھی عورت میری
چارپائی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور نوجوان دوسری چارپائی پر جا بیٹھا۔ بوڑھی عورت
لاٹھی کا سہارا لئے میرے پاس کھڑی تھی۔ میں چارپائی پر ہی ایک طرف ہو گیا اور بڑھیا
کے لئے جگہ بنا دی تا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ جائے۔ یوں لگتا تھا وہ چلنے سے تھکاوٹ محسوس
کر رہی تھی۔ اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور لمبی لمبی سانسیں
لینے لگی۔ بیٹھک میں مکمل خاموشی تھی۔ وہاں ہم تینوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ بڑھیا کو
اپنی سانس درست کرنے میں کچھ دیر لگی۔ جب اس کی سانس درست ہو گئی تو اس نے
اپنے دائیں ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا بنا کر مجھے غور سے دیکھا اور بولی۔

"کیا تم ہی وہ شخص ہو جس نے خیرو کے پتر مکھن کو دُبئی بھجوایا ہے......؟"

"جی اماں! میں ہی ہوں وہ...... آپ حکم کریں۔" میں نے احترام سے بات کی۔

"یہ میرا پوتا شکور ہے۔" بڑھیا، نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ
اور مکھن ایک ساتھ سکول میں پڑھتے تھے۔ جب سے مکھن دُبئی گیا ہے، اس نے ایک ہی
رٹ لگا رکھی ہے کہ جو بھی ہو، مجھے بھی دُبئی بھجوائیں...... ابھی ابھی تمہارے آنے کا سنا
تھا۔ جیسے تیسے ہانپتی کانپتی یہاں آ پہنچی ہوں۔ پتر! تو اسے بھی دُبئی بھیج دے۔ یہ میرا
یتیم پوتا ہے۔ تمہیں دُعائیں دے گا اور مجھ غریب کے دل سے بھی تمہارے لئے دُعائیں
ہی نکلیں گی۔"

"اماں! تم فکر نہ کرو...... میرے پاس دُبئی کے پچاس ویزے ہیں۔ میں اپنے پاس
تمہارے پوتے کا نام لکھ لیتا ہوں۔ بس تم گھر جا کر میرے لئے دعا کرو اور پوتے کو دُبئی
روانہ کرنے کی تیاری رکھو۔ دو دن بعد ہم یہاں سے نکل پڑیں گے۔"

"اوئے شکور! اِدھر آ میرے پاس۔" اماں نے شکور کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور
بولی۔ "لا وہ پوٹلی مجھے دے جو میں نے تمہیں پکڑائی تھی۔"

اماں کے کہنے پر شکور نے جیب سے پوٹلی نکال کر اس کے حوالے کر دی اور پھر اپنی

جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اماں نے ایک ایک کر کے پوٹلی کی گانٹھیں کھولیں اور اس میں روپے نکال کر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

''یہ رکھ لو...... پورے پچاس ہزار ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے اماں! لیکن یہ تو بہت تھوڑے ہیں...... کم از کم اتنے ہی پیسے چاہئیں۔''

''تم یہ تو رکھو۔ میں نے تھوڑے تھوڑے بچا کر کچھ اور رقم جمع کر رکھی ہے۔ کل ہوتے ہی وہ بھی شکور کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ بس جتنے ہوئے رکھ لینا۔ اماں کا دل توڑنا۔''

اماں کی باتوں کے دوران چاچا خیرو بھی چارپائی پر آ بیٹھا تھا اور غور سے باتیں سن تھا۔ میں نے چاچا خیرو سے پوچھا۔ ''کیوں چاچا! تم کیا کہتے ہو......؟''

''رکھ لو چوہدری پتر......'' چاچا خیرو کہنے لگا۔ ''بڑی دُکھیا ہے بے چاری۔ اس کا جوانی میں ہی سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تھا۔ تب سے اس نے بہت دُکھ اٹھائے ہیں اپنے پوتے کی آس پر زندہ ہے...... میں کسی اور کے لئے کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ جو ہے، لے لو پتر...... غریب دعائیں دے گی۔''

''اچھا چاچا! جیسے تم کہو...... بھلا میں تمہارا کہا کیسے ٹال سکتا ہوں؟''

میں نے بڑھیا کے دیئے ہوئے پچاس ہزار روپے جو ابھی تک میرے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، بریف کیس میں رکھ دیئے اور ایک کاغذ پر شکور کا نام اور ادا شدہ درج کر لی۔ بڑھیا دعائیں دیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شکور نے آگے بڑھ کر اس کا اپنے کندھوں پر رکھ لیا اور اماں کو لے کر باہر کی طرف چل پڑا۔ اسی دوران کچھ اور لوگ گئے۔ وہ ابھی آ کر چارپائی پر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ آ پہنچے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کافی تعداد میں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ بہت لوگ آ جمع ہوئے ہیں اور سب اس امید میں بیٹھے ہیں کہ میں کوئی بات چھیڑوں۔ نے بات شروع کر دی۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ سب یہاں اس امید پر آئے ہیں کہ خود آپ کے لئے آپ کے بھائی یا بیٹے کے لئے ویزے کا انتظام ہو جائے...... جیسا کہ میں نے پچھلی

آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی ویزوں کا کوئی بندوبست ہو گا، میں یہاں آ جاؤں گا۔ آپ سب مطمئن رہیں، میرے پاس پچاس ویزے دُبئی اور چار ویزے امریکہ کے لئے ہیں۔ اگر کوئی دُبئی جانا چاہتا ہو تو ایک لاکھ ادا کر دے۔ اور اگر کسی کو امریکہ جانے میں دلچسپی ہو تو آٹھ لاکھ دے دے۔''

میری بات سن کر وہاں پر موجود لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ گاؤں کا نمبردار جو شاید بیٹھک سے باہر کھڑا میری باتیں سن رہا تھا، اندر آ گیا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اکڑ کر بولا۔ ''او چھوڑیں جی چوہدری صاحب...... یہ چھوٹے موٹے کمی کمین لوگ صرف دُبئی اور سعودی عرب ہی جا سکتے ہیں۔ امریکہ صرف ہم جیسے چوہدریوں کے لئے ہے۔ آپ کل صبح ہی مجھ سے سولہ لاکھ لیں اور میرے دونوں بچوں کو امریکہ بھجوا دیں۔''

نمبردار کی بات ختم ہوئی تو ایک اور اونچی پگڑی والا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''باقی کے دونوں ویزے میرے لئے رکھ لیں۔ میں بھی کل صبح سولہ لاکھ آپ کو دے دوں گا۔ میں اپنے بھائی اور بیٹے کو امریکہ بھجواؤں گا۔''

جو لوگ وہاں موجود تھے، ان میں سے زیادہ تر لوگ رقم کا بندوبست کر کے آئے تھے اور کچھ یوں ہی چلے آئے تھے۔ لیکن میں نے کسی سے بھی رقم وصول نہ کی اور ہر ایک کو یہی کہا کہ وہ نام لکھوا دے اور رقم کی ادائیگی گاؤں سے روانگی کے وقت کرے۔ میں لوگوں کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا کہ دُبئی جانے کے لئے زیادہ تر لوگوں نے اپنی گائے یا بھینسیں فروخت کی تھیں۔ کچھ لوگوں نے زمین کا ٹکڑا فروخت کر دیا تھا۔ کسی نے اپنا گھر اور زیور گروی رکھ کر رقم حاصل کی تھی اور کسی نے بیوی کے زیورات بیچ ڈالے تھے۔ میں ایک ایک کر کے امیدواروں کے نام لسٹ میں درج کرتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دُبئی جانے کے لئے امیدواروں کی تعداد ساٹھ تک جا پہنچی۔ لیکن میں نے صرف پچاس افراد کو لے جانے کا وعدہ کیا تھا جبکہ مجھے امید تھی کہ صبح تک مزید خواہشمند چلے آئیں گے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے ان سب سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میرے پاس چونکہ صرف پچاس ویزوں کی گنجائش ہے اس لئے جو لوگ پہلے رقم جمع کروا دیں گے انہی کو دبئی بھجوایا جائے گا۔ اگر باقی لوگ بھی چاہیں تو رقم میرے پاس جمع کروا دیں۔ ان کی رقم میرے پاس امانت کے طور پر رہے گی۔ جیسے ہی میرے پاس مزید

ویزے آئے تو میں انہیں بھی بھجوا دوں گا۔"

سبھی لوگ اس کوشش میں تھے کہ میں ان سے رقم وصول کرلوں تا کہ انہیں اطمینان
جائے کہ انہیں دُبئی کا ویزہ مل جائے گا۔ لیکن میں نے سب کو سمجھا بجھا کر بمشکل
سے اس وعدے پر رخصت کیا کہ وہ کل صبح رقم لے کر آ جائیں، ان کا کام ہو جائے گا
عجیب لوگ تھے۔ اپنے گھروں کو واپس جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

جب ایک ایک کر کے سبھی لوگ وہاں سے چلے گئے تو میں آنکھیں بند کر کے
چارپائی پر لیٹ گیا۔ چاچا خیرو بھی میرے پاس ہی دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ گو کہ
نے تمام منصوبہ بندی پہلے سے تیار کر رکھی تھی مگر سونے سے پہلے میں تمام پروگرام ترتیب
دینا چاہتا تھا۔ رات بہت بیت چکی تھی اور آنکھوں میں نیند بھی بھری ہوئی تھی۔ جب تمام
معاملات میرے ذہن کے مطابق ترتیب پا گئے تو میں سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کئی لوگ رقم لئے بیٹھک کے باہر موجود
تھے اور میرے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں شاید رات بھر نیند ہی نہیں آئی تھی۔ اس
لئے سورج نکلنے سے پہلے ہی وہاں آ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے لوگوں کی موجودگی
احساس ہو چکا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک ایک کر کے
وہاں کچھ اور لوگ جمع ہوتے رہے اور میں ناشتے میں لگا رہا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے چاچا خیرو کو اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا۔ "چاچا! اگر
کسی اپنے بندے کو بھجوانا چاہتے ہو تو ابھی بتا دو ورنہ اگر لوگوں سے رقم وصول کر لی تو
مشکل ہو جائے گی۔"

چاچا نے نفی میں گردن ہلا دی اور بولا۔ "پتر! تمہارے پہلے ہی مجھ پر بڑے احسان
ہیں۔ اور کتنے احسان کرو گے...... میں تو غریب سا بندہ ہوں، ساری عمر بھی تمہارے
ایک احسان کی قیمت نہیں چکا پاؤں گا۔ اتنے سارے احسانات کے بوجھ تلے تو ویسے
ہی مر جاؤں گا۔"

"چاچا! تم ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ یہ غریبی امیری سب وقتی ہیں۔ یہ دولت کبھی کسی
ایک کی ہو کر کہاں رہی ہے۔ یہ آج میرے پاس ہے تو کل تمہارے پاس۔ انسان کو
انسان بن کر سوچنا چاہئے۔"

"تم بسم اللہ کرو پتر...... لوگوں سے رقم لو اور انہیں دُبئی بھجواؤ...... بہت دعائیں دیں
گے یہ غریب لوگ۔ ویسے بھی ہم جیسے غریبوں کے پاس دُعاؤں کے سوا دینے کے لئے
ہوتا ہی کیا ہے...... وہ بھی اوپر والے کی مرضی...... قبول کر لے تو اس کی مہربانی اور اگر
قبول نہ کرے تو اس کے آگے زور نہیں۔"

"ٹھیک ہے چاچا! تم یہیں میرے پاس بیٹھے رہو۔ میں ایک ایک کر کے نام بتاتا
جاؤں گا...... بس کالو سے کہو کہ میں جس کو بلانے کا کہوں، اگر وہ باہر موجود ہو تو اسے
میرے پاس اندر لے آئے۔"

میری بات سن کر چاچا خیرو نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا
گیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا۔ کالو بھی اس کے ہمراہ تھا۔ میں نے چاچا کو اپنے
پاس بٹھا لیا اور کالو کو ضروری ہدایات دے کر ترتیب وار لوگوں کو ایک ایک کر کے بلانے کو
کہا۔

لوگوں نے یہ عقلمندی کی تھی کہ اپنے پاسپورٹ پہلے سے بنوا رکھے تھے اور رقم کے
ساتھ ساتھ اپنے اپنے پاسپورٹ بھی ہمراہ لائے تھے۔ میں رقم وصول کر کے بیگ میں
ڈالتا جاتا اور ساتھ ہی پاسپورٹ لے کر اس کے نام کے سامنے نشان لگا دیتا۔ سوائے
ایک دو افراد کے سبھی لوگ پوری پوری رقم لے کر آئے تھے۔ جو افراد کچھ رقم کم لائے
ہوتے، میں ان کے متعلق چاچا خیرو سے پوچھ لیتا۔ اگر وہ ہاں کر دیتا تو میں کم رقم لینے پر
بھی تیار ہو جاتا۔ کئی لوگوں کے پاسپورٹ میرے پاس جمع ہو چکے تھے اور کئی لوگ ابھی
انتظار میں کھڑے تھے۔ کالو نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی۔

"باہر چوہدری صاحب اور نمبردار جی دونوں آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ پہلے ہمیں
فارغ کر دو۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں...... تم انہیں فوراً اندر بلاؤ......" میں نے آہستہ سے کالو کو کہا۔

کالو انہیں لینے چلا گیا تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کالو کے پیچھے پیچھے چوہدری اور نمبردار
اپنے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے ہمراہ اندر چلے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی میں احتراماً اپنی
جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ہی چاچا بھی اٹھ گیا۔ میں تو محض رسمی طور پر اٹھا تھا
جبکہ چاچا خیرو کے گھر گاؤں کے چوہدری آئے تھے اس نے تو ان کے احترام میں کھڑا

ہونا ہی تھا۔ میں نے سلام دعا کے لئے ہاتھ بڑھا دیا مگر وہ مجھے گلے لگا کر ملے جبکہ چا
کے ساتھ بمشکل ہاتھ ہی ملایا۔

نمبردار صاحب بیٹھتے ہی اصل بات کی طرف آ گئے اور بولے۔ ''بس جی چوہدری
صاحب! یہ ہیں ہمارے بچے۔ آپ اپنی رقم وصول کریں اور انہیں امریکہ بھجوائیں۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں...... بے فکر رہیں جناب۔ آپ کی دعاؤں سے میں
تمام انتظامات پہلے سے ہی مکمل کر رکھے ہیں۔ خدا نے چاہا تو پرسوں صبح یہاں سے ہمارا
روانگی ہوگی۔ انشاء اللہ زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں یہ لوگ امریکہ جا پہنچیں گے۔
چوہدری صاحب! ایک احسان کر دیجئے مجھ پر......''

''آپ حکم تو کریں چوہدری صاحب۔'' نمبردار نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہو
کہا۔

''بات یہ ہے چوہدری صاحب...... لوگوں نے میرے پاس اپنے اپنے ویزے
لئے رقم جمع کروا دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تمام رقم آپ کے پاس رکھوا دوں۔ آ
کے پاس رقم محفوظ رہے گی۔ جبکہ یہاں مجھے چور ڈاکوؤں کا خطرہ رہے گا۔''

بات سن کر چوہدری صاحب جوش میں آ گئے اور بولے۔ ''ہمارے ہوتے ہوئے
کی اتنی جرأت نہیں کہ اِدھر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ چوری کی نیت سے آنا تو بہت دور
بات ہے...... پھر بھی اگر آپ کہتے ہیں تو ہم اپنے دو آدمی باہر کھڑے کر دیتے ہیں۔
رات بھر پہرہ دیتے رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب! جو آپ مناسب سمجھیں، وہ کریں۔''

کچھ دیر بعد انہوں نے رقم گن کر میرے حوالے کی اور مسکراتے ہوئے اٹھ کر
گئے۔ میں نے پھر سے ایک ایک کر کے دیگر لوگوں کو بلانا شروع کر دیا۔ صبح سے دو
اور پھر دوپہر سے شام ہو گئی تھی۔ جن پچاس افراد نے دُبئی اور چار افراد نے امریکہ
تھا ان کو لے جانے کے لئے بڑی گاڑی کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ
افراد ایسے تھے جنہوں نے ایڈوانس کے طور پر رقم جمع کروا دی تھی۔

روانگی کے وقت عجیب سماں تھا۔ جو لوگ روانہ ہو رہے تھے ان سب کے اہل خا
انہیں الوداع کہنے آئے ہوئے تھے۔ ہر آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یوں محسوس ہو

تھا کہ اس وقت کوئی مرد، بوڑھا، جوان، عورت اور بچہ اپنے گھر میں نہیں رہا تھا۔ سب
اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ جب سب لوگ گاڑی میں سوار ہو گئے تو میں نے
اپنی کار گاڑی کے آگے لگا لی اور ڈرائیور کو ہدایت بھی کر دی کہ وہ میرے ساتھ ساتھ
رہے۔ اوور ٹیک کرنے کی کوشش نہ کرے۔ نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ میں نے اپنی برابر
والی سیٹ پر رکھ لیا اور مکمل اعتماد کے ساتھ وہاں سے چل پڑا۔

میں نے جان بوجھ کر راستے میں مسجد کے سامنے کار روک دی۔ وہ لوگ بھی میرے
پیچھے ہی وہاں آ کھڑے ہوئے۔ میں نے مولوی صاحب کو بلوا لیا۔ میرا پیغام سنتے ہی وہ
دوڑے چلے آئے۔ میں نے جیب سے دس ہزار روپے نکال کر مولوی صاحب کو پکڑا
دیئے اور انہیں بتایا کہ آپ ان روپوں سے تمام انتظامات مکمل کر لیں۔ میں نے گاڑی کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں آج ان لوگوں کو لے جا رہا ہوں۔ کل پروگرام کے
مطابق جمعہ کے وقت مسجد کے افتتاح کے لئے آ جاؤں گا۔ میں نے مولوی صاحب سے
درخواست کی کہ جو لوگ باہر جانا چاہتے ہوں وہ اپنے اپنے پاسپورٹ کے ہمراہ ایک ایک
لاکھ روپے جمع کروا دیں۔ جیسے ہی ویزے لگ کر آئیں گے میں انہیں اطلاع کر دوں گا۔
مولوی صاحب نے میری بات اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ اب وہاں رکے رہنا فضول تھا اس
لئے میں نے مولوی صاحب سے اجازت لی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں نے گاؤں جانے سے قبل ہی ہوٹل میں پچاس ساٹھ آدمیوں کے رہنے کا
بندوبست کر لیا تھا اور انتظامیہ کو ایڈوانس کے طور پر بھی رقم جمع کروا رکھی تھی۔ میں انہیں
ساتھ لئے ہوٹل پہنچا اور انہیں وہاں ٹھہرا دیا۔ یہ وہی ہوٹل تھا جہاں مکھن بھی رہائش پذیر
تھا۔ میں نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت جان بوجھ کر ان لوگوں کو اس ہوٹل میں ٹھہرانے کا
پروگرام بنایا تھا۔ جب تمام لوگ ہنستے مسکراتے اور قہقہے بکھیرتے ہوئے اپنے اپنے کمروں
میں جا پہنچے تو میں نے ان سے اگلے روز آنے کا وعدہ کرتے ہوئے اجازت لی اور وہاں
سے نکل آیا۔ وہاں سے نکل کر میں نے رقم والا بیگ بحفاظت ٹھکانے لگایا اور سکون سے
اپنے ہوٹل کے کمرے میں جا کر سو گیا۔ اگلے روز جمعہ تھا اور پروگرام کے مطابق مجھے
جمعہ کی نماز وہاں ادا کرنا تھی اور نئی تعمیر شدہ مسجد کا افتتاح بھی کرنا تھا۔

♦ ...... ♦

مسجد کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا دیا گیا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو وہاں عام لوگوں
کے علاوہ علاقے کے بہت سے معززین میرے استقبال کے لئے جمع تھے۔ انہوں نے
میرا استقبال پُرجوش نعروں سے کیا۔ نعرے لگوانے میں امام مسجد صاحب پیش پیش
تھے۔ انہوں نے بہت سے پھولوں کے ہار میرے گلے میں ڈالے اور ایک جلوس کی
شکل میں مجھے مسجد میں لے گئے۔ مجھے سب سے اگلی صف میں بٹھا دیا گیا اور تمام لوگ
بھی جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب نے اپنے خطبے کے دوران میری تعریف کے
زمین آسمان ایک کر دیا۔ وہ مسجد کی تعمیر کے لئے میری خدمات کو سراہتے ہوئے پُرجوش
ہو جاتے اور لوگ نعرے لگانے لگتے۔

نماز سے فارغ ہوئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لوگ میری ایک جھلک دیکھنے
کے لئے بے قرار تھے۔ مولوی صاحب نے نہ جانے وہاں کے لوگوں کو میرے بارے
میں کیا بتا دیا تھا کہ لوگ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے دھکم پیل کرنے لگے۔ کئی لوگ
عقیدت سے میرے ہاتھ چومنے لگے۔ میں جلد از جلد کام نمٹا کر وہاں سے نکلنا
چاہتا تھا لیکن لوگ مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے مولوی صاحب کو
اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ فوراً میرے قریب آ گئے۔ میں نے ان کا کان اپنے
منہ کے قریب کیا اور بولا۔

”مولوی صاحب! میرے خیال میں ہم لوگ باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ یہاں
سے فارغ ہو کر مجھے ایک دو جگہ اور بھی جانا ہے۔“

مولوی صاحب نے میری بات سنی اور بولے۔ ”چوہدری صاحب! آپ بالکل بے
فکر رہیں۔ میں نے تمام انتظامات پہلے سے ہی مکمل کر رکھے ہیں۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے......؟“

”چلیں چوہدری صاحب! ابھی چلتے ہیں۔ لوگ آپ سے عقیدت کا اظہار کرتے
ہوئے مل رہے تھے اس لئے میں ایک طرف کھڑا تھا۔ ورنہ تاخیر کی کوئی وجہ نہیں۔“

بات کرتے ہی مولوی صاحب مجھے لئے مسجد سے باہر آ گئے۔ وہاں فوج میں بھرتی
کے لئے آئے ہوئے امیدواروں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ ایک اونچی جگہ پر دو
کرسیاں اور ایک چھوٹا سا میز رکھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب مجھے لئے کرسیوں کی طرف
بڑھے۔ انہوں نے ایک کرسی پر مجھے بٹھا دیا اور دوسری کرسی پر خود بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی
مولوی صاحب نے ایک رجسٹر کھول کر میرے سامنے رکھ دیا جس پر ان جوانوں کے نام
اور مکمل کوائف درج تھے جو بیرونِ ملک جانے کے امیدوار تھے۔

مولوی صاب نے ایک لڑکے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں
کچھ کہا۔ وہ مولوی صاحب کی بات سنتا رہا اور گردن ہلاتا رہا۔ مولوی صاحب کی بات
مکمل ہوئی تو وہ وہاں سے چلا گیا اور مولوی صاحب مجھے تمام تفصیل بتانے لگے۔ مولوی
صاحب نے جس لڑکے کو بھیجا تھا، وہ تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں
کپڑے کا تھیلا پکڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ تھیلا مولوی صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود
ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مولوی صاحب نے وہ تھیلا میرے حوالے کر دیا اور بولے۔

”چوہدری صاحب! سب سے پہلے یہ رقم اپنے پاس رکھیں...... یہ پندرہ آدمیوں کی
ادا کردہ رقم ہے۔ جن لوگوں نے یہ رقم جمع کروائی ہے میں نے ان کے ناموں کے
سامنے نشان لگا دیئے ہیں۔“

مولوی صاحب نے مجھے اتنے سارے لوگوں کے سامنے لا بٹھایا تھا جبکہ ان لوگوں
سے ایک لاکھ روپے فی کس کے حساب سے رقم بھی وصول کرنا تھی۔ یہ مناسب نہ تھا
کہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں رقم لی جائے۔ ایسے میں کوئی بھی حادثہ ہو سکتا
تھا۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ بہتر یہی ہو گا کہ ہم کہیں اندر کمرے میں جا
بیٹھیں اور باری باری امیدواروں کو بلا کر تسلی سے رقم اور پاسپورٹ وصول کریں۔

مولوی صاحب نے فوری طور پر قریب ہی ایک کمرے میں بیٹھنے کا انتظام کر دیا۔
میری ہدایات کے مطابق مولوی صاحب نے بہت سا کام پہلے سے کر چھوڑا تھا اس
لئے مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ ان امیدواروں میں گنتی کے چند امیدوار

ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے فوج میں بھرتی ہونے کے اہل نہ تھے۔ میں نے ا
سے پاسپورٹ اور رقم لینے سے انکار کر دیا۔ انکار کا لفظ سن کر نا اہل امیدوار کا چہرہ لٹک
جاتا۔ میں نے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ مجھے فوج کے لئے موزوں
جوانوں کی ضرورت ہے۔ میں کسی طور بھی ان لوگوں کے لئے حامی نہیں بھر سکتا جو
میڈیکل بنیادوں پر پورے نہ اترتے ہوں۔ ویسے بھی مجھے نظر آ رہا تھا کہ وہاں پر آئے
ہوئے امیدواروں کی تعداد میری سوچ سے کہیں زیادہ تھی جبکہ میں نے صرف پانچ
افراد کو لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔

فارغ ہو کر اٹھنے لگا تو میں نے مولوی صاحب کو چوہدری سلیم کے نام کے بہ
سے وزیٹنگ کارڈ دے دیئے جن پر فون نمبر اور ایڈریس درج تھا۔ میں نے چلتے ہو
مولوی صاحب سے کہہ دیا کہ اگر کوئی مجھ سے رابطہ کرنا چاہے تو اسے میرا یہ کارڈ د
دیں تاکہ وہ با آسانی مجھ سے رابطہ کر سکے۔ میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ میں وہاں مز
کچھ دیر کے لئے رک کر کسی قسم کا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا اس لئے مولوی صاح
کو گلے لگا کر اجازت لیتے ہوئے خدا حافظ کہا اور واپس اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

میں نے بہت دنوں سے داڑھی بڑھا رکھی تھی جبکہ میں اس حالت میں اپنے آفس
گھر نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے راستے میں ایک محفوظ جگہ دیکھ کر شیو وغیرہ بنوائی ا
آنکھوں کے لینز اتار کر دور پھینک دیئے۔ اب چوہدری سلیم وہیں دفن ہو گیا تھا
چوہدری جمیل احمد کلین شیو کے ساتھ اپنے اصلی روپ میں آ گیا تھا۔ میں نے گوہر
کہہ کر کرسٹل پلازہ کی رجسٹری کے کاغذات تیار کروا لئے تھے۔ میں نے راستے میں
ہی ملک امتیاز صاحب کو بھی فون کر دیا کہ وہ میرے دفتر پہنچ جائیں اور اپنی پوری
وصول کر کے رجسٹری کے کاغذات پر دستخط کر دیں۔ کیونکہ ابھی کرسٹل پلازہ کی کم
ادائیگی کرنے میں وقت تھا، اس لئے میری بات سن کر ملک صاحب کو اپنے کانوں
یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی تسلی کے لئے پوچھا۔

"چوہدری صاحب! آپ آج کا ہی کہہ رہے ہیں ناں......؟"

"جی ملک صاحب...... آج اور ابھی بس آپ میرے دفتر پہنچیں۔ میں رقم لے
رہا ہوں۔"

میں نے گوہر اور عروج کو بھی ضروری ہدایات جاری کر دیں کہ وہ میرے آنے تک
آفس میں ہی بیٹھیں اور ملک صاحب آئیں تو انہیں بھی بٹھا کر رکھیں۔

میرے پاس بہت بڑی رقم موجود تھی اور میں خوفزدہ بھی تھا۔ لیکن چونکہ میں اپنے
اس مشن میں کسی دوسرے کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے تمام کام تن تنہا انجام دیتا
پھر رہا تھا۔ میں جلد از جلد تمام رقم ملک امتیاز صاحب کے حوالے کر دینا چاہتا تھا تاکہ
میرے ذہن سے خوف دور ہو جائے۔ اسی لئے میں یہ کام بلا تاخیر کر رہا تھا۔

دفتر پہنچا تو عروج اور گوہر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے میرے منتظر تھے۔ میں وہاں رکے
بغیر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرے دفتر پہنچنے سے پہلے ہی ملک امتیاز صاحب
اپنے باڈی گارڈز کے ہمراہ میرے دفتر میں آئے بیٹھے تھے۔ میں نے نوٹوں سے بھرے
دونوں بیگ اپنے پاس ہی میز کے نیچے زمین پر رکھ دیئے اور گوہر کو بلوا کر رجسٹری کے
کاغذات منگوا لئے۔ میں نے ایک نظر رجسٹری کے کاغذات پر ڈالی اور پھر ملک صاحب
کو پکڑا دیئے تاکہ دستخط کرنے سے پہلے وہ بھی اچھی طرح پڑھ لیں۔

ملک امتیاز صاحب رجسٹری کی تحریر پڑھنے لگے۔ میں نے عروج اور گوہر کو اپنے
پاس بلا لیا۔ میں نے جیسے تیسے نوٹ بیگوں میں ٹھونس رکھے تھے۔ میں انہیں ترتیب دینا
چاہتا تھا۔ جتنی دیر ملک صاحب کو رجسٹری کے کاغذات پڑھنے میں لگی، اتنی دیر میں ہم
تینوں نے مل کر نوٹ ترتیب سے رکھ لئے۔ میں نے ملک صاحب کو رجسٹری کے
کاغذات پڑھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے دیکھا تو بولا۔

"ملک صاحب! بسم اللہ کیجئے...... کاغذات آپ کے سامنے ہیں۔ دستخط کر دیجئے۔
دیکھ لیں، میں آپ سے کئے ہوئے وعدے سے پہلے ہی آپ کو رقم کی ادائیگی کر رہا
ہوں۔"

"یہ بات تو ہے چوہدری صاحب! آپ نے واقعی اس معاملے میں اپنی کہی ہوئی
بات سچ کر دکھائی۔" ملک صاحب نے بات کرتے ہوئے کاغذات اٹھا لئے اور دستخط
کرنے لگے۔ دستخط کرنے کے بعد انہوں نے انگوٹھے لگائے اور کاغذات میری طرف
بڑھاتے ہوئے بولے۔

"لیں جی چوہدری صاحب! آج سے کرسٹل پلازہ آپ کا ہوا۔ آپ کو بہت بہت

مبارک ہو۔"

"بڑی نوازش ہے ملک صاحب......" میں نے یہ کہتے ہوئے نوٹوں سے بھرا بر
کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ "ملک صاحب! یہ گن لیں...... آپ کی پ
پوری رقم آپ کے سامنے ہے۔"

"بس چوہدری صاحب! گننے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے گن کر ہی دیئے ہ
ناں۔ میں اسی طرح بیگ لے جاتا ہوں۔ کل صبح کسی وقت میرا آدمی آپ کا بیگ
واپس کر جائے گا۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں ملک صاحب...... رقم بھی آپ کی اور بیگ بھی آپ کا۔
یہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ بھلا آپ سے بیگ اچھا ہے؟"

باتوں کے دوران ملک صاحب نے نوٹوں کی گڈیاں گن کر تسلی کر لی تھی اور بیگ
بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی میں بھی اٹھ گیا۔ گوہر اور عروج
نے بھی اپنی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ ملک صاحب کے وہاں سے نکلتے ہی عروج اور گوہر
نے باری باری مجھے کرسٹل پلازہ خریدنے پر مبارکباد دی۔ گوہر اٹھ کر اپنی سیٹ پر چلا گیا
اور عروج ابھی میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ میں نے خوش ہو کر عروج کے ہاتھ پر پانچ
ہزار روپے رکھ دیئے۔

"سر! یہ کیا ہے......؟" عروج نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"بھئی نوٹ ہیں اور کیا......؟"

"وہ تو میں سمجھتی ہوں سر! لیکن یہ آپ مجھے کیوں دے رہے ہیں؟"

"یہ تمہارا انعام ہے...... میں نے کرسٹل پلازہ خریدا ہے ناں۔ اس لئے اپنی خوشی
سے تمہیں پانچ ہزار روپے دے رہا ہوں۔ تم ایسا کرو، انہیں رکھو اور گوہر کو میرے پاس
بھیجو۔"

"ٹھیک ہے سر......" عروج نے مٹھی میں نوٹ دباتے ہوئے کہا اور گوہر کو بلانے
کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد گوہر آ گیا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے مجھے بلایا؟"

"ہاں یار...... یہ لو، یہ ہے تمہارا انعام......" میں نے پانچ ہزار روپے گوہر کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔ اسے شاید عروج نے تمام بات بتا دی تھی اس لئے اس نے کوئی
سوال کئے بغیر رقم لی اور شکریہ ادا کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

رجسٹری کے کاغذات ابھی تک میز پر پڑے تھے۔ میں نے انہیں اٹھایا اور چوم لیا۔
یوں تو ہر انسان کی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ آتے ہیں جہاں کبھی وہ خوشی سے جھوم
اٹھتا ہے اور کبھی غم کی وجہ سے چیخ اٹھتا ہے۔ میری زندگی میں بھی اب تک بہت سے
موڑ آئے تھے لیکن شاید یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ گو کہ اب تک میں
نے ایک ایک کر کے بہت سی سیڑھیاں چڑھی تھیں لیکن آج میں بہت سی سیڑھیاں ایک
ساتھ پھلانگ کر بہت اوپر آ گیا تھا۔ وقت نے مجھ جیسے ٹھوکروں میں رہنے والے معمولی
سے انسان کو ایک ایسے پلازہ کا مالک بنا دیا تھا جو بڑے بڑوں کا خواب تھا۔ جس کی
تعبیر میرے حصے میں آئی تھی۔ میں نہ جانے کتنی ہی دیر رجسٹری کے کاغذات ہاتھوں
میں لئے سوچتا رہا۔ اچانک فون کی گھنٹی نے میرے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا۔ میں
نے فون اٹھایا تو ملک امتیاز صاحب کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"چوہدری صاحب...... میں ملک امتیاز بول رہا ہوں۔"

"ملک صاحب! خیر تو ہے......؟"

"نہیں نہیں چوہدری صاحب! ایسی فکر والی کوئی بات نہیں۔ دراصل اتنی بڑی رقم کے
ساتھ زیادہ دیر وہاں بیٹھنا مناسب نہیں تھا اس لئے میں آپ سے کوئی بھی بات کئے
بغیر چلا آیا۔"

"حکم کریں ملک صاحب!"

"چوہدری صاحب! پہلے تو آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ یقینی طور پر یہ تو آپ بھی
جانتے ہی ہیں کہ آپ نے کرسٹل پلازہ خرید کر کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ میں صرف
یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ میں نے پلازہ کے متعلق ہر طرح کے واجبات ادا کر دیئے ہوئے
ہیں۔ کسی بھی قسم کے کوئی واجبات باقی نہیں۔ دوسرے میں نے مکمل طور پر پلازہ خالی
کروا دیا تھا تاکہ کل کو آپ کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اب کرسٹل پلازہ
آپ کی پراپرٹی ہے۔ جو آپ کو صحیح لگے، وہ کریں اور خدا برکت ڈالے۔"

"آمین...... ملک صاحب! آپ کا بہت شکریہ۔ ویسے آپ اب بھی اپنے آپ کو

کرسٹل پلازہ کا مالک ہی سمجھیں۔ اگر کسی کو کوئی دُکان وغیرہ دینا چاہیں تو آپ کا
سر آنکھوں پر۔"

"چوہدری صاحب! یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ بہرحال بہت مہربانی آپ کی۔ اور ا
مجھے اجازت دیں، خدا حافظ۔"

فون بند ہوتے ہی میں نے رجسٹری کے کاغذات اٹھا کر بیگ میں رکھے اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر آیا تو عروج اور گوہر بھی اپنی اپنی چیز سمیٹ کر جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی اٹھ گئے اور میرے سا ساتھ دفتر سے باہر آ گئے۔

دفتر سے نکل کر گھر جانے کی بجائے میں نے سیدھا مارکیٹ کا رُخ کیا۔ بازار پھل اور مٹھائی وغیرہ خریدی اور گھر آ گیا۔ گھر پہنچا تو چاچی نے آ کر گیٹ کھولا۔ نے مٹھائی اور پھل اس کے حوالے کیا اور خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے طرف جاتے ہوئے میری نظر دوسرے کمرے میں پڑی جہاں چاروں دوست تاش کھ رہے تھے۔ میں خاموشی سے ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ جب ان کی نظر مجھ پر پڑی چاروں ہی اچھل پڑے۔ انہوں نے کئی دن بعد مجھے دیکھا تھا اور بہت خوش ہو تھے۔ چاچی مٹھائی اور پھل لئے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں نے ا آواز دی اور کہا کہ یہ چیزیں پلیٹوں میں ڈال کر یہیں لے آؤ۔

"یہ سب کیا ہے؟ اور اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے......؟" الیاس نے چا کے ہاتھ میں مٹھائی اور پھل دیکھے تو سوال کیا۔

"یہ کرسٹل پلازہ خریدنے کی خوشی میں ہے۔"

"کیا مطلب......؟" الیاس نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"یار! سیدھی سی بات ہے۔ میں نے کرسٹل پلازہ خرید لیا ہے......" پھر میں جان بوجھ کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "آج سے بلکہ ابھی سے چوہدری جمیل بقلم خود کرسٹل پلازہ کا تن تنہا مالک ہے۔"

"کیا...... واقعی......؟" چاروں نے بیک وقت حیران ہو کر سوال کیا۔

اتنے میں چاچی پھل اور مٹھائی پلیٹوں میں سجا کے لے آئی تھی۔ چاچا بھی اس

ہمراہ تھا۔ میں نے مٹھائی کی پلیٹ چاچی کے ہاتھ سے پکڑ لی اور ان چاروں کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ مٹھائی کھاؤ اور خوشیاں مناؤ۔"

ان چاروں کے دماغ اُلجھے ہوئے تھے۔ انہیں شاید میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا اور سوچ رہے تھے کہ آیا واقعی میں نے کرسٹل پلازہ خرید لیا ہے یا میں جان بوجھ کر ان سے مذاق کر رہا ہوں۔"

"چوہدری صاحب! آپ مذاق تو نہیں کر رہے......؟" الیاس نے دریافت کیا۔

الیاس کی بات سن کر مجھے عجیب سا لگا۔ "کمال ہے یار! تم لوگوں کو میری بات کا یقین ہی نہیں آ رہا۔" میں نے رجسٹری کے کاغذات نکال کر ان کے ہاتھ میں تھما دیئے اور بولا۔ "یقین نہیں آتا تو اپنی آنکھوں سے رجسٹری کے کاغذات دیکھ لو اور پھر بھی دل نہ مانے تو کرسٹل پلازہ کے سابق مالک ملک امتیاز صاحب سے فون کر کے پوچھ لو کہ آیا اب سے کچھ دیر پہلے میں نے کرسٹل پلازہ کی تمام رقم ادا کر کے ان سے پلازہ نہیں خریدا......؟"

میری بات سنی تو وہ ایک دوسرے سے چھین کر رجسٹری کے کاغذات پڑھنے لگے اور مجھے گلے لگا کر مبارکباد دینے لگے۔ پھر ہم سب دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب کافی وقت گزر گیا تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں کئی روز بعد گھر لوٹا تھا۔ تھکاوٹ بھی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ تمام کام میری منصوبہ بندی کے عین مطابق ہوئے تھے اور مجھے ہر طرح سے کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ ایسے میں نیند کہاں سے آتی؟ میں بار بار پہلو بدلتا اور سونے کے لئے آنکھیں بند کرتا مگر کرسٹل پلازہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ میں نے پچھلے دنوں میں جو کارنامے سرانجام دیئے تھے ان کی وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار بھی ہو سکتا تھا لیکن مجھے اس کا ڈر اس لئے بھی نہ تھا کہ میں نے تمام تر کام اپنا آپ چھپا کر کئے تھے اور میں کہیں بھی اپنے اصل نام اور روپ کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ میں نے ایسا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا جس کی بنا پر میں کسی کی گرفت میں آتا۔ گو کہ یہ پاگل پن تھا پھر بھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں

صبح کسی وقت ہوٹل کا چکر لگا کر آؤں گا تا کہ اس قصے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر سکوں۔

میں رات دیر سے سویا تھا مگر اس کے باوجود صبح آنکھ کھلی تو خود کو فریش محسوس کر رہا تھا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے دفتر جانے کی بجائے ہوٹل جانے کا پروگرام بنا لیا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے احتیاط سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا، پھر استقبالیہ کے سامنے سے گزرتا ہوا ہال کے ایک کونے میں ٹیبل پر اس طرح جا کر بیٹھ گیا کہ میں استقبالیہ پر آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکوں۔ میرے بیٹھتے ہی باوردی ویٹر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے چائے کا آرڈر دیا اور خود اخبار پڑھنے لگا۔ میں جان بوجھ کر اس وقت آیا تھا کیونکہ میں نے جن لوگوں کو ہوٹل میں ٹھہرایا تھا ان کی ادائیگی صرف ایک دن کی کی تھی اور ایک روز قبل دوپہر دو بجے ان کا چیک آؤٹ تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہوٹل انتظامیہ نے ایڈوانس رقم کے بغیر رات تو جیسے تیسے گزار لی ہو گی مگر صبح 9 بجے جب استقبالیہ کلرک کی ڈیوٹی تبدیل ہو گی تو وہ انہیں بلوا کر ضرور دریافت کریں گے کہ انہوں نے ابھی تک رقم ادا کیوں نہیں کی اور ایڈوانس رقم ادا کئے بغیر وہ ابھی تک کس طرح ٹھہرے ہوئے ہیں۔

اچانک میری نظر سیڑھیوں پر پڑی تو چار لڑکے سیڑھیاں اتر کر استقبالیہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ انہی دیہاتی لڑکوں میں سے تھے جنہیں میں نے یہاں ٹھہرایا تھا۔ غالباً انہیں استقبالیہ کلرک نے ہی بلوایا تھا۔ وہ کچھ دیر تک آپس میں الجھتے رہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ مجھ تک ان کی واضح آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن ان کی حرکات سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس معاملے پر آپس میں الجھ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ان لڑکوں کے چند اور ساتھی وہاں آ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی پھلکی بحث نے گرما گرم لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے ہوٹل انتظامیہ کو یہ کہہ کر انہیں ایک روز کے لئے ٹھہرایا تھا کہ وہ بہت دور سے بارات لے کر آئے ہیں چونکہ اسی روز ان کا واپس جانا ممکن نہیں اس لئے آرام کی غرض سے وہ ایک دن ہوٹل میں قیام کریں گے جس کے لئے میں نے انہیں ادائیگی بھی کر دی تھی۔

ہوٹل انتظامیہ کے لوگ اپنی جگہ درست تھے کہ انہیں صرف ایک دن کے لئے

واجبات ادا کئے گئے تھے اور اب انہیں مزید رکنے کے لئے ادائیگی کرنا تھی جبکہ گاؤں سے آئے ہوئے لڑکے اپنی جگہ صحیح تھے اور ان کا کہنا تھا کہ انہیں یہاں چوہدری سلیم نے ٹھہرایا ہے۔ وہ انہیں بیرون ملک لے جانے کے لئے یہاں لایا ہے اور کسی بھی صورت میں ہوٹل کے کمرے خالی کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

بات بڑھتے بڑھتے گالی گلوچ تک پہنچ گئی۔ قریب تھا کہ فریقین ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیتے، میں فوری طور پر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے پیچھے سے ہوتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ میں نے قریب ہی ایک پی سی او دیکھا اور اس میں گھس گیا۔ میں نے جلدی سے ہوٹل کا نمبر ملایا اور آپریٹر کے فون اٹھاتے ہی بلاتمہید اس سے کہا کہ وہ کمرہ نمبر 303 میں ٹھہرے ہوئے مکھن کو کہہ دیں کہ انہیں استقبالیہ میں کوئی ملنے آیا ہے۔ اپنی بات مکمل ہوتے ہی میں نے آپریٹر کا جواب سنے بغیر فوراً فون بند کر دیا۔ مجھے مکھن کے استقبالیہ تک پہنچنے سے پہلے واپس ہوٹل میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھنا تھا۔ اس لئے وقت ضائع کئے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جلدی سے اسی ٹیبل پر آ بیٹھا اور ایک بار پھر نظریں استقبالیہ کے کاؤنٹر پر لگا دیں۔

گرما گرم بحث کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے کئی اور لوگ بھی تماشہ دیکھنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں میری نظر مکھن پر پڑی جو اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا استقبالیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنے منہ کے سامنے اخبار اس طرح سے کر لیا کہ میں انہیں با آسانی دیکھ سکوں مگر ان لوگوں کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ یوں تو مجھے اس بات کا قطعی خوف نہیں تھا کہ وہ لوگ مجھے پہچان لیں گے کیونکہ میں انہیں ہمیشہ ایک الگ گیٹ اپ میں ملا تھا۔ پھر بھی احتیاط بہت ضروری تھی۔

ان لوگوں کی آوازیں مجھ تک واضح طور پر نہیں پہنچ رہی تھیں جبکہ میں ان کی مکمل بات چیت سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اس لئے میں اپنی جگہ سے اٹھ کر انتہائی احتیاط کے ساتھ ایک مناسب جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا جہاں ان میں ہونے والی بات چیت مجھے با آسانی سنائی دے رہی تھی۔ مکھن کے گاؤں کے لوگ بدستور کاؤنٹر کلرک سے الجھ رہے تھے۔ انہوں نے مکھن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جبکہ مکھن ایک ساتھ اپنے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔

"تم سب لوگ یہاں......؟"

"مکھن......تم......اور یہاں......؟" بہت سی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

"مجھے تو یہاں چوہدری سلیم نے ٹھہرایا ہے مگر تم سب لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟" مکھن نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"تم یہاں ٹھہرے ہو......مگر تمہیں تو دُبئی ہونا چاہئے تھا۔" کسی نے دریافت کیا۔

"بس ایک دو روز میں جانے ہی والا ہوں۔ کیونکہ چوہدری سلیم کہہ رہا تھا کہ تمام انتظامات مکمل ہیں۔"

مکھن نے تفصیل بیان کی تو اس کی بات سنتے ہی اچانک خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک آواز آئی۔ "لیکن مکھن! وہ جو تم نے وہاں پہنچ کر خط لکھا تھا اور گھر ڈرافٹ بھی بھجوایا تھا...... وہ سب کیا تھا......؟"

"میں نے......؟" مکھن نے حیران ہو کر سوال کیا پھر خود ہی بولا۔ "میں نے تو ابھی کوئی خط نہیں لکھا اور نہ ہی کوئی رقم بھجوائی ہے۔ میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔ ابھی دُبئی گیا ہی نہیں۔ بھلا اپنے دُبئی پہنچنے کا خط کیسے ارسال کرتا......؟"

ہوٹل انتظامیہ کے لوگ بغور ان کی باتیں سن رہے تھے۔ گاؤں کے سبھی لوگ جھگڑا بھول کر ایک نئی اُلجھن میں پھنس گئے تھے۔ پھر ایک آواز ابھری۔ "اس کا مطلب ہے چوہدری سلیم نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا......"

فراڈ کا لفظ سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ہر کسی کو اپنے لٹنے کا علم ہو چکا تھا۔ سب کے چہرے لٹک گئے تھے۔ وہ بے بسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اچانک دو دیہاتی لڑکے مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے اور میں خوف سے کانپنے لگا۔ اخبار اب بھی میرے چہرے کے سامنے تھا لیکن نہ جانے کب ان کی نظر مجھ پر پڑی تھی اور کب انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے بھاگنا بھی ناممکن تھا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ میرے پاس آنے کی بجائے میرے ساتھ والی میز پر نڈھال ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے دل ہی دل میں جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور خود کو سنبھالا۔ کچھ دیر کے لئے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے لوگوں سے میری توجہ ہٹ گئی تھی

مگر ایک بار پھر میری تمام تر توجہ اس طرف لگ گئی۔ ان سب کو اپنے لٹنے کا علم ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ دل کی تسلی کے لئے جو منہ میں آیا، گالیوں کی شکل میں برا بھلا کہے جا رہے تھے۔ وہاں سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔

"وہ چوہدری سلیم کا بچہ کہیں مجھے مل جائے ناں تو میں اسے گولی سے اڑا دوں۔"

"اس کمینے شخص کے لئے گولی بھی ضائع کیوں کریں۔ ایسے گھٹیا شخص کے اوپر تو رہی ڈال کر کتوں کے سامنے ڈال دینا چاہئے تاکہ پھر اس کا نشان تک نہ ملے۔"

"میرا بس چلے تو میں اس کتے کے بچے کو زہر دے کر ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔"

"مجھے تو شروع ہی سے اس گھٹیا آدمی کا چہرہ مکروہ دکھائی دیتا تھا۔"

"ایسے شخص کو تو ایسی عبرت ناک سزا ملنی چاہئے کہ پھر کوئی ایسا کرنے کا سوچ بھی نہ سکے۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ اگر وہ مجھے مل جائے تو میں اسے گاؤں لے جا کر ٹریکٹر کے پیچھے باندھ کر پورے گاؤں میں گھسیٹتا پھروں......"

"لیکن میرے دل کو تب تسلی ہو گی جب میں اس کا منہ کالا کرنے کے بعد گلے میں جوتوں کا ہار ڈال کر اسے گدھے پر بٹھاؤں اور گاؤں بھر کے بچے اسے روڑے اور پتھر ماریں تاکہ وہ گدھے پر بیٹھا ہوا اللہ کے پاس جا پہنچے۔"

اسی طرح کی کئی اور آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اچانک ایک بوڑھے شخص نے آگے بڑھ کر ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کروایا اور بولا۔

"دیکھو بیٹا...... اس طرح یہاں کھڑے کھڑے گالیاں دینے اور اسے برا بھلا کہنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم سب لوگ خاموشی سے اپنے گاؤں واپس جاؤ اور سکون سے سب مل بیٹھ کر اس شخص کے متعلق سوچو۔"

وہاں پر کھڑے ایک دو اور لوگوں نے بھی فوری طور پر بوڑھے شخص کی تائید میں بیان دے ڈالا۔ بعد میں کچھ دیر وہ لوگ مزید مشورے کرتے رہے۔ پھر فیصلہ ہوا کہ وہ اپنا اپنا سامان سنبھالیں اور گاؤں واپس چل پڑیں۔ ایک ایک کر کے وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ جو دوسرے لوگ وہاں کھڑے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور پھرتی کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔

میری گاڑی کا رُخ دفتر کی طرف تھا۔ میں اپنی کامیابی پر مسکراتا ہوا دفتر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کرسٹل پلازہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہی وہ پلازہ ہے جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے اتنا کچھ کیا۔ میں نے پلازہ کے سامنے گاڑی روک دی۔ گاڑی بند کر کے باہر نکلا تو کرسٹل پلازہ پوری آب و تاب کے ساتھ میرے سامنے تھا جس کا میں بلاشرکت غیر مالک تھا۔

دفتر پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرے آنے سے پہلے بہت سے لوگوں کے فون آ چکے تھے۔ جس کسی کو کرسٹل پلازہ خریدنے کی خبر ملتی وہ مبارکباد کا فون کرتا۔ وہ دن مبارکباد کے فون سنتے ہوئے گزر گیا۔

♦ ...... ♦
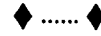
تھوڑے ہی دنوں میں علاقے کے سبھی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ کرسٹل پلازہ اب میری ملکیت ہے۔ میں نے محض کاروباری نقطہ نظر سے کرسٹل پلازہ خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ کرسٹل پلازہ خریدنے کی وجہ سے میں لوگوں میں اس قدر مقبول ہو جاؤں گا کہ بہت سے ایسے لوگ جن کے بارے میں صرف لوگوں کی زبانی سنا تھا، وہ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیں گے۔ ہو سکتا ہے ایسا کرنے میں ان لوگوں کا اپنا کوئی مفاد شامل رہا ہو۔ لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی کیونکہ میں نے کاروبار اور دوستی کو کبھی ایک نہیں ہونے دیا تھا۔ ہمیشہ دوستی اور کاروبار میں فاصلہ رکھا تھا۔

گو کہ کچھ عرصہ قبل بھی بہت سے لوگوں کا میرے دفتر میں آنا جانا تھا لیکن اب دن بھر آنے جانے والوں کی آمد و رفت لگی رہتی۔ علاقے کا تھانیدار اور سپاہی بھی آئے دن کسی نہ کسی بہانے کچھ دیر کے لئے میرے پاس آ بیٹھتے اور چائے پانی کے علاوہ بھی کسی نہ کسی شکل میں مجھ سے کچھ نہ کچھ لے جاتے۔ کہیں جھگڑا یا لڑائی ہو جاتی فریقین تھانے جانے کی بجائے میرے پاس چلے آتے اور اگر کوئی تھانے جا پہنچتا میں تھانیدار کو کہہ کر ان کی آپس میں صلح صفائی کروا دیتا۔

اس کے علاوہ ایک اور تبدیلی یہ آئی کہ علاقے کے پرائیویٹ سکولوں والے، سکول میں ہونے والے مختلف فنکشنز میں بطور مہمانِ خصوصی مجھے مدعو کرنے لگے۔ مجھے مہمان خصوصی کے طور پر بلانے سے ان کا مقصد شاید مجھ سے مالی امداد حاصل کرنا ہوتا ہے

اسی لئے میں کبھی کتابوں اور کاپیوں کی شکل میں اور کبھی نقدی کی صورت میں انہیں دے آتا۔ میں جب بھی کبھی کسی سکول میں جاتا، وہ میری تعریفوں کے پُل باندھ دیتے اور ہر جگہ مجھے تعلیم یافتہ کہہ کر متعارف کرواتے جبکہ میرے پاس کوئی بھی ڈگری نہ تھی۔ میں اندر ہی اندر شرمندگی محسوس کرتا اور دل سے آواز نکلتی کہ کاش میرے پاس کوئی ڈگری ہوتی۔ کاش میں واقعی پڑھا لکھا ہوتا۔

رات کا وقت تھا۔ میں نے جبار کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور بلاتمہید اسے بتا دیا کہ میں کسی طرح بی اے کی ڈگری حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرے پاس سبھی کچھ ہے۔ مگر جب بھی تعلیم کی بات چلتی ہے تو میری گردن جھک جاتی ہے۔ میری بات سن کر جبار کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا لیکن ساتھ ہی مجھے اس بات کی پوری امید تھی کہ جبار کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گا۔ اسے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو میں نے کہا۔

”جبار! کچھ تو جواب دو۔ تم تو بالکل خاموش ہو گئے ہو۔“

”میں جانتا ہوں تم نے مجھ سے یہ بات اسی لئے کی ہے کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ لیکن فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ جبکہ میں چاہتا ہوں کہ جس اعتماد کے ساتھ تم نے مجھ سے سوال کیا ہے، میں اس اعتماد کا بھرم رکھ سکوں۔“

”ایسی جلدی کی کوئی بات نہیں...... تم اچھی طرح اِدھر اُدھر سے معلومات حاصل کر لو۔ پھر جو مناسب راستہ دکھائی دے، مجھے بتا دینا۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر ایک دو روز میں کچھ نہ کچھ خبر لاتا ہوں۔ دراصل وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر سختی ہوتی جا رہی ہے کہ دو نمبر کا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن اپنے یار کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ فی الحال تم آرام کرو۔ کوئی بات ہو تو مجھے بتا دینا۔“

”اچھا میں چلتا ہوں۔ امید ہے جلد کوئی اچھی خبر دوں گا......“ بات کرتے ہی جبار اٹھا اور وہاں سے نکل گیا۔

میں جانتا تھا کہ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں اور یہ بات بھی بخوبی میرے علم میں تھی کہ مجھے ڈگری لے لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود میری خواہش

تھی کہ کسی طرح ڈگری میرے ہاتھ میں آ جائے۔ یہ میری کمی تھی یا کمزوری، یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور تھا کہ ڈگری کے ہونے سے مجھ میں مزید خود اعتمادی آ جائے گی اور میں کہیں بھی بیٹھ کر کہہ سکوں گا کہ میں کوئی ان پڑھ نہیں، یونیورسٹی کا گریجوایٹ ہوں۔

کچھ دن کی دوڑ دھوپ سے جبار نے کمال کر دکھایا۔ اس نے ایک ایسا شخص ڈھونڈ نکالا جو نہ صرف میرا ہم نام تھا بلکہ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ اس کے والد کا نام بھی وہی تھا جو میرے والد کا تھا۔ جبار نے کچھ رقم کے عوض میری جگہ امتحان دینے پر اسے راضی کر لیا تھا جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر خود اپنے ہاتھوں سے پرچہ حل کروں۔ اس کا واحد طریقہ یہی تھا کہ کوئی دوسرا مجھے پرچے حل کروائے۔ تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے اور میں خاموشی سے کمرۂ امتحان میں جا بیٹھا۔ میرے اور میرے ہم نام کے رول نمبروں میں تھوڑا سا فرق تھا مگر کمرۂ امتحان میں میری اور اس کی سیٹیں کچھ اس طرح ہوتیں کہ وہ میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوتا۔ وہ کبھی سوال حل کر کے پیپر مجھے پکڑا دیتا اور کبھی اپنی میز پر کچھ اس طرح رکھتا کہ میں با آسانی کاپی کر لیتا۔ گو کہ کچھ دُشواریاں بھی پیش آئیں لیکن جیسے تیسے امتحان دے ڈالا اور پُر امید تھا کہ ڈگری لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

میں جانتا تھا کہ میں نے میٹرک اور پھر انٹر کی اسناد بھی کچھ دے دلا کر ہی حاصل کی تھیں اس لئے دل میں خوف رہتا کہ کسی وقت کوئی مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ اسی لئے میں نے اپنے اثر و رسوخ سے کچھ اس طرح کے انتظامات کر ڈالے تھے کہ اگر کسی مرحلے پر کوئی انکوائری ہو بھی جاتی تو کسی کو کچھ ہاتھ نہ آتا۔ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے بھی امتحان میں خود بیٹھنے کا مقصد یہی تھا کہ کل کو کوئی پریشانی نہ ہو۔

رزلٹ نکلا تو میری توقعات کے مطابق کامیابی میرے حصے میں آئی تھی۔ میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا لیکن جان بوجھ کر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی کیونکہ لوگوں کی نظر میں تو میں پہلے سے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اب انہیں اپنے بی اے میں پاس ہونے کا بتا کر خود اپنی رُسوائی کا سامان کیوں پیدا کرتا۔

وقت انسان کو زندگی میں کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے۔ کئی ایسے رنگ جو انتہائی بد صورت اور بھدے ہوتے ہیں اور کئی ایسے خوبصورت کہ دل خوش ہو اٹھتا ہے۔ وقت

کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات اور خواہشات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ ہر خواہش کے پورا ہونے کے بعد ایک نئی خواہش جنم لے لیتی ہے اور یونہی انسان زندگی کے سبھی ذائقوں کا مزا چکھتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ کچھ لوگ وقت سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کچھ وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو وقت سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ وہ لوگ جو مفلسی اور تنگ دستی میں آپ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، وہی لوگ دولت کے آ جانے پر اسی شخص کے پاس سے اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔

بہت سے لوگ اپنے چھوٹے موٹے مسائل لے کر میرے پاس آ جاتے جنہیں میں اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق حل کر دیتا۔ کئی لوگ اپنے گھروں کے جھگڑے اور معاملات لے کر بھی میرے پاس چلے آتے اور مجھ سے جو بن پاتا میں ضرور کرتا۔ لیکن مجھ میں یہ خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ میں کسی قسم کے الیکشن میں حصہ لوں۔ بلدیاتی انتخابات میں بھی کئی دوستوں اور جان پہچان والوں نے مجھے الیکشن میں حصہ لینے کو کہا لیکن میں نہ مانا۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان ہوا تو سبھی چھوٹی بڑی پارٹیوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان کی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑوں۔ مگر میں نے ہر آنے والے کو صاف جواب دے دیا۔ لیکن ان لوگوں کو بھی نہ جانے مجھ میں کیا بات نظر آ گئی تھی کہ وہ اپنی پارٹی کا ٹکٹ مجھے دینے کے لئے بضد تھے۔ ہر پارٹی مجھ پر زور دے رہی تھی کہ میں صرف اور صرف ان کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کروں۔ جبکہ مجھے ایسی کوئی خواہش نہ تھی۔ پھر ایک روز میرے ذہن میں اس خیال نے انگڑائی لی کہ جہاں زندگی کے بہت سے کڑوے کسیلے اور شیریں ذائقے چکھے ہیں، وہاں یہ ذائقہ بھی چکھ کر دیکھ لینا چاہئے۔ لیکن میں کسی بھی پارٹی کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا تھا اس لئے آزاد امیدوار کے طور پر صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔

میرے واضح اعلان کے باوجود سیاسی پارٹیاں میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ہر روز کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کے عہدیداران میرے پاس آ بیٹھتے اور مجھے اپنی پارٹی کی طرف

سے الیکشن لڑنے پر زور دیتے۔ مگر جب کسی پارٹی کی دال نہ گلی تو ایک ایک کر کے بھی پارٹیاں خاموش ہو گئیں۔

کاغذات نامزدگی جمع ہوئے تو بہت سی پارٹیوں نے جان بوجھ کر میرے مقابلے میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا۔ انہیں شاید میرے مقابلے میں کوئی بہتر امیدوار نہیں ملا تھا یا انہوں نے جان بوجھ کر ایسی پالیسی اختیار کی تھی۔ کاغذاتِ نامزدگی داخل ہوتے ہی میرے دفتر نے انتخابی دفتر کی شکل اختیار کر لی اور ہر وقت گہما گہمی رہنے لگی۔ عروج نے آنے جانے والوں کو چائے پانی پلانے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ میں جس حلقے سے الیکشن لڑ رہا تھا، وہ کافی بڑا تھا اس لئے آئے روز کسی نہ کسی جگہ میرا نیا انتخابی دفتر کھل جاتا۔ کاغذات جمع کروانے سے قبل میں اس فیلڈ میں بالکل اناڑی تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ داؤ پیچ سیکھتا گیا۔ یہ لوگ ہی تھے جو مجھے نئی نئی باتوں سے آگاہ کرتے اور میں ایسی حکمت عملی اپنانے کی کوشش کرتا جس کے انتخابات پر اچھے اثرات مرتب ہوں۔

میں اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ سیاست کے میدان میں کامیابی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے کارنر میٹنگز، جلسے جلوس اور ڈور ٹو ڈور جانے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر ووٹر کسی کے حق میں ووٹ دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں کامیابی کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بھی انتخاب میں پہلی بار حصہ لینے کے باوجود میری پوزیشن کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے جیسے انتخابات قریب آتے جا رہے تھے، میری مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں اور راتوں کی نیند، دن کا سکون سب کچھ بھولا ہوا تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں اور میرے کچھ سپورٹرز جلسہ کر کے واپس دفتر لوٹے تھے۔ ہم سبھی تھکے ہوئے تھے مگر جلسے کی کامیابی پر خوش ہو رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اگلے جلسے کے لئے پروگرام بھی ترتیب دے رہے تھے۔ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ گلے میں دوپٹہ ڈالے اندر داخل ہوئی۔ تین چار جوان بھی ہاتھوں میں جدید اسلحہ لئے اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ کھڑے ہوئے۔ سبھی لوگ سہم کر بیٹھ گئے لیکن میں نے فوری طور پر

اس خاتون کو پہچان لیا اور اپنی سیٹ چھوڑ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ دوسرے لوگوں کے لئے تو شاید وہ خاتون اجنبی تھی مگر وہ میری سابق مالکہ بیگم جان تھی۔ بیگم جان کو اچانک اس حال میں دیکھ کر میں بولنے ہی والا تھا کہ بیگم جان بول پڑیں۔

"میرے ہی ٹکڑوں پر پلنے والا کتا آج میرے ہی سامنے آ کھڑا ہوا ہے...... آخر تم نے ثابت کر ہی دیا کہ گھٹیا آدمی کی سوچ بھی گھٹیا ہوتی ہے۔"

"بیگم جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ پلیز آپ آئیں تو سہی اور مجھے آرام سے بیٹھ کر بتائیں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟"

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی...... صرف تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ مجھ سے ٹکراؤ گے تو ٹوٹ جاؤ گے۔"

بیگم جان مسلسل شیر کی طرح دھاڑ رہی تھیں اور میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ ایک بار پھر بیگم جان سے دریافت کروں۔

"بیگم جان! آپ یقین جانیں، میں ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پایا۔"

"زیادہ انجان بننے کی کوشش نہ کرو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تم صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں میرے مد مقابل ہو......؟"

"لیکن بیگم جان! وہ تو کوئی یاسمین شیخ ہے جو میرے مقابلے میں کھڑی ہے۔ آپ تو بیگم جان ہیں۔"

"میں ہی ہوں وہ یاسمین شیخ۔ کیونکہ میرا اصل نام یہی ہے۔ جبکہ شیخ جی مجھے بیگم جان کہا کرتے تھے۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ کوئی یاسمین شیخ نامی خاتون میرے مقابلے میں ہے لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ بیگم جان ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بھلا کیونکر ان کے مقابلے میں الیکشن لڑتا۔

"بیگم جان...... میں اپنی کم علمی پر شرمندہ ہوں۔ یقین کریں اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ آپ ہی یاسمین شیخ ہیں تو میں بھول کر بھی الیکشن میں حصہ نہ لیتا...... خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ اطمینان سے الیکشن لڑیں۔ میں اپنے کاغذات واپس لے لوں گا۔"

بیگم جان نے میری بات کا جواب دیئے بغیر ہی دروازے کو جوتے کی نوک سے

ٹھوکر ماری اور وہاں سے نکل گئیں۔ ان کے باڈی گارڈز بھی ان کے پیچھے پیچھے نکل گئے۔ میں آوازیں دیتا رہ گیا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ میں نے خود کو کرسی پر گرا دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ ہر کسی کے دل میں بہت سے سوالات ابھر رہے تھے لیکن کسی کو بھی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کئے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔

”لیکن چوہدری صاحب...... وہ جلسہ......؟“

”میں نے کہہ دیا ناں، مجھے نہ الیکشن لڑنا ہے اور نہ ہی کسی جلسے میں جانا ہے۔ تم لوگ کیوں میرا دماغ خراب کر رہے ہو۔ جاؤ، اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔“

میں اس قدر زور سے چیخا تھا کہ سب لوگ سہم گئے۔ وہ کچھ دیر آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے اشارے کرتے رہے، پھر ایک ایک کر کے سبھی چلے گئے۔ گوہر ابھی تک اپنی جگہ موجود تھا۔ میں کچھ دیر تک دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لئے آنکھیں بند کئے سوچتا رہا لیکن میرا دماغ کچھ کام نہیں کر رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ دفتر بند کر دیا جائے اور اس معاملے پر سکون سے غور کیا جائے۔ میں نے گوہر کو ہدایت دی کہ وہ جاتا ہوا جلسے کے منتظمین کو میری طبیعت خراب ہونے کی اطلاع کرتا جائے تاکہ وہ میرے انتظار میں بیٹھے نہ رہ جائیں۔

دفتر سے گھر پہنچا تو رات کا ایک بجنے والا تھا۔ سبھی لوگ اپنے اپنے کمروں میں پڑے گہری نیند سو رہے تھے۔ میں بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی بیگم جان کے الفاظ کسی دو دھاری تلوار کی طرح میرے دل و دماغ کو زخمی کرنے لگے۔ میں سوچنے لگا کہ بیگم جان کو اتنے سارے لوگوں کے سامنے مجھے ذلیل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ خود چل کر نہ بھی آتیں، صرف کسی کے ہاتھ پیغام بھجوا دیتیں تو میں بھلا ان کے مقابلے میں کیسے کھڑا رہتا۔ میں نے ان کا نمک کھایا تھا اور میں نمک حرام نہیں تھا۔

رات نہ جانے کیسے کٹی۔ صبح ہوتے ہی میرے سپورٹر دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ جہاں کسی کا پیغام ملتا، میں یہی جواب دیتا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ وہ دفتر میں جا کر

بیٹھیں، میں کچھ دیر بعد وہیں آ کر ملوں گا۔ جب آنے والوں نے کسی طرح جان ہی نہ چھوڑی تو میں نے چاچی کو بلا کر کہہ دیا کہ اب جو بھی آئے اسے کہہ دیں کہ میں گھر پر نہیں اور کسی ضروری کام کے سلسلے میں باہر نکل گیا ہوں۔ دن بھر مجھ تک کسی کا کوئی پیغام نہ پہنچا۔ چاچی خود ہی بہانہ بنا کر ہر آنے والے کو ٹالتی رہی۔ شام ہو چکی تھی اور میں ابھی تک اپنے کمرے میں موجود تھا۔ الیاس کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس نے کوئی بات کئے بغیر اخبار کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

”چوہدری...... تم نے یہ اخبار پڑھا ہے......؟“

”کیوں...... اس میں ایسی کون سی خبر چھپ گئی......؟“ میں نے اخبار ہاتھوں میں لیتے ہوئے دریافت کیا۔

”اخبار تمہارے سامنے ہے...... اپنی آنکھوں سے دیکھ لو......“ الیاس نے اُداس لہجے میں بات کی۔ پھر خود ہی بولا۔ ”چوہدری! اس میں لکھا ہے کہ ایک ان پڑھ شخص نے ڈگریاں کہاں سے حاصل کر لیں......؟“

الیاس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا لیکن میں نے فوراً خود پر قابو پا لیا اور الیاس کو تسلی دی۔ ”ایسی باتوں سے تم لوگ کیوں پریشان ہوتے ہو؟ اخبار والے لکھتے ہیں تو لکھنے دو۔ مجھے وضاحتیں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”لیکن اس طرح تو تم بدنام ہو جاؤ گے۔“

”میں نے کہا ناں، جو بھی ہو مجھے ان باتوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔“

میں بات کر رہا تھا کہ غفور اور تنویر کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی اخبار تھے۔ ”لگتا ہے تم لوگ بھی ایسی ہی کوئی خبر لائے ہو جیسی الیاس لے کر آیا ہے۔“ میں نے جل کر بات کی۔

الیاس پہلے سے میرے کمرے میں موجود تھا اور میری حالت دیکھ رہا تھا جبکہ غفور اور تنویر ابھی ابھی آئے تھے اور میری اچانک بات سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ تنویر خاموش رہا جبکہ غفور اخبار میرے سامنے کرتے ہوئے بول پڑا۔ ”دیکھو تو سہی چوہدری! اخبار والے کیسی کیسی خبریں چھاپ رہے ہیں...... لکھا ہے کل کا معمولی گھریلو ملازم کرسٹل پلازہ کا مالک کیسے بن گیا......؟“

"کسی کے باپ کا مال نہیں چرایا میں نے...... دن رات محنت کی ہے۔ اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے...... زمینیں جائیدادیں یونہی نہیں بن جایا کرتیں۔"

میں نے انتہائی تلخ لہجے میں چیخ چیخ کر بات کی تو وہ تینوں خاموش ہو گئے اور پھر کچھ دیر بعد خود ہی اٹھ کر چلے گئے۔

میں نے اخبارات میں چھپنے والی باتوں کے متعلق پہلے سے سب کچھ سوچ رکھا تھا لیکن اب جبکہ میں نے ذہنی طور پر الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا، مجھے کسی قسم کی وضاحتوں کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اس بات کی بھی پرواہ نہ تھی کہ اس طرح کی خبریں کون چھپوا رہا ہے۔ اس لئے خاموشی اختیار کئے رکھی اور دل میں یہ پروگرام بنا لیا کہ کل کسی وقت تمام اخبارات کو پریس ریلیز بھجوا دوں گا جس میں اپنے الیکشن سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دوں گا۔

پچھلی رات سے جاگ رہا تھا اس لئے رات کو کھانا کھاتے ہی نیند آ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر دفتر روانہ ہو گیا۔ دفتر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ عروج اپنی سیٹ پر بیٹھی رو رہی تھی اور گوہر اس کے پاس کھڑا تسلی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو وہ اور بھی زور زور سے رونے لگی۔ اسے روتے ہوئے دیکھ کر میرے ذہن میں بہت سے خیالات ابھرے اس کے رونے سے مجھے خطرے کی بو آ رہی تھی۔ میں فوری طور پر عروج کے پاس آ گیا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو روتے ہوئے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے تسلی دی اور پوچھا۔

"کیا ہوا عروج...... تم رو کیوں رہی ہو...... کسی نے کچھ کہا ہے کیا......؟"

میری بات کا جواب دینے کی بجائے وہ اور بھی زیادہ رونے لگی۔ اتنے میں گوہر نے میری طرف اخبار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھیں چوہدری صاحب! آپ کے ساتھ عروج کی تصویر چھپی ہے۔ یہ اسی تصویر کو دیکھ کر رو رہی ہے۔"

میں نے جلدی سے گوہر کے ہاتھوں سے اخبار لی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تصویر میں عروج کھلے بالوں کے ساتھ میرے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ تصویر دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے پچھلے روز کے اخبارات

میں چھپنے والی خبروں کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا مگر اب خاموش رہنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں جان چکا تھا کہ محض مجھے بدنام کرنے کے لئے بیگم جان اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھیں لیکن ایک شریف لڑکی کو میرے ساتھ نتھی کرنا کہاں کی شرافت تھی۔

میں نے کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر عروج کو بمشکل چپ کرایا۔ اس کا رونا بند ہوا تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے بیگم جان کے دفتر میں آنے کے بعد ذہنی طور پر خود کو اس بات کے لئے تیار کر لیا تھا کہ میں الیکشن سے دستبردار ہو جاؤں گا اور کسی بھی وقت اپنے کاغذاتِ نامزدگی واپس لے لوں گا۔ لیکن عروج کے ساتھ اخبارات میں اپنی تصویر چھپنے کے بعد میں اس بات پر غور کرنے لگا کہ اب مجھے کیا حکمت عملی اپنانی چاہئے۔ میں اس پہلو پر بھی غور کرنے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ میری ذاتی سوچ ہو کہ بیگم جان ہی یہ سب کروا رہی ہیں۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کوئی دوسری پارٹی مجھے بدنام کرنے کے لئے ایسے اقدامات کر رہی ہو۔ اس لئے مجھے اپنا ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ آیا اخبارات میں چھپنے والی تصویر کوئی کیمرہ ٹرک تھا یا کچھ اور۔ لیکن عروج کی تصویر اخبار والوں تک کہاں سے اور کس ذریعے سے پہنچی۔ میں دیر تک دفتر میں بیٹھا سوچتا رہا۔ آخر کار فیصلہ کیا کہ جو بھی ہو، بیگم جان کے پاس جانا چاہئے۔ بیگم جان سے مل کر تمام بات کھل کر سامنے آ جائے گی اور اسی بہانے شیخ جی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اگر واقعی بیگم جان کا ان حرکات کے پیچھے ہاتھ نہ ہوا تو میں ان کی خاطر سیاست سے کنارہ کشی کر لوں گا۔ یوں بھی میں کون سا اتنا بڑا سیاست دان تھا کہ میرے کسی کے حق میں بیٹھنے سے مجھ پر کوئی حرف آ جانا تھا۔

میں نے اپنے کارندوں کے ذریعے بیگم جان کی دن بھر کی مصروفیات کا شیڈول معلوم کر لیا تھا۔ رات گیارہ بجے تک ان کا انتہائی مصروف وقت گزرنا تھا۔ جبکہ اس کے بعد انہیں گھر پر ہی موجود ہونا تھا۔ میں نے الیاس اور تنویر کو ساتھ لیا اور رات کے ٹھیک گیارہ بجے بیگم جان سے ملنے شیخ جی کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے کوٹھی کے باہر ہی گاڑی کھڑی کر دی۔ کوٹھی کا گیٹ کھلا تھا۔ کئی نئے ماڈل کی کاریں پہلے سے وہاں کھڑی تھیں

جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم سے پہلے کچھ لوگ بیگم جان سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ گھر میرا دیکھا بھالا تھا اس لئے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم تینوں آگے بڑھے تو لاڈلی ڈرائنگ روم سے نکل رہی تھی۔ لاڈلی کی نظر مجھ پر پڑی تو رک گئی۔ اس نے مجھے کئی سال بعد دیکھا تھا اس لئے فوری طور پر پہچان نہ سکی۔ پھر جیسے اسے سب کچھ یاد آ گیا اور بولی۔

''جمیل بابو! تم...... اتنے عرصے کے بعد یہاں اور اس وقت...... خیر تو ہے؟''

میں لاڈلی کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ کافی کمزور اور بوڑھی دکھائی دے رہی تھی۔ ماہ و سال نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''لاڈلی! میں تم لوگوں سے ہی ملنے آیا ہوں۔'' میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

لاڈلی نے ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔ ''جمیل بابو! اس دنیا میں غریبوں سے ملنے کون آتا ہے......؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں لاڈلی...... میں تم سے...... افضل خان سے اور اپنے شیخ جی سے ملنے آیا ہوں۔''

میری بات سن کر لاڈلی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''جمیل بابو...... اب شیخ جی اس دنیا میں کہاں...... وہ تو کئی سال ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

لاڈلی کی بات سن کر مجھے زوردار جھٹکا لگا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے تصدیق کے لئے پوچھا۔ ''لاڈلی! کیا تم صحیح کہہ رہی ہو......؟''

''ہاں جمیل بابو...... شیخ جی اب ہم میں نہیں...... ان کے جانے سے گھر کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ وہی بیگم جان جو شیخ جی کے ہوتے ہوئے گھر سے کبھی باہر نہیں نکلتی تھیں اب نہ جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے بازاری قسم کے مردوں کو ساتھ لگا رکھا ہے۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہتی ہوں کیونکہ میں اپنی اوقات جانتی ہوں۔ میں ٹھہری ایک معمولی ملازمہ۔ بھلا میری اتنی جرأت کہاں کہ میں کسی معاملے میں روک ٹوک کروں۔''

''اچھا یہ بتاؤ، بیگم جان اس وقت گھر پر موجود ہیں؟''

''ہاں ہاں، اندر بیٹھی ہوئی ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی آئے بیٹھے ہیں۔ تم لوگ اندر چلو، میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

ابھی لاڈلی بات کر رہی تھی کہ بیگم جان نے کرخت لہجے میں آواز دی۔ ''لاڈلی...... وہاں کھڑی کس سے باتیں کر رہی ہو؟ جلدی سے آؤ اور برتن اٹھا کر لے جاؤ۔''

''آئی بیگم جان......'' لاڈلی نے فوراً آواز لگائی اور ڈرائنگ روم میں گھس گئی۔ ہم تینوں بھی لاڈلی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے جہاں بیگم جان بہت سے چاہنے والوں میں گھری بیٹھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ بیگم جان، لاڈلی پر برستیں، ان کی نظر ہم پر پڑ گئی۔

''اچھا تو یہ تم ہو......'' بیگم جان نے آنکھیں پھیلا کر سوال کیا۔ مگر میرے جواب دینے سے پہلے وہ خود ہی بول پڑیں۔ ''ویسے مجھے امید تھی کہ تم ایک دن گردن جھکائے اور ہاتھ جوڑے میرے سامنے آ کھڑے ہو گے۔''

''بیگم جان...... دراصل...... وہ......''

''کیوں پھر...... دن میں تارے نظر آنے لگے ہیں کہ نہیں......؟'' بیگم جان نے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ میری بات ٹوکتے ہوئے کہا۔

پہلے مجھے کچھ کچھ شک تھا لیکن اب یقین ہو گیا تھا کہ میرے خلاف اخبارات میں خبریں بیگم جان ہی لگوا رہی تھیں اور میرے ساتھ عروج کی تصویر بھی انہی کا کارنامہ تھا۔ ہم تینوں ابھی تک کھڑے تھے اور بیگم جان نے ایک بار بھی ہمیں بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ ان کا رویہ مسلسل ہتک آمیز تھا۔ مجھے بیگم جان کے رویے پر بہت دُکھ ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں نے انتہائی دھیمی آواز میں بات کی۔

''بیگم جان...... میں نے تو اسی روز آپ کے مقابلے سے دستبردار ہونے کا کہہ دیا تھا۔ پھر یہ سب کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی تھی؟ بات صرف میری حد تک ہوتی تو خیر تھی، لیکن آپ میرے ساتھ ساتھ اس معصوم لڑکی کو بھی بدنام کر رہی ہیں۔''

''بس...... اتنی جلدی گھبرا گئے...... جب یاسمین شیخ کے مقابلے میں آئے ہو تو حوصلے بلند رکھو۔''

"بیگم جان! میں نے کہا ناں...... مجھ سے کسی قسم کی قسم لے لیجئے۔ میں جان بوجھ کر آپ کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہوا۔ آپ یقین جانئے اگر مجھے پہلے سے آپ کے بارے میں علم ہوتا تو میں کبھی بھی الیکشن میں کھڑا نہ ہوتا......" میں نے ایک بار پھر بیگم جان کو حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے غرور و تکبر کے نشے میں اکڑی بیٹھی تھیں اور وہاں پر موجود لوگوں کے سامنے جس قدر ذلیل کرنا اور گرانا چاہ رہی تھیں، گرا رہی تھیں۔ اکڑ کر بولیں۔

"اب تمہیں اپنی شکست کا یقین ہونے لگا ہے تو میرے دروازے پر آ کھڑے ہوئے ہو۔ مگر اب تمہیں اس در سے کچھ نہیں ملے گا۔ نہ بھیک نہ معافی۔ کیونکہ جتنی نمک حرامی تم نے کرنی تھی، کر لی۔ تم اپنا شوق پورا کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ یقیناً میں تمہیں کسی کیڑے کی طرح پاؤں تلے مسل کے رکھ دوں گی۔ کیونکہ تمہیں یاسمین شیخ کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں۔"

"ٹھیک ہے بیگم جان! ہم چلتے ہیں...... اجازت دیں......"

جب بیگم جان نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا تو ہم تینوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔ ہمارے باہر نکلتے ہی ڈرائنگ روم میں زوردار قہقہے گونجنے لگے۔

وہاں سے نکل کر ہم سیدھے گھر آ گئے۔ گھر میں دیگر افراد سو رہے تھے۔ الیاس اور تنویر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ بیگم جان کے ہاں سے نکلنے کے بعد راستے میں ہم تینوں ہی خاموش رہے۔ میں کوئی بات کرتا تو شاید الیاس اور تنویر بھی کچھ کہتے۔ لیکن نہ میں نے کوئی بات چھیڑی نہ وہ ہی بولے۔

میرے اندر آگ بھڑک اٹھی تھی جو مجھے بری طرح جلا رہی تھی لیکن میں برداشت کئے جا رہا تھا۔ بیگم جان کی ایک ایک بات مجھے زخمی کر رہی تھی۔ میں انگاروں پر لیٹ رہا تھا۔ نیند کہاں سے آتی۔ میں چاہتا تو بھری محفل میں بیگم جان کو ننگا کر کے رکھ دیتا لیکن میرے ضمیر نے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ میں نے نہ صرف اس گھر کا نمک کھایا تھا بلکہ شیخ جی نے اس قدر محبت دی تھی کہ میری زبان کسی بھی طرح کھل نہیں سکتی تھی۔

میں بستر پر پڑا تڑپتا رہا۔ کئی بار کروٹیں بدلیں۔ کئی بار اٹھ بیٹھا اور کئی بار اٹھ کر پھر

لیٹا۔ لیکن سکون نہ مل سکا۔ پھر نہ جانے کب دل نے فیصلہ سنا ڈالا کہ مجھے الیکشن لڑنا ہے اور ہر قیمت پر جیت کر دکھانا ہے۔

میں یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ آئے دن اخبارات میں میرے خلاف چھپنے والی نت نئی خبروں کے علاوہ میرے ساتھ قابل اعتراض حالت میں چھپنے والی عروج کی تصویر نے لوگوں کے ذہنوں پر منفی اثرات ڈالے ہوں گے اس لئے ضروری تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو، جلسوں اور جلوسوں میں اپنی پوزیشن واضح کروں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عروج پڑھی لکھی، شریف اور سمجھدار لڑکی تھی اور میں اسے پسند بھی کرنے لگا تھا۔ مگر ابھی تک دل کی بات زبان تک نہیں لایا تھا اور نہ ہی میری اس کیفیت سے کوئی دوسرا آگاہ تھا۔ اخبارات میں چھپنے والی تصویر نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب میرے لئے عروج کو اپنانا آسان نہ تھا۔ اس لئے میں نے عروج کے لئے اپنے دل میں اٹھنے والے جذبات کو ہمیشہ کے لئے دبانے کا فیصلہ کر لیا اور کروٹ لے کر سو گیا۔

رات کروٹیں بدلتے گزری تھی اس لئے صبح معمول سے کچھ لیٹ اٹھا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر دفتر پہنچا تو عروج اپنی سیٹ پر موجود نہ تھی جبکہ گوہر اپنی سیٹ پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس رکے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بیٹھتے ہی میں نے گوہر کو اپنے پاس بلا لیا اور عروج کے بارے میں دریافت کیا مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور بولا۔

"چوہدری صاحب! ہوسکتا ہے کوئی ضروری کام پڑ گیا ہو اس وجہ سے نہ آئی ہو۔"

میں نے اسے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رہا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بھی اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

اگلے دو تین روز بھی عروج دفتر نہ آئی۔ میں اس کے نہ آنے کا سبب سمجھ گیا تھا لیکن فی الحال میں اس معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ پورے علاقے میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ چوہدری جمیل احمد نے الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس وقت لوگوں کے ذہنوں کو صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے فوری طور پر اپنے تمام ورکرز کو اکٹھا کیا اور ہنگامی طور پر ہر گلی، محلے اور چوک میں جلسہ کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ میں نے لاکھوں کی تعداد میں اشتہار چھپوا کر گھر گھر تقسیم کروائے جن کے ذریعے نہ صرف

اپنے اوپر لگنے والے الزامات کی پُر زور تردید کی بلکہ واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کر میں کسی بھی صورت میں پیچھے ہٹنے والا نہیں۔

میری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ میری طرف سے مطمئن ہو گئے اور ایک بار پھر میرے جلسے اور جلوسوں کی رونق بڑھنے لگی۔ یوں بھی سبھی پرانے چہرے لوگوں کے آزمائے ہوئے تھے اور وہ نوجوان قیادت دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے دن دیکھا نہ رات اور نہ ہی سونے اور آرام کرنے کی فکر کی۔ الیکشن کے سلسلے میں ووٹ مانگنے جہاں کہیں گیا، ان لوگوں نے اپنے جو بھی چھوٹے موٹے مسائل میرے سامنے رکھے، میں نے وعدہ کرنے کی بجائے فوری طور پر وہ مسائل حل کرنے کے انتظامات کر دیئے۔

الیکشن کے روز ہر طرف سڑکوں پر زیادہ تر ایسی گاڑیاں دوڑتی دکھائی دے رہی تھیں جن پر میرے نام کے پوسٹر لگے تھے۔ میں نے بہت سے رکشے، کاریں اور دیگر گاڑیاں کرائے پر لے رکھی تھیں جو گھر گھر جا کر لوگوں کو ووٹ ڈالنے کے لئے لا رہی تھیں۔ جگہ جگہ ووٹ ڈالنے کے لئے آنے والوں کو میری طرف سے زبردستی بٹھا کر کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ جہاں جہاں پولنگ اسٹیشنوں پر ورکرز موجود تھے خواہ ان کا تعلق کسی بھی امیدوار سے تھا، ان کو دوپہر اور شام کے وقت کھانے کے پیکٹ بھجوائے گئے۔ مجھے جہاں کہیں سے جو رقم موصول ہو رہی تھی، میں الیکشن کی نذر کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کی ہرگز پرواہ نہ تھی کہ الیکشن پر میری کس قدر رقم خرچ ہو رہی تھی کیونکہ مجھے ہر حال میں الیکشن جیت کر دکھانا تھا۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد شام کے وقت میں اپنے دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہر پولنگ بوتھ پر اپنے خاص بندوں کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی جو بذریعہ فون مجھے پل پل کی خبر دیتے رہے۔ جیسے جیسے رات ہوتی گئی، نتائج کی خبریں آنے لگیں۔ جہاں کہیں سے گنتی مکمل ہونے کی اطلاع آتی، میرے ووٹ زیادہ نکلتے۔ پھر بھی حتمی نتیجہ آنے سے پہلے کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے گھر سے ٹیلی ویژن منگوا کر دفتر میں لگا لیا تھا۔ مختلف حلقوں سے نتائج موصول ہونے لگے تھے۔ فون کی بجنے والی ہر گھنٹی کے ساتھ ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ میری نظریں ٹیلی ویژن پر اور کان فون سننے میں لگے ہوئے تھے۔ جب ہر طرف سے میری کامیابی کی خبریں آنے لگیں تو میں اپنے دفتر سے

نکل کھڑا ہوا۔ میرے بہت سے سپورٹر موٹر سائیکلوں اور رکشوں پر میرے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ میں حلقے کے مختلف پولنگ اسٹیشنوں سے ہوتا ہوا کچھ دیر بعد واپس اپنے دفتر آ گیا۔ وہاں بہت سے لوگ دفتر کے باہر جمع تھے۔ اس وقت تک میری فتح یقینی ہو چکی تھی۔ گاڑی سے نکلتے ہی لوگوں نے خوشی میں آ کر مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور نعرے لگانے لگے۔ بھنگڑے ڈالے جانے لگے اور آتش بازی ہونے لگی۔ جوشیلے نوجوان کسی بھی صورت میں مجھے کندھوں سے اتارنے کے لئے تیار نہ تھے۔ میں نے بمشکل سمجھا بجھا کر انہیں ٹھنڈا کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹیلی ویژن پر بھی میری کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔ میں نے قریب قریب کی دُکانوں سے جس قدر مٹھائی مل سکی، منگوا کر لوگوں کے سامنے رکھ دی کہ جس قدر دل چاہے کھاؤ۔ رات اسی طرح ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ میرے سپورٹروں کے علاوہ میرے چاروں ساتھیوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ وہ اب بھی میرے پاس بیٹھے میری کامیابی پر خوش ہو رہے تھے۔ کچھ اخباری رپورٹر بھی آ پہنچے اور میری تصاویر بنانے لگے۔ کچھ اخباری نمائندوں نے مختلف چبھتے ہوئے سوال بھی کیے مگر میں نے ہر سوال کا جواب انتہائی محتاط ہو کر دیا۔

رات مبارکبادیں وصول کرتے ہوئے گزر گئی۔ میں اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ ایسے میں نیند کہاں سے آتی۔ لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ خوش تھے اور میری کامیابی کی خوشی سے ان کی آنکھوں سے بھی نیند اُڑ گئی تھی۔ میں پچھلی کئی راتوں سے ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکا تھا۔ میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی لیکن رات بھر آنے جانے والوں کا رش لگا رہا۔ صبح کے وقت کچھ آمد و رفت کم ہوئی تو میں نے پروگرام بنا لیا کہ گھر چل کر کچھ دیر کے لئے سویا جائے تاکہ تھکن دور ہو۔

عروج میری پرانی ساتھی تھی۔ اس نے ہر طرح کے اچھے برے حالات میں میرا ساتھ دیا تھا۔ اب وہ نہ صرف میری وجہ سے بدنام ہوئی تھی بلکہ مجبوراً نوکری چھوڑ کر گھر جا بیٹھی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اس کا خیال آ رہا تھا۔ میں نے الیکشن کی وجہ سے جان بوجھ کر اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اب جبکہ میں انتخابات سے فارغ ہو چکا تھا، یہ مناسب وقت تھا کہ اس کے گھر جا کر اس کی دلجوئی کی جائے۔ مناسب وقت دیکھ کر میں تنہا عروج کے گھر جا پہنچا۔ دستک دینے پر عروج نے ہی دروازے کی کنڈی

کھولی۔ وہ اچانک مجھے اپنے سامنے پا کر حیران ہوگئی اور صرف اتنا کہہ سکی۔

''چوہدری صاحب...... آپ...... یہاں......؟''

''کیوں...... میں یہاں نہیں آ سکتا تھا......؟''

''نہیں چوہدری صاحب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''میرا خیال ہے، اگر تمہیں برا نہ لگے تو ہم اندر بیٹھ کر بات کر لیں۔ یوں دروازے پر کھڑے رہنا مناسب نہیں۔''

میری بات سنتے ہی وہ ایک طرف ہوگئی اور بولی۔ ''کیوں نہیں...... یہ آپ کا اپنا گھر ہے سر...... آپ اندر تشریف لے آئیں۔''

عروج کو میرے پاس ملازمت کرتے ہوئے کئی سال گزر گئے تھے مگر میں نے اس کے گھریلو مسائل اور حالات کے بارے میں جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ ویسے مجھے کبھی اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی۔ مجھے یہ جان کر دلی دکھ ہوا کہ عروج اپنے والدین اور چھوٹے بہن بھائی کا تنہا بوجھ برداشت کرتی تھی۔ عروج کے دو بڑے بھائی شادی شدہ تھے جو شادی کے بعد اپنے اپنے بیوی بچوں کو لے کر کہیں الگ جا بسے تھے اور گھر کی تمام ذمہ داری عروج کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ عروج کے والدین کو کئی بیماریوں نے ایک ساتھ گھیر رکھا تھا اور وہ دونوں چارپائی سے لگے بیٹھے تھے۔ عروج نہ صرف اپنے چھوٹے بہن بھائی کو تعلیم دلوا رہی تھی بلکہ بوڑھے والدین کی خدمت بھی کر رہی تھی۔ ملازمت سے جیسے تیسے کسی نہ کسی طرح گھر کا چولہا جل رہا تھا جو اس کے گھر بیٹھ جانے سے بجھ گیا تھا۔ بیٹی کی بدنامی نے عروج کے والدین کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ میں نے عروج کے ساتھ ساتھ انہیں بھی بہت سمجھایا مگر وہ روئے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ مجھ سے جو بن سکا، میں ان لوگوں کے لئے کروں گا۔ میں نے چلتے ہوئے زبردستی کچھ رقم عروج کے والد کی جیب میں ڈال دی اور بوجھل دل کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔

میں اور معاملات سے پہلے عروج والے معاملے کو کسی ٹھکانے لگانا چاہتا تھا تاکہ آگے چل کر کسی مرحلے پر یہ معاملہ سر نہ اٹھائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ کہیں نہ کہیں عروج کی شادی کروا دی جائے۔ ایک دو اچھے لڑکے میری نظر میں تھے۔ ان میں

سے ایک لڑکے کے والدین کو عروج کے ساتھ شادی کے لئے رضامند کر لیا اور ایک ہفتے کے اندر عروج دُلہن بن کر اپنے پیا کے گھر جا بیٹھی۔ میں نے نہ صرف شادی پر آنے والے تمام اخراجات خود ادا کئے بلکہ عروج جو ماہانہ تنخواہ مجھ سے لیتی تھی، وہ رقم ہر ماہ اس کے والدین کو پہنچانے کے انتظامات بھی کر دیئے۔

عروج کی وجہ سے مجھے جو پریشانی تھی، وہ دور ہوگئی تھی۔ اب میں دیگر معاملات کو با آسانی پوری توجہ دے سکتا تھا۔ جب سے میں صوبائی اسمبلی کا رُکن منتخب ہوا تھا، عجیب مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ الیکشن میں کسی بھی بڑی پارٹی کو بھاری اور واضح اکثریت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہر پارٹی اس کوشش میں تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح ایک ایک دو دو سیٹیں حاصل کرنے والی سیاسی پارٹیوں اور آزاد امیدواروں کو اپنے ساتھ شامل کر لے تاکہ اس کے ممبران کی تعداد بڑھ جائے۔ بہت سے ممبران نے کسی نہ کسی بڑی سیاسی پارٹی میں شمولیت کا وعدہ بھی کر لیا تھا مگر میں نے ابھی تک کسی کے ساتھ بھی شامل ہونے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ آئے روز کبھی ایک سیاسی پارٹی کے کبھی دوسری سیاسی جماعت کے سرکردہ ممبران میرے پاس آ بیٹھتے اور گھنٹوں بیٹھے اپنی حمایت کے لئے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ مجھے دونوں بڑی جماعتوں کی طرف سے طرح طرح کے لالچ دیئے جانے لگے لیکن میں کسی بھی قیمت پر کسی ایک پارٹی کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔

چار گھنٹے کی مسلسل مغز ماری کے بعد بڑی سیاسی پارٹی کے ممبران اٹھ کر گئے تھے اور میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ ابھی دوسری پارٹی کے اراکین نہ آ بیٹھیں۔ میں بغیر کسی پروگرام کے دفتر سے نکل گیا۔ میں یونہی بے ارادہ نکلا تھا لیکن حیران تھا کہ میری گاڑی کا رخ بیگم جان کے گھر کی طرف تھا۔ میرا بیگم جان کے پاس جانے یا ان سے ملنے کا کوئی باقاعدہ پروگرام نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ جب ادھر آ ہی نکلا ہوں تو ذرا چل کر دیکھوں تو سہی کہ شکست کھانے کے بعد بیگم جان کا رویہ کیسا ہے۔

بیگم جان کے ہاں پہنچا تو گیٹ بند تھا۔ میں نے کوٹھی کے باہر ہی گاڑی کھڑی کر دی۔ افضل خان کھانا کھا رہا تھا اور لاڈلی اس کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے

دیکھتے ہی وہ دونوں کھل اٹھے۔

"آؤ آؤ جمیل بابو...... ابھی ابھی ہم دونوں بیٹھے تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم بیگم جان کے مقابلے میں الیکشن لڑ رہے ہو۔"

"تم یقین جانو لاڈلی! اس بات کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ کیونکہ بیگم جان، یاسمین شیخ کے نام سے الیکشن لڑ رہی تھیں۔ تم لوگ شاید نہ مانو لیکن یہ سچ ہے کہ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے فوری طور پر الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے اس فیصلے سے بیگم جان کو بھی آگاہ کیا۔ لیکن نہ جانے وہ مجھے الیکشن میں شکست دے کر مجھ سے کون سا بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ تم خود اس بات کی گواہ ہو کہ اس روز بھی میں بیگم جان کے پاس اسی سلسلے میں آیا تھا مگر انہوں نے ذلیل کر کے بھیجا......"

"خیر چھوڑو...... جمیل بابو! ہماری طرف سے تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔" افضل خان اور لاڈلی نے ایک ساتھ مبارکباد دی۔ ابھی میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے لب کھولنے والا تھا کہ لاڈلی بول پڑی۔

"دیکھ لو جمیل بابو! یہ سب اوپر والے کے کام ہیں۔ ہمیں دیکھ لو، وہیں کے وہیں بیٹھے ہیں اور تم کہاں سے کہاں جا پہنچے۔"

"یہ تو تم لوگوں کا پیار ہے...... اچھا لاڈلی! یہ تو بتاؤ، بیگم جان گھر پر ہی ہیں؟"

میری بات سن کر لاڈلی نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولی۔ "بیگم جان نے بھلا اب کہاں جانا ہے۔ الیکشن میں ہارتے ہی سب فصلی بٹیرے اُڑ گئے اور وہ پھر سے اکیلی رہ گئیں۔ اب وہ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی ہیں اور کسی بھی آنے جانے والے سے نہیں ملتیں۔"

"لیکن لاڈلی! میں تو بیگم جان سے ملنے آیا تھا۔"

"بابو! بہتر یہی ہے کہ تم ان سے ملے بغیر لوٹ جاؤ۔ کیونکہ میں نے تمہارا پیغام دیا بھی تو وہ نہیں ملیں گی۔"

لاڈلی بات کرتی رہی اور افضل خان مسلسل نظریں جھکائے اُداس کھڑا رہا۔ بیگم جان کے ذکر نے مجھے بھی فکرمند کر دیا تھا۔ یہ وقت بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ اسے بدلتے ہوئے کچھ دیر نہیں لگتی۔ میں ابھی کچھ سوچ رہا تھا کہ لاڈلی کی آواز میرے کانوں سے

ٹکرائی۔

"بابو...... اب تو تم بہت بڑے آدمی بن گئے ہو۔ ہم غریبوں کو بھول نہ جانا......"

"لاڈلی! تم لوگوں کو بھلا میں کبھی بھول سکتا ہوں......؟"

"جمیل بابو...... اب تو تمہاری تصویریں بھی اخباروں میں آتی رہتی ہیں۔" افضل خان نے بات کی اور پھر پاس ہی پڑا ہوا اخبار اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ دیکھو جمیل بابو...... آج بھی تمہاری تصویر اخبار میں چھپی ہے۔"

میں نے افضل خان سے اخبار لے لیا۔ تصویر میں میرے ساتھ الیاس، تنویر، غفور اور جبار بھی کھڑے تھے۔ ابھی میں تصویر دیکھ رہا تھا کہ لاڈلی بول پڑی۔

"بابو! یہ تمہارے ساتھ کون لوگ کھڑے ہیں......؟"

"یہ...... یہ میرے بہت پیارے دوست ہیں۔ بلکہ میرے بہت قریبی ساتھی۔" میں نے تصویر پر ہاتھ مارتے ہوئے فخر سے کہا۔

"دراصل میں تو اس لئے پوچھ رہی تھی کہ ان میں سے دو بندوں کو میں نے اکثر بیگم جان کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔" لاڈلی نے بات کی تو مجھے زوردار جھٹکا محسوس ہوا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لاڈلی کی بات کی تصدیق کرنے کے لئے ایک بار پھر جان بوجھ کر سوال کیا۔

"لاڈلی! تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے...... بھلا یہ لوگ بیگم جان کے پاس کیا لینے آئیں گے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی کہ وہ بیگم جان کے پاس کیوں آتے تھے لیکن میری آنکھیں بھی دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ تم چاہو تو ان سے خود پوچھ لینا۔ پھر تمہاری تسلی ہو جائے گی۔" لاڈلی کی باتوں کے دوران افضل خان نے اخبار اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور تصویر دیکھتے ہی بولا۔

"یہ سچ کہہ رہی ہے......" پھر غفور اور جبار کی تصویروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"ان دونوں کو تو میں نے بھی کئی بار بیگم جان کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔ بیگم جان ان سے علیحدگی میں بیٹھی نہ جانے کیا باتیں کرتی رہتی تھیں...... ویسے اب کچھ دنوں سے انہیں یہاں نہیں دیکھا۔"

افضل خان اور لاڈلی کی باتیں میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں اس لئے میرا وہاں مزید رُکنا بہت مشکل تھا۔ وہ مجھے روکتے رہے لیکن میں اچانک طبیعت خراب ہو جانے کا بہانہ بنا کر وہاں سے نکل آیا۔ وقت نہ جانے اب مجھے کون سا نیا رخ دکھانے والا تھا۔ میرے دماغ میں بار بار ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ غفور اور جبار، بیگم جان سے ملنے آتے رہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ دونوں بیگم جان کے پاس کیوں جاتے رہے؟ جبکہ وہ الیکشن میں میرے مدمقابل تھیں اور انہوں نے مجھ سے کبھی اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا تھا کہ وہ بیگم جان کے پاس کبھی گئے بھی ہیں۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ لیکن فی الحال میں اس معاملے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ دیگر بہت سے مسائل میرے سر پر سوار تھے۔ پہلے تو انہیں سلجھانا ضروری تھا۔

اب دونوں پارٹیاں اس پوزیشن میں آ گئی تھیں کہ جو بھی دو چار ممبران اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جاتا، وہ حکومت بنا لیتی۔ ایسے میں مجھ جیسے آزاد امیدواروں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم نہ تھا کہ انہوں نے دیگر ممبران کو کن شرائط پر راضی کیا تھا لیکن میں نے جس پارٹی کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ مجھے وزارت دی جائے جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

اسمبلی کا اجلاس بلایا جانے والا تھا۔ اندرونِ خانہ تقریباً تمام معاملات طے پا گئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ کیوں نہ میں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے دربار پر حاضری دوں۔ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ حاضری کے لئے داتا دربار گیا اور پھولوں کی چادر چڑھائی۔ دربار پر حاضری کے بعد ہم باہر نکل رہے تھے کہ ایک مانوس سا چہرہ دربار کی سیڑھیوں سے چڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے فوری طور پر اپنے ذہن پر زور دیا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ جب میں نے اپنے ذہن پر اور زور ڈالا تو مجھے یاد آیا کہ وہ ہمارے گاؤں کے امام مسجد کا بیٹا کرم شاہ ہے۔

کرم شاہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ہم مدت بعد ملے تھے اس لئے وہ مجھے پہچان نہ سکا اور بولا۔ ”معاف کیجئے گا، میں نے

آپ کو پہچانا نہیں۔“

”میں جمیل احمد ہوں...... تمہارے گاؤں کا جیلو......“

”جیلو...... یہ تم ہو......؟“

”ہاں ہاں، میں جیلو ہوں...... تم یہ بتاؤ کہ یہاں اکیلے ہی آئے ہو یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟“

”میں یہاں کسی کام سے آیا تھا اور سوچا دربار پر سلام کر آؤں...... مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔“

ایک مدت بعد میرے گاؤں کا کوئی شخص اچانک سرِ راہ مجھے ملا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنے گھر اور گاؤں والوں کے متعلق جاننے کے لئے دل بے چین ہو گیا تھا۔ میں بھلا یہ موقع کیسے ضائع کر سکتا تھا۔ کرم شاہ فاتحہ خوانی کے لئے داتا صاحب کے مزار پر آیا تھا اس لئے میں نے اسے کہا کہ وہ حاضری دے لے، میں باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ میری بات سن کر کرم شاہ دربار کے اندر چلا گیا جبکہ میں دربار کی سیڑھیاں اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے تمام دوست احباب سے کہا کہ وہ واپس چلے جائیں، میں کچھ دیر بعد آ جاؤں گا مگر ان میں سے کوئی بھی شخص مجھے تنہا چھوڑ کر جانے کو تیار نہ ہوا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کرم شاہ واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں تبرک کے طور پر ملنے والے مکھانے پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے مکھانوں والا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے ایک مکھانہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور کرم شاہ کو ساتھ لئے اپنے دیگر ساتھیوں سمیت گھر چل پڑا۔ روانگی سے قبل میں نے تمام ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے مہمان کے ساتھ سیدھا گھر جاؤں گا۔ وہ لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔

ہم داتا دربار سے قافلے کی شکل میں روانہ ہوئے تھے مگر جیسے جیسے ہم گھر کے قریب پہنچتے گئے، تعداد کم ہوتی گئی۔ کرم شاہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور خاموش تھا۔ میں نے جان بوجھ کر کوئی بات نہ کی۔ کیونکہ ہماری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تین افراد اور بھی بیٹھے تھے اور ان کی موجودگی میں کرم شاہ سے اپنے گھر والوں کے متعلق کسی قسم کی کوئی بات چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے دیگر ساتھیوں سے معذرت کر لی

اور کرم شاہ کو ساتھ لئے گھر میں داخل ہو گیا۔ کرم شاہ ابھی تک خاموش تھا۔ گو کہ وہ مدت بعد مجھ سے ملا تھا اور مجھے محسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے ہیں لیکن میری طرح شاید وہ بھی اس انتظار میں تھا کہ آرام سکون سے بیٹھ کر تسلی سے باتیں کریں گے۔ میں نے گیراج میں گاڑی کھڑی کی اور اسے ساتھ لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے چاچی کو بلا کر کھانا تیار کرنے کو کہہ دیا۔

کرم شاہ منہ ہاتھ دھو کر واپس میرے پاس آ بیٹھا لیکن ابھی تک میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کروں۔

''اور سناؤ کرم شاہ! لاہور کیسے آنا ہوا......؟'' میں نے کرم شاہ کو چھیڑا۔

''سچ پوچھو تو میں یہاں ملازمت کے لئے آیا تھا...... اس سے پہلے بھی کئی بار اسی سلسلے میں یہاں آ چکا ہوں مگر اب تک سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔''

''ہاں یار! آج کل ملازمتیں بھی آسانی سے کہاں ملتی ہیں۔ بے روزگاری دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ بہت سے نوجوان ہاتھوں میں بڑی بڑی ڈگریاں لئے ملازمت کے حصول کے لئے دھکے کھاتے پھرتے ہیں مگر نوکری نہیں ملتی۔''

''بس میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے...... نوکری کی تلاش کرتے کرتے اوور ایج ہو چکا ہوں مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ جہاں کہیں اُمید کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے، دوڑا چلا آتا ہوں اور کرائے کے پیسے خرچ کر کے گاؤں واپس چلا جاتا ہوں۔''

''تمہارے والد تو امام مسجد ہیں...... تم بھی کوئی مسجد سنبھال لو۔''

''نہیں یار...... امام مسجد بھی اب کہنے کو امام رہ گیا ہے۔ ورنہ لوگ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ صرف نکاح اور جنازے کے وقت انہیں امام مسجد یاد آتا ہے۔ کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ امام مسجد کے گھر میں چولہا بھی جلتا ہے کہ نہیں۔ لوگ چند سو روپے ماہانہ امام مسجد کی ہتھیلی پر رکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ انہوں نے بہت بڑا کام کر لیا۔ لوگ بھی یہ خیال نہیں کرتے کہ آیا ان تھوڑے سے روپوں سے گزارا ہو پائے گا؟ شاید ان کے ذہنوں میں یہ ہوتا ہے کہ امام مسجد کو کہیں سے غیبی امداد مل جاتی ہو گی۔''

کرم شاہ پھٹ پڑا تھا۔ وہ نہ جانے اور کیا کیا کہے جاتا مگر وہ سانس لینے کے لئے

رکا تو میں نے جان بوجھ کر باتوں کا رخ بدلنے کے لئے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''اور...... گاؤں والوں کی سناؤ یار!''

''گاؤں والے تو کیا، تمہارے سبھی اپنے یہاں تک کہ تمہارا باپ اور تمہارے بھائی بھی یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ تم کہیں مر کھپ گئے ہو...... مگر اللہ کی شان دیکھو کہ تم اچھے بھلے کھاتے پیتے ہو۔''

''ہاں یار...... میں نے جن حالات میں گھر چھوڑا تھا، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو واقعی کہیں مر کھپ گیا ہوتا یا پھر کہیں بھیک مانگ رہا ہوتا۔ لیکن میں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور آج تمہارے سامنے ہوں......''

کرم شاہ کے کہنے پر میں نے گاؤں سے نکلنے سے اب تک کی تمام روداد اسے سنا ڈالی۔ وہ انتہائی دلچسپی سے میری باتیں سنتا رہا اور واہ واہ کرتا رہا۔ میں نے اپنی زندگی کے بہت سے پہلو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیئے تھے لیکن کچھ پہلو جان بوجھ کر دل میں چھپا لئے۔ کیونکہ وہ ایسی باتیں تھیں جو میں نے اپنے سوا کسی اور کو معلوم نہیں ہونے دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ علاقے میں میرا بھرم قائم تھا۔ میں نے کرم شاہ سے اپنے اسمبلی کا ممبر بننے کا ذکر کیا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے خوشی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بولا۔

''جیلو...... تم نے تو کمال کر دکھایا۔ تم کہاں سے کہاں جا پہنچے اور گاؤں میں کسی کو خبر تک نہیں......؟''

''اب گاؤں میں میرا ہے ہی کون......؟''

''ایسا نہ کہو جیلو...... اب بھی کبھی تمہارے باپ کے سامنے تمہارا ذکر چھڑ جائے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں...... یقین کرو وہ تمہارا ذکر سن کر اب بھی رو پڑتا ہے۔ ذرا خود ہی سوچو، جس باپ کا جوان بیٹا گھر سے نکل جائے اسے صبر کہاں آتا ہے۔ جانتے ہو تمہارا ذکر سن کر تمہارا باپ کیا کہتا ہے؟...... وہ کہتا ہے میرا جیلو پتر بہت لائق تھا...... وہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن جاتا۔ مگر میں نے ہی اسے پڑھنے نہ دیا۔''

کرم شاہ کے منہ سے ابا کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''اور کرم شاہ!...... میرے بھائی کیسے ہیں......؟'' میں نے جان بوجھ کر خود پر قابو

پانے کے لئے بات کی۔

"تمہارے سبھی بھائی ماشاء اللہ بال بچوں والے ہیں۔ تمہارا باپ تو ہاتھ میں تسبیح لئے ہر دم اللہ اللہ میں لگا رہتا ہے اور وہ سب کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اپنی زمین کے علاوہ بھی انہوں نے کچھ زمین ٹھیکے پر لے رکھی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی تمہارے کسی بھائی کی شادی ہوئی، وہ تمہیں یاد کر کے ضرور رویا۔ کیونکہ کوئی اپنا مر جائے تو پھر بھی وقت کے ساتھ ساتھ صبر آ ہی جاتا ہے مگر کوئی بچھڑ جائے تو زندگی بھر اس کی یاد ستاتی رہتی ہے اور کسی پل قرار نہیں آتا......"

میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میرے گھر والے مجھے کب کے بھول چکے ہوں گے۔ مگر کرم شاہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف ابھی تک مجھے بھولے نہیں بلکہ اپنی باتوں میں میرا ذکر بھی شامل رکھتے ہیں۔ کس قدر عجیب سی بات ہے کہ ہم جو سوچ بیٹھے ہوتے ہیں، حقیقت میں ویسا ہوتا نہیں۔ کیونکہ ہم جو سوچتے ہیں اس کا تعلق محض ہمارے ذہن سے ہوتا ہے اور ہم اپنے ذہن میں آنے والی باتوں کو ہی سچ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ چاچی کھانا لے آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ الیاس، تنویر، غفور اور جبار بھی آ گئے۔ انہیں شاید چاچی نے بتا دیا تھا کہ میرے پاس کوئی مہمان آیا بیٹھا ہے۔ وہ چاروں ہی اپنے کمرے میں کھانا کھایا کرتے تھے جبکہ میں اپنے کمرے میں تنہا کھانا کھاتا۔ کیونکہ انہیں صبح سویرے اپنے دفتروں کے لئے نکلنا ہوتا تھا اور رات کو بھی جلد سو جاتے تھے۔ جبکہ مجھے اکثر دیر سویر ہو جاتی تھی۔ صبح کے وقت بھی میں اکثر دیر تک سویا رہتا تھا اور ناشتہ بھی لیٹ ہی کرتا تھا۔ تب تک وہ گھر سے نکل چکے ہوتے تھے۔ آج چاچی ہم سب کے لئے وہیں کھانا لے آئی تھی۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

میں ان چاروں کو جب بھی کبھی دیکھ لیتا تھا، میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ لیکن اس وقت جانے کیوں میں جب بھی کوئی بات کرنے لگتا، میرے دل سے سوال اٹھتا کہ یہ بیگم جان کے پاس کیوں جاتے رہے؟ اور اگر کسی وجہ سے جاتے بھی تھے تو کبھی مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا شاید یہی وجہ تھی جو مجھے ان سے بات کرنے سے

روک رہی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر سونے کے لئے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ رات کافی ہو گئی تھی۔ کرم شاہ بھی تھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی نیند کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں اس لئے ہم بھی ان کے جاتے ہی سو گئے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو کرم شاہ نہا دھو کر تیار ہوا بیٹھا تھا۔

"خیر تو ہے......تم صبح ہی صبح تیار ہو کر کیوں بیٹھ گئے......کہاں کی تیاری ہے؟"

"گاؤں واپس جا رہا ہوں۔"

"مگر اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ اب مل ہی گئے ہو تو کچھ دن میرے پاس ٹھہرو، پھر چلے جانا۔"

"نہیں یار...... مجھے آج ہی جانا ہے۔ گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے...... اب تمہارا ٹھکانہ دیکھ لیا ہے، پھر کبھی آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی...... لیکن دیکھو...... ابھی گاؤں میں میرے بارے میں کسی سے ذکر نہ کرنا اور ہو سکے تو ایک دو روز میں میرے پاس ہی چلے آنا۔ مگر یوں جانے کے لئے نہیں بلکہ یہیں میرے پاس رہنا......"

میری بات سنتے ہی کرم شاہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے ٹھہرو تو سہی...... ناشتہ کر کے جانا۔ میں جلدی سے تیار ہو جاؤں، پھر ناشتہ کر کے میں خود تمہیں گاڑی میں بٹھا آؤں گا۔"

"نہیں نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ ہاں البتہ ناشتہ کر لیتے ہیں۔" کرم شاہ نے بات کی اور بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ پھر کرم شاہ گاؤں روانہ ہو گیا اور میں دفتر پہنچ گیا۔

دفتر پہنچا تو کچھ لوگ بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اسی سیاسی پارٹی کے نمائندے تھے میں نے جن کی حمایت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت انہیں اپنے دفتر میں دیکھ کر حیرانی ہوئی۔

"آپ لوگ خیر سے آئے ہیں ناں......؟"

میرا سوال سن کر ان میں سے ایک شخص بول پڑا۔ "خیر ہی تو نہیں ہے چوہدری

صاحب! اسی لئے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔ سچ پوچھیں تو ہماری نیندیں اُڑ کر رہ گئی ہیں۔"

"لیکن مجھے پتہ تو چلے کہ ایسا کیا ہو گیا جو آپ اس قدر پریشان ہیں؟"

"دراصل ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ ہماری حریف جماعت کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے آپ کو اپنی پسند کی وزارت دینے کا وعدہ کیا ہے......" ان میں سے ایک نے میرے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔ ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ بات کسی دشمن نے اڑائی ہو گی۔ ورنہ ایسا کچھ نہیں...... آپ لوگ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں لکھ کر تو دی نہیں جاتیں، بلکہ زبان کی بات ہے۔ جب آپ سے وعدہ کر لیا تو پھر کر لیا۔ کوئی کچھ بھی کہتا رہے، آپ کسی کی بات پر بھی کان نہ دھریں۔ ہاں...... اگر...... آپ لوگوں نے وزارت دینے کا وعدہ پورا نہ کیا تو پھر کچھ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں نہیں چوہدری صاحب...... ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کر کے دکھائیں گے۔ چوہدری صاحب! آپ نے محسن بن کر ہماری پارٹی سے ہاتھ ملایا ہے۔ ہم بھلا اپنے محسن سے کیا ہوا وعدہ کیسے بھول سکتے ہیں؟"

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ مجھے تنہائی ملی تو میرا ذہن پھر وہیں الجھ گیا کہ میرے وہ ساتھی جنہیں میں اپنا بازو سمجھتا تھا، وہ بیگم جان کے پاس کیا لینے جاتے تھے؟ میرے دماغ میں طرح طرح کی باتیں آتی رہیں اور میں ہر بات کو خود ہی جھٹکتا رہا مگر ذہن کسی بھی طرح مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ کچھ روز قبل جبار میرے پاس آیا تھا تو اس کے ہاتھوں میں کیمرہ تھا۔ کہیں اس نے میری اور عروج کی تصویر تو نہیں کھینچی تھی؟ لیکن ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس نے عروج کی تصویر کھینچی بھی تھی تو میرے سینے سے لگی عروج کی تصویر کہاں سے آ گئی؟ جبکہ وہ کوئی کیمرہ ٹرک بھی نہیں تھا۔ میں عروج کو پسند ضرور کرنے لگا تھا مگر کبھی اس کا اظہار تک عروج سے نہیں کیا تھا۔ اسے گلے لگانا تو بہت دور کی بات تھی۔ تصویر میرے لئے معمہ بن گئی تھی۔ الیکشن میں مصروفیت کی وجہ سے میں اس طرف کوئی

توجہ نہیں دے سکا تھا مگر اب الجھ کر رہ گیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر کبھی جبار نے ایسی تصویر اتاری بھی تھی تو وہ تصویر اخبارات تک کیسے پہنچ گئی؟ پھر جیسے کچھ یاد آ گیا اور تمام باتیں خود بخود ترتیب پانے لگیں۔ مجھے یاد آیا کہ جس روز جبار کے ہاتھ میں کیمرہ تھا اس روز جبار کے آنے سے قبل عروج میرے کمرے میں آئی تھی۔ میں کہیں جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ وہ اس وقت مجھ سے چھٹی لینے آئی تھی اور اپنے باپ کی بیماری کا ذکر کر کے رو پڑی تھی۔ وہ میرے بالکل قریب کھڑی تھی۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کمر پر ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے ہمدرد پا کر روتے ہوئے میرے سینے سے لگ گئی۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب جبار نے کسی طرح تصویر بنا لی جس کا مجھے علم نہ ہوا۔ تمام بات کھل کر میرے سامنے تھی مگر میرا دل اور دماغ پھر بھی کسی طرح ماننے کو تیار نہیں ہو رہے تھے۔

تین چار روز بعد کرم شاہ واپس میرے پاس آ گیا۔ مجھے اس کے آنے کی بہت خوشی ہوئی۔ وہ ہر پل سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھ جیسا بے یار و مددگار شخص کبھی وزارت کا قلمدان سنبھال لے گا۔ میں نے جس پارٹی کی حمایت کی تھی، اس نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے وزیر بنا دیا۔ حلف برداری کی تقریب سے واپس لوٹا تو رات گئے تک مبارک باد دینے کے لئے آنے والوں نے گھیرے رکھا۔

لوگ مجھے مبارک باد دے رہے تھے مگر میں کسی اور ادھیڑ بن میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے غفور، تنویر، الیاس اور جبار کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے اور اس بات پر حیران تھے کہ میں نے اس وقت انہیں اپنے پاس کیوں بلایا ہے؟ ان کے آتے ہی میں نے بلاتمہید بات شروع کر دی۔

"کیا میں تم لوگوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم لوگ بیگم جان عرف عام میں یاسمین شیخ کے پاس کیا لینے جاتے رہے ہو......؟"

میری بات سن کر ان چاروں کی سوالیہ نظریں ایک دوسرے کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر الیاس نے ہمت کی اور بولا۔

"چوہدری! یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟ بھلا ہم یاسمین شیخ کے پاس کیوں جانے لگے؟"

"تم میں سے کوئی تو ہے جو محض چند روپوں کی خاطر بیگم جان کے پاس اپنا ایمان بیچتا رہا۔"

"چوہدری تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔ بھلا ہم تمہارے مزاج کے خلاف کوئی کام کر سکتے ہیں......؟" جبار نے صفائی پیش کی۔

جبار کی بات سن کر میرا خون کھول اٹھا اور میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ "بکتے ہو تم...... جبکہ میرے پاس گواہ موجود ہیں۔"

"نہیں نہیں چوہدری...... ایسا نہیں ہو سکتا......" الیاس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

میں نے الیاس کی بات سنی تو جبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔ "اس سے پوچھو تو سہی کہ عروج کے ساتھ میری تصویر بیگم جان تک کس نے پہنچائی تھی؟"

"کیوں جبار! چوہدری صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟" الیاس نے جبار سے سوال کیا۔

جبار جان چکا تھا کہ اس کا پول کھل چکا ہے۔ اس لئے مزید صفائی پیش کرنا فضول تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قدموں میں آ بیٹھا۔ "مجھے معاف کر دو چوہدری...... میں لالچ میں آ گیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں تم لوگوں کے روپ میں آستین کے سانپ پال رہا ہوں جو کسی بھی وقت مجھے کاٹ سکتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم جعلی سندیں بیچتے بیچتے اپنا ایمان بھی فروخت کرنے لگو گے۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے شاید تم میرے احسانات بھول گئے تھے...... میں وہی ہوں ناں جس نے آج تک خود کھانے سے پہلے تمہیں کھلایا۔ میں وہی ہوں جو تمہارے چھوٹے سے چھوٹے دُکھ پر بھی تڑپ اٹھا......" میں نے بات کرتے کرتے اپنا رخ غفور کی طرف موڑ لیا۔ "اور تم...... تمہیں کیا میرا کوئی احسان یاد نہیں رہا؟...... لیکن خیر...... اس وقت میں نے تم لوگوں کو اپنے احسانات گنوانے کے لئے نہیں بلوایا تھا بلکہ میں تمہیں تمہارے اصل چہرے دکھانا چاہتا تھا۔"

"چلو چوہدری! جانے دو...... یہ تو نادانی میں سب کچھ کر بیٹھے...... تم تو سمجھدار ہو۔ انہیں معاف کر دو......" الیاس نے جبار اور غفور کی وکالت کی۔

"اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاؤں، تم سب کے لئے بہتر یہی ہے کہ صبح

ہوتے ہی یہاں سے چلے جاؤ۔"

"لیکن چوہدری! ان کے کئے کی سزا ہمیں تو نہ دو......" تنویر بول پڑا۔

"میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا...... اب میرا کسی پہ بھی اعتبار نہیں رہا......" میں ابھی تک غصے میں تھا۔

الیاس میرے پاس آ کھڑا ہوا اور بولا۔ "چوہدری! سوچو تو سہی، تمہیں چھوڑ کر بھلا ہم کہاں جائیں گے......؟"

"میری طرف سے چاہے جہنم میں جاؤ یا کسی فٹ پاتھ پر رہو۔ مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اب میں تم لوگوں کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا...... اب جاؤ! اور میں صبح اٹھوں تو مجھے تم میں سے کسی کی بھی صورت نظر نہ آئے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

میں نے غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ چاروں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے، پھر اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کرم شاہ سے کہا کہ وہ کمرے کی لائٹ بند کر دے اور اپنے کمرے میں جا کر سو جائے۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ آیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے لئے سب کچھ کرتے رہو اور وہی موقع ملتے ہی سینے میں خنجر گھونپ دیں؟ میں آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ ان چاروں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو لعنت ملامت کر رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ساتھ ساتھ اپنا سامان بھی سمیٹ رہے تھے۔ دیر تک ان کی باتیں سنائی دیتی رہیں، پھر میری آنکھ لگ گئی۔

جب صبح آنکھ کھلی تو الیاس، تنویر، غفور اور جبار میرے سامنے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میرا پارہ چڑھ گیا۔

"تم لوگ اب یہاں میرے پاس کیا کرنے آئے ہو...... ابھی تک گئے کیوں نہیں؟"

"کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے......؟" الیاس نے التجا کی۔

"دیکھو الیاس! میں نے جو فیصلہ سنانا تھا، وہ رات کو ہی سنا دیا تھا...... میں جانتا ہوں تم اور تنویر کسی معاملے میں ملوث نہیں۔ لیکن کیا کروں کہ میرا سب سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ اس لئے ان کے ساتھ ساتھ تم لوگ بھی جاؤ۔"

میرے فیصلے میں ذرا سی بھی لچک نہ تھی۔ اس لئے ان کا مزید وہاں کھڑے رہنا

فضول تھا۔ ان چاروں نے اپنا سامان تو رات کو ہی سمیٹ لیا تھا، اس لئے انہیں جانے میں کچھ دیر نہ لگی اور وہ گردن جھکائے کمرے سے نکل گئے۔

وزارت مل جانے سے شاید میری اہمیت میں اضافہ ہو گیا تھا اور میری حفاظت کی زیادہ ضرورت پڑ گئی تھی۔ میرے آفس اور گھر کے سامنے سیکیورٹی کے چند سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ وہ ہر آنے جانے والے پر کڑی نظر رکھتے اور جب تک کسی آنے والے کو میری طرف سے ملنے کی اجازت نہ مل جاتی، وہ کسی کو میرے پاس نہ آنے دیتے۔ میں جہاں کہیں سے گزرتا، میری گاڑی پر لہراتا ہوا جھنڈا دیکھ کر مختلف راستوں پر ڈیوٹی کے لئے کھڑے ہوئے پولیس کے اہلکار سیلوٹ کرتے۔

میں بھی اور ممبران کی طرح اپنے حلقے سے کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچا تھا اور وزیر بھی بنا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے ممبران جو نسل در نسل سیاست کرتے چلے آ رہے تھے اور بڑی بڑی جائیدادوں اور زمینوں کے وارث تھے، مجھ سے فاصلے پر رہتے۔ انہیں شاید یہ پسند نہیں تھا کہ مجھ جیسا کوئی شخص جو ان کی نظر میں مڈل کلاس بھی نہ تھا ان کے درمیان آ بیٹھے۔ وہ لوگ بظاہر مجھ سے مسکرا کر ملتے اور گلے بھی لگاتے لیکن دلی طور پر مجھے سخت ناپسند کرتے تھے۔

کرم شاہ نے میرے کہنے پر میرے متعلق گاؤں میں کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ مگر اب میں خود گاؤں جانا چاہتا تھا۔ ہر روز کرم شاہ سے گاؤں کی کوئی نہ کوئی بات سن کر میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں گاؤں ہو کر آؤں۔ میں کچھ دن کے لئے اس کھوکھلی اور بناوٹی دنیا سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میں وہاں جانا چاہتا تھا جہاں میرے اپنے تھے مگر میں نے جنہیں بھلا دیا تھا۔ کرم شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ لوگوں کو اخبارات کے ذریعے خبر مل چکی تھی مگر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کرم شاہ کو ہدایت کی کہ وہ گاؤں جائے اور میرے گھر والوں تک پیغام پہنچا دے کہ وہ یہاں میرے پاس آنے کی کوشش نہ کریں۔ میں فرصت ملتے ہی پروگرام بنا کر خود گاؤں آؤں گا۔

میں ایک فنکشن اٹینڈ کرنے کے بعد رات کو دیر سے گھر لوٹا تو چاچی نے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے بتایا کہ کرم شاہ گاؤں سے واپس آ گیا ہے اور اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ کرم شاہ کے واپس آنے کا سن کر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے چاچی سے کہا

کہ وہ کرم شاہ کو اٹھا کر فوراً میرے پاس بھیجے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کرم شاہ آنکھیں ملتا ہوا میرے پاس آ گیا اور بولا۔

"خیر تو ہے چوہدری صاحب...... آپ نے مجھے اس وقت بلایا ہے......؟"

کرم شاہ بھی اوروں کی دیکھا دیکھی مجھے چوہدری صاحب کہنے لگا تھا۔ وہ سوئے پڑے کو اٹھانے پر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی اور اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے سوال کیا۔

"کرم شاہ! تم گاؤں سے کب آئے......؟"

"میں تو شام کو ہی آ گیا تھا۔ آپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک آپ کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب آپ نہیں آئے تو میں سو گیا......"

"اچھا یہ بتاؤ، جب تم نے ابا اور بھائیوں کو میرے متعلق بتایا تو انہوں نے کیا کہا؟" میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"انہیں تو میری بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بہت مشکل سے انہیں یقین دلایا اور آپ کی تصاویر دکھائیں تب کہیں انہیں تسلی ہوئی۔ اور جانتے ہیں چوہدری صاحب! آپ کے ابا نے کیا کیا...... وہ آپ کی تصویروں کو دیکھ کر چومتے ہوئے رونے لگا۔ وہ تصویروں کو چومے جاتا تھا اور روئے جاتا تھا۔ ایسی ہی کیفیت آپ کے بھائیوں کی تھی۔" کرم شاہ نے اپنی بات ختم کر دی تھی جبکہ میں اس کے منہ سے ابھی اور بہت سی باتیں سننا چاہتا تھا اس لئے فوراً بولا۔

"اچھا پھر کیا ہوا کرم شاہ......؟"

"پھر کیا ہونا تھا...... تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر گاؤں سے نکل کر آس پاس کے دیہاتوں میں بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے علاقے کے بڑے بڑے لوگ آپ کے ابا کے پاس آ پہنچے۔ اور جانتے ہیں چوہدری صاحب! نہ جانے کیسے یہ خبر وہاں کے اخباری نمائندوں تک بھی جا پہنچی اور انہوں نے آپ کے ابا اور بھائیوں کا انٹرویو بھی لیا۔" پھر کرم شاہ نے اپنے کمرے سے کچھ مقامی اخبارات لا کر میرے سامنے رکھ دیئے اور بولا۔ "یہ دیکھیں، آپ کے ابا کی تصویر اور انٹرویو چھپا ہے۔"

ابا کس قدر بدل گیا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور بوڑھا لگنے لگا تھا۔ ساتھ ہی

ایک اور تصویر چھپی تھی جس میں میرے بھائی اور ابا ایک ساتھ کھڑے تھے۔ ابا نے اپنے انٹرویو میں میرے بچپن کے متعلق کئی باتوں کا ذکر کیا تھا اور میری بہت سی تعریفیں کی تھیں۔

کرم شاہ کی باتیں سن کر میرے لئے کچھ اور انتظار کرنا مشکل تھا اس لئے میں نے فوری طور پر تمام پروگرام طے کیا اور کرم شاہ سے کہا کہ میں اب سے ٹھیک ایک ہفتہ بعد دوپہر گیارہ بجے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

کرم شاہ گاؤں جانے لگا تو میں نے اس کے ساتھ اپنے دو آدمی بھی روانہ کر دیئے تا کہ ابا کو تسلی رہے کہ میں آ رہا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں تو میں بھی ان کے پاس آنے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ میں نے کرم شاہ کو موبائل لے دیا تا کہ اس سے رابطہ رہے۔

گو کہ دن رات اس قدر مصروف گزرتے کہ ذرا سی بھی فرصت نہ ملتی۔ لیکن پھر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ کرم شاہ دن میں ایک دو بار مجھ سے رابطہ ضرور کر لیتا۔ اگر کسی وجہ سے وہ رابطہ نہ کر پاتا تو میں اسے فون کر کے حالات معلوم کر لیتا۔

اخبارات والوں نے اس خبر کو نمایاں جگہ دی کہ میں کئی سال بعد اپنے گھر والوں سے ملنے گاؤں جا رہا ہوں۔ میرے جس ملنے والے کو میرے گاؤں جانے کی خبر ملی، اس نے میرے ساتھ چلنے کا پروگرام بنا لیا۔ میں وقت مقررہ پر گاؤں کے لئے روانہ ہوا تو گاڑیوں کا ایک بڑا قافلہ میرے ساتھ ساتھ تھا۔ جیسے ہی میں اپنے علاقے کی حدود میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پولیس کے بڑے بڑے عہدیدار وہاں موجود تھے۔ انہوں نے پولیس کی کچھ گاڑیاں میری گاڑی کے آگے اور کچھ میری گاڑی کے پیچھے لگا دیں۔ میرا گاؤں ابھی بہت دور تھا مگر وہاں بہت سے لوگ بسوں، ویگنوں، ٹرکوں اور ٹرالیوں پر پہنچے ہوئے تھے۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا، لوگ قافلے میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرح کی ٹریفک بند دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف مختلف دیہاتوں سے آئے ہوئے لوگ میری ایک جھلک دیکھنے کو کھڑے تھے۔

کرم شاہ نے مجھے اطلاع دی تھی کہ پچھلے کئی دن سے استقبال کے لئے بھرپور تیاریاں ہو رہی تھیں اور ہر طرح کی ٹریفک بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سب لوگ

گاؤں سے نکل کر استقبال کے لئے اڈے پر آ پہنچے ہیں۔ ابھی اڈہ کچھ دور تھا۔ میں کار سے نکل کر کھلی جیپ میں سوار ہو گیا تا کہ دور دراز سے جو لوگ مجھے دیکھنے آئے ہیں، وہ با آسانی مجھے دیکھ سکیں۔

میں سڑک کے کنارے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنا شاندار استقبال دیکھ کر میری گردن اکڑ گئی تھی۔ کرم شاہ نے میرے بندوں کے ساتھ مل کر میرے استقبال کی زبردست تیاریاں کی تھیں۔ اڈے پر پہنچا تو پولیس کی گاڑیاں ایک طرف ہو گئیں۔ اب میں سب سے آگے تھا اور میرے پیچھے بسوں، ویگنوں، گاڑیوں، ٹرکوں اور ٹرالیوں کی میلوں لمبی قطار تھی۔ تمام گاڑیوں پر بینر لہراتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جن پر کسی نہ کسی کا نام لکھا گیا تھا۔ استقبال کے لئے آئے ہوئے ہزاروں لوگ میرے سامنے کھڑے تھے۔ ابا اور بھائی ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے سب سے آگے کھڑے تھے۔ میں گاڑی میں ہی کھڑا ہو کر اپنے ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے لوگوں کے لہراتے ہوئے ہاتھوں کا جواب دینے لگا۔

اب میں ان کے اس قدر قریب تھا کہ مجھے ان کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ ابا ساتھ کھڑے ہوئے کسی شخص سے کہہ رہا تھا کہ دیکھو، اولاد ہو تو ایسی۔ آج اس نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔

مجھ پر پھولوں کی پتیاں پھینکی جا رہی تھیں۔ میری نظر ایک نوجوان پر پڑی جو سکول یونیفارم پہنے ہوئے تھا اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میری گردن یہ سوچ کر اور بھی تن گئی کہ میرے استقبال کے لئے سکولوں اور کالجوں کے طالب علم بھی آئے ہوئے تھے۔ میں اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھ میں کلپ بورڈ پکڑا ہوا تھا اور میری ہی طرف آ رہا تھا۔ اتنے میں نعروں کی آواز گونجنے لگی۔ میں نے نگاہ اس طرف اٹھائی تو کرم شاہ نعرے لگوانے والوں میں پیش پیش تھا۔

”چوہدری جمیل...... زندہ باد......“

”چوہدری جمیل...... زندہ باد......“

”ہماری آن ہماری شان...... چوہدری جمیل...... چوہدری جمیل......“

”ہم سب کی جان...... چوہدری جمیل...... چوہدری جمیل......“

پُرجوش نعروں نے میرا سینہ اور بھی چوڑا کر دیا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں بھی کوئی معمولی شخص نہیں۔ نعروں کی گونج میں نہ جانے کون سا نشہ تھا کہ میں مدہوش ہو رہا تھا۔

اچانک لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کو روندتے ہوئے وہاں سے دور بھاگنے لگے۔ میں ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک نعرے لگانے والوں نے ایسی کون سی چیز دیکھ لی تھی جو وہاں سے دوڑ پڑے تھے۔ میں نے جائزہ لینے کے لئے ذرا سی گردن گھمائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہی نوجوان جس کے ہاتھوں نے کچھ دیر پہلے کلپ بورڈ پکڑ رکھا تھا، اس کے ہاتھوں میں پستول تھی جو ابھی اس نے پولیس اہلکار سے چھینی تھی۔ پولیس اہلکار اس کے پیچھے پیچھے تھے اور وہ دوڑتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا اور آتے ہی مجھ پر فائر کر دیا...... اس نے یکے بعد دیگرے کئی فائر کئے...... گولیاں میرے کندھے اور بازو پر لگی تھیں۔ جس سے میرے خون کے فوارے چل پڑے...... سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا...... اور لڑکھڑاتا ہوا گاڑی سے نیچے آ گرا۔ لیکن میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ ہی حملہ آور کو پہچان چکا تھا۔ وہ مکھن تھا، چاچا خیرو کا بیٹا۔ اور میں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ وہ بھی میرے گارڈز کی فائرنگ سے خون میں نہا چکا تھا۔

مجھے فوری طور پر ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ میں مکھن کے بارے میں حیران تھا کہ وہ مجھے کیسے پہچان گیا۔

کچھ دن تک تو تھوڑی بہت خبریں اس حوالے سے چلیں۔ ویزوں کا سکینڈل بھی اٹھا۔ مگر اب میں اس مقام پر تھا جہاں قانون کے محافظ اور حکومت میرے گھر کی لونڈی تھی۔ چنانچہ میں نے ہر زبان خاموش کر دی۔ لوگ آج بھی چوہدری سلیم کو تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ چوہدری جمیل ہی چوہدری سلیم ہے جو آج پوری قوم سے اپنی محرومیوں کا انتقام لے رہا ہے۔

(ختم شد)